مضامین اور تبصرے

حیدر قریشی

MAZAMEEN AUR TABSRAY
By:Haider Qureshi

''مضامین اور تبصرے'' اردو تنقید کی نئی کتاب ہے۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے یہ میرے مضامین اور تبصروں کا مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے میری مابعد تحقیق وتنقید پر پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اور مابعد کی بحث سے ہٹ کر ادب کی عمومی صورتِ حال پر بھی پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ا۔ حاصلِ مطالعہ ۲۔ تاثرات ۳۔ وزیر آغا۔ عہد ساز شخصیت ۴۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور مابعد جدیدیت ۵۔ ستیہ پال آنند کی ''۔۔ بودنی نابودنی''۔ اب یہ کتاب ''مضامین اور تبصرے'' اشاعت کے لیے تیار ہے۔ پہلے اسے کتابی صورت میں شائع کرانا تھا لیکن اس دوران حالات اتنی تیزی کے ساتھ واضح اور روشن ہوتے گئے کہ میرے لیے اپنی تنقید کی ان چھ کتابوں کا مجموعہ ''ہمارا ادبی منظر نامہ'' شائع کرانا ضروری ہو گیا۔ تاہم ''ہمارا ادبی منظر نامہ'' کی اشاعت سے پہلے ''مضامین اور تبصرے'' کو ای بک کی صورت میں شائع کرنا طے کیا تھا۔ سو اب یہ کتاب اپنی الگ حیثیت میں ای بک کے طور پر پیش کر رہا ہوں۔

اسی برس اور جلد ہی قارئین میرے تنقیدی مضامین کے چھ مجموعے ''ہمارا ادبی منظر نامہ'' کے نام سے کتابی صورت میں دیکھ پائیں گے۔ سر دست ''مضامین اور تبصرے'' مطالعہ فرمایئے!

حیدر قریشی (جرمنی) یکم اگست ۲۰۱۴ء

مضامین اور تبصرے

حیدر قریشی

انٹرنیٹ ایڈیشن

عکاس پبلی کیشنز، اسلام آباد

جملہ حقوق بحق حیدر قریشی محفوظ

Mazameen Aur Tabsaray

(Critisism: Book Reviews & Articles)

By: Haider Qureshi

Year of 1st Edition: 2014

نام کتاب: مضامین اور تبصرے

مصنف: حیدر قریشی

مصنف کا پتہ: Rossertstr.6, Okriftel,
65795 Hattersheim,Germany
E-Mail: haider_qureshi2000@yahoo.com

سرورق: ارشد خالد

سنِ اشاعت اول: اگست 2014 ء

انٹرنیٹ ایڈیشن

انتساب

ڈاکٹر عبدالرب استاد (گلبرگہ یونیورسٹی)

اور

عامر سہیل (ایبٹ آباد) کے نام

لاکھ صحرا اور سمندر بچھ گئے تھے راہ میں
اِن فقیروں نے جہاں سے پار ہونا تھا، ہوئے

نفرت کے اندھیروں کو
توڑ مرے مالک
ظلمات کے گھیروں کو

ترتیب

نمبر شمار		صفحہ نمبر
-1	ادب، سائنس اور الٰہیات	8
-2	ادب، میڈیا اور انٹرنیٹ	17
-3	عالمی ادبی انعامات اور اردو دنیا	27
-4	ساحر لدھیانوی: کچھ ذاتی، کچھ ادبی تاثر	31
-5	رسول حمزہ کی نظموں کے تراجم۔اصل ترجمہ نگار فیض احمد فیض	43
-6	ترقی پسند تنقید: سجاد ظہیر اور آج کا عہد	48
-7	جدید ادب کا میرا جی نمبر (ظفر اقبال کے جواب میں)	59
-8	شاہد ماہلی: دھند میں لپٹی ہوئی روشنی	64
-9	دیویندر اسر کی آخری ہجرت	69
-10	اردو ماہیے کا سفر	75
-11	سید ظفر ہاشمی اور گلبن	80
-12	گلبن کی سلور جوبلی	84
-13	مشاعرہ میں ریما کی نظامت اور ندا فاضلی کا احتجاج	88
-14	بڑے اداروں میں چھوٹے ذہن کے لوگ	91
-15	نور ظہیر کے افسانے: ایک تعارف	94
-16	ڈاکٹر پنہاں کی غزلیں	103
-17	''ادب نامہ'' کے پچاس شمارے	107
-18	ارشد خالد کا عکاس انٹرنیشنل۔اسلام آباد	112

-19	افضل چوہان کی غزلیں	119
-20	طاہرہ شمیم کا ناول ''جہنم کے اس پار''	124
-21	جامعات کے کام پر ایک نظر	128

مختصر تبصرے اور تاثرات

-22	پسِ دیوارِ گریہ (شہناز نبی)	137
-23	دل چھونے والا منظر (وضاحت نسیم)	1348
-24	من کی آنکھیں کھول (امین خیال)	139
-25	کرچیاں (پروین شیر)	140
-26	لاشعور (غلام مرتضیٰ راہی)	141
-27	خیال موسم (جاوید ندیم)	142
-28	پچیس (جوگندر پال)	143
-29	اقبال اور ترک (ڈاکٹر خلیل طوق اَر)	144
-30	پہلا پتھر (کیپٹن نذیر الدین)	145
-31	اُس گلی میں (سید علی محسن)	145
-32	میرے ڈرامے لندن میں (شمس الدین آغا)	146
-33	داستاں در داستاں (حمیدہ معین رضوی)	147
-34	فرشتے کے آنسو (بلند اقبال)	148
-35	دل کا آئینہ جو ٹوٹا (سیدہ زیب النساء)	149
-36	شاہراہ ریشم کی جان (ڈاکٹر رؤف امیر)	150
-37	تیری خوشبو (سلیمان جاذب)	151
-38	کوہ قاف کے اس پار (شرافت عباس ناز)	152
-39	ابھی غزل ہے فروزاں (شرافت عباس ناز)	153

-40 نیند شرط نہیں (خواجہ جاوید اختر) 154
-41 آسماں پہچانتا ہے (مشتاق انجم) 155
-42 سرسری تم جہان سے گزرے (اکرام بریلوی) 156
-43 اردو افسانہ اور اساطیر (ڈاکٹر قاضی عابد) 157
-44 ساختیات ایک تعارف (ڈاکٹر ناصر عباس نیر) 158
-45 شہر خاموش ہے (شاہد ماہلی) 159
-46 نَرک (نسیم انجم) 160
-47 جب ایسا ہو (سید ظفر ہاشمی) 162
-48 سعادت (خواجہ محمد عارف) 162

مباحث

-49 ٹیگور کے حوالے سے ایک ادبی مکالمہ (انور خواجہ اور حیدر قریشی) 164
-50 پوپ کہانی کا قضیہ 172
-51 امریکہ میں پوپ کہانی کی حقیقت 193
-52 پوپ کہانی: کنگ وینکلس سے رضیہ اسماعیل تک 200

مزید مضامین

(جو کتاب کی ترتیب کے آخری مرحلہ میں شامل کیے جا رہے ہیں)

-53 انتظار حسین کے کالم کے حوالے سے دو وضاحتیں 204
-54 اردو افسانے کے سو سال 207
-55 ادبی محبت کا قرض 210
-56 انڈیا سے باہر کی اردو دنیا میں آج کی جدید اردو نظم 221
-57 فیمینزم۔تاریخ و تنقید 245
حیدر قریشی شخص و عکس (کوائف) مرتب: ارشد خالد 253

ادب، سائنس اور الٰہیات

ادب، سائنس اور الٰہیات تین الگ الگ جہان ہیں۔ادب اور الٰہیات کے موضوعات میں ہم آہنگی ڈھونڈنے کا شوق مجھے شروع سے رہا ہے لیکن سائنس کے وسیع تر مفہوم میں میری دلچسپی ڈاکٹر وزیر آغا کے مطالعہ اور ان سے میل ملاقاتوں کے بعد شروع ہوئی۔ یوں ایک عرصہ سے جہاں مجھے ادب کے تخلیقی دیار سے گزرنے کا تجربہ ہوا ہے وہیں مجھے جدید تر سائنسی انکشافات، اور حیرت انگیز ایجادات کا بھی سامنا ہے۔بچپن سے والدین نے مذہب کی حقیقتِ عظمیٰ کی سچائی کا جو بیج میرے اندر بویا تھا، وہ اسی کے وسیع تر مفہوم میں الٰہیات سے میری وابستگی کا موجب بن گیا ہے۔سو یوں مجھے ادب، سائنس اور الٰہیات کو اپنی بساط اور اپنی سوچ کے دائرہ کار کے اندر رہتے ہوئے، سمجھنے کا موقعہ ملتا رہتا ہے اور اس پر غور و فکر کی جتنی بھی توفیق مل جائے اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں۔ میری مختلف تحریروں میں بالعموم اور میری یادوں کے دو ابواب ''رہے نام اللہ کا'' اور ''روح اور جسم'' (۱) میں بالخصوص کسی حد تک تفصیل کے ساتھ اظہارِ خیال موجود ہے۔ان کا حوالہ اس لیے دے رہا ہوں کہ کسی دوست کو زیادہ دلچسپی محسوس ہو تو وہ اس مضمون کے پس منظر کے طور پر ان ابواب کو پڑھ سکے۔

یہاں اختصار کے ساتھ تمہید کے طور پر ادب، سائنس اور مذہب کے دائرۂ کار کی بابت عرض کر دوں کہ تینوں اپنے اپنے دائرۂ کار میں آزاد و خود مختار ہیں۔لیکن اپنے اپنے وسیع مفہوم میں تینوں کے سفر کا رُخ کائنات کی حقیقتِ عظمیٰ (خالقِ کائنات) کی جانب ہے۔**اللہ جمیل و یحب الجمال** کی حقیقت ذہن میں رکھی جائے تو ادب کا جمالیاتی سفر از خود واضح ہو جاتا ہے۔

صوفیا کی زبان میں اسے مجاز سے حقیقت کی طرف کا سفر قرار دیا جاتا ہے۔ سائنس کے جدید تر انکشافات کو دیکھا جائے تو کئی بار ایسے لگتا ہے جیسے مذہبی عقائد اور تصورات کی شکست وریخت ہو رہی ہے۔ لیکن بعض مذاہب اور مسالک کی مقامی نوعیت پر کہیں ضرب اور کہیں چپت لگانے کے باوجود سائنس کا سفر بھی کائنات کی اس حقیقتِ عظمیٰ کی جانب ہے، جو خالقِ کائنات ہے۔ گویا بظاہر سائنس خدا کی نفی کر رہی ہے، لیکن یہ نفی کرتے ہوئے، پیچھے ہٹتے ہوئے، دور ہونے کی بجائے حقیقتاً خدا کے زیادہ قریب ہوتی جا رہی ہے۔ مذہب ویسے ہی براہِ راست خدا تک پہنچنے کا، پہنچانے کا دعویٰ کرتا ہے۔ گویا ادب، سائنس اور مذہب تینوں کے سفر کا رُخ ایک ہی جانب ہے، بس تینوں کے اسفار کی نوعیت الگ الگ ہے۔ تینوں اسی کی طرف جا رہے ہیں لیکن الگ الگ اطراف سے جا رہے ہیں اور اُس کے لیے تو ساری طرفیں ہی بے معنی ہیں۔

ادب معلوم کی دنیا سے اپنا سفر شروع کرنے کے ساتھ ہی نامعلوم کی دریافت کا سفر شروع کر دیتا ہے۔ جو ادیب عصری ترجمانی پر مصر رہتے ہیں، وہ معلوم جہان کو ہی دریافت کرتے رہتے ہیں۔ اگر ہم گزشتہ زمانوں کی پرانی کہانیوں کی طرف جائیں تو پرانا داستان گو اپنے دیہاتوں اور چھوٹے چھوٹے شہروں میں کہیں اڑن طشتریوں، اڑن قالینوں، کا ذکر کر رہا تھا تو کہیں جنوں، دیووں، پریوں اور پریزادوں کو پرواز کرتے ہوئے دکھا رہا تھا۔ کہیں کوئی جادوگر اور کہیں کوئی نیک دل بزرگ کسی مسافر کو آنکھیں بند کرنے کا کہہ رہا ہے، اور جب مسافر کو آنکھیں کھولنے کی صدا آتی ہے تو جادوگر اور نیک دل بزرگ دونوں غائب ہوتے ہیں لیکن مسافر ہزاروں میل کی مسافت پلک جھپکنے میں طے کر چکا ہوتا ہے۔

اگر عصری ادب کی ترجمانی کو تھوڑی دیر کے لیے ایک طرف کر دیں تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہزاروں برسوں سے ہمارے داستان گو، ہمارے تخلیق کار ایک اجتماعی کشف دیکھتے آ رہے تھے۔ اس کے اظہار کے لیے ان کے پاس آج کی تیز رفتار ہوائی، بحری اور بری سواریوں کے لیے معین الفاظ نہیں تھے، لیکن وہ علامتی پیرائے میں ان سب کو بیان کرتے رہے۔ اگر وہ داستان گو اپنے تخلیقی کشف کا انداز بدل بدل کر اظہار کرنے کی بجائے صرف عصر کی ترجمانی کرتے رہتے تو

اپنے اپنے قصبوں اور شہروں کے قہوہ خانوں میں بیٹھے وہاں کی نقشہ کشی کرتے رہتے۔

اپنے بچپن میں نصابی مطالعہ کے دوران جامِ جمشید کا ذکر سنا تھا۔ ایران کا بادشاہ جس کے پاس ایسا جام تھا جس میں وہ دنیا جہان کے جس حصے کے بارے میں جاننا چاہتا، وہاں دیکھ لیا کرتا تھا۔ اسی جامِ جمشید کے حوالے سے ہمارے غالبؔ صاحب نے یہ کہہ کر اپنے دل کو بہلا لیا۔

اور بازار سے لے آئے، اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

لیکن آج ہم اپنی آنکھوں سے جامِ جمشید سے زیادہ اعلیٰ جام، موبائل فون کی صورت میں دیکھ رہے ہیں۔ موبائل فون جس کے اندر انٹرنیٹ سمیت ایک پوری دنیا سمائی ہوئی ہے۔ آج قدیم ایران کے شاہ جمشید کو یہ موبائل سروس دیکھنے کا موقعہ ملے تو نہ صرف اپنے داستانوی جام کو بھول جائے بلکہ اس نئے جام کو دیکھتا ہی رہ جائے۔ غالبؔ زندہ ہوتے تو میرے گھر میں آج کے زمانے کے کتنے ہی ساغرِ جم، اپنے جامِ سفال سے زیادہ بری حالت میں ٹوٹے ہوئے پڑے دیکھتے، بلکہ جدید جامِ جم کے معاملہ میں ''سامنے ڈھیر ہے ٹوٹے ہوئے پیمانوں کا''۔ جیسا منظر دیکھ لیتے۔ جدید جامِ جم جتنے مرضی ٹوٹ جائیں، خراب ہو جائیں، بازار سے جا کر اور لائے جا سکتے ہیں۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ایک تو عصری ادب ہی سب کچھ نہیں ہوتا، دوسرا یہ کہ نامعلوم کی دریافت ادب کے ذریعے ہو یا سائنس کے ذریعے، ایک انوکھی مسرت کا باعث بنتی ہے۔ جو مذہبی زبان میں اپنا اجر آپ ہوتی ہے، اجرِ عظیم ہوتی ہے۔

بچپن کی سنی ہوئی کہانیوں میں سے بعض میں ایسے کردار ملے تھے جو جب چاہتے دیکھنے والوں کی نظروں سے غائب ہو جاتے۔ یہ کردار سلیمانی ٹوپی والے کردار سے الگ اور مختلف تھے۔ بلکہ مجھے یاد ہے ایسی ہی ایک کہانی میں غائب فرد کبھی خود تو غائب ہوتا لیکن اس کا اوور کوٹ دکھائی دے رہا ہوتا۔ کبھی وہ پورا غائب ہوتا لیکن اس کے ہاتھ کی چائے دانی سب کو دکھائی دیتی، کہ وہ چائے دانی سے سب کے پیالوں میں چائے بھر رہا ہوتا تھا۔ بچپن کی ایسی کہانیوں کی ایک جھلک اپنے بچوں کے بچپن کی ایک فلم ''مسٹر انڈیا'' میں دیکھنے کو ملی۔ لیکن اب جیسے میرے

بچپن کے ساتھ میرے بچوں کا بچپن ہی نہیں میری اگلی نسل کا بچپن بھی شامل ہوگیا ہے۔ تین نسلوں کا بچپن حیرت سے جدید تر سائنسی انکشاف سے آگاہ ہو رہا ہے۔ اس نئے انکشاف کو پاکستان کے ایک اہم اور جینوئن سائنس دان ڈاکٹر عطاالرحمٰن کے الفاظ میں یہاں درج کر رہا ہوں۔

''ایک نہایت ہی مختلف قسم کا مادہ تیار کر لیا گیا ہے، جسے Metamaterials کا نام دیا گیا ہے۔ اس مادے کی خوبی یہ ہے کہ روشنی کی شعاعوں کو اپنے سے دور جھکا دیتا ہے، روشنی کو جذب کئے یا عکس بنائے بغیر۔ لہٰذا وہ تمام چیزیں جو اس مادے کی لپیٹ میں ہوتی ہیں نظروں سے اوجھل رہتی ہیں۔۔۔۔۔۔۔ یہ عجیب و حیرت انگیز مواد روشنی کی شعاعوں کو اپنے گرد اس طرح گھومنے دیتا ہے جیسے پانی چٹان کے گرد گھومتا ہے۔ اس طرح وہ چیزیں جو اس کے پیچھے ہیں، وہ تو نظر آتی ہیں لیکن جن چیزوں پر یہ لپٹا ہوا ہے وہ اوجھل رہتی ہیں۔'' **(۲)**

اس ایک تجربے کی کامیابی کو صرف ایک زاویے سے دیکھنا مناسب نہیں ہوگا۔ جس طرح موبائل فون میں کتنی ہی سائنسی برکات کے سلسلے سمٹ کر یک جا ہو گئے ہیں، مجھے اسی طرح اس جدید تر سائنسی پیش رفت میں کئی دوسری سائنسی ترقیات یک جا ہوتی دکھائی دے رہی ہیں۔ خصوصاً کلوننگ کا تجربہ جسے بظاہر نظر انداز کر دیا گیا ہے لیکن جو اس عہد کی سائنسی ترقی کا حیران کن اور اہم ترین تجربہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ بڑے سائنسی ممالک در پردہ اس سائنسی پیش رفت کے فوائد کے امکانات کا جائزہ لے رہے ہیں اور ان کی گنجائش نکالنے کے تجربے بھی کر رہے ہیں۔

مذہبی زبان میں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا معراج کا واقعہ بظاہر نا قابلِ یقین لگتا ہے، زیادہ تر لوگ اسے عقیدہ کا جزو سمجھ کر مان لیتے ہیں اور مزید بات نہیں کرتے۔ بعض مسالک نے اپنی توجیہات سے اسے نورانی اور روحانی سفر بنا لیا ہے۔ لیکن اس سفر کی جدید تر سائنسی توجیہہ بعد میں ۔۔ یہاں مجھے ایک دو کہانیوں کا ذکر کر لینے دیں۔

اصحابِ کہف کا واقعہ تو مذہبی کتب میں بھی مرقوم ہے لیکن اس سے ملتے جلتے قصے ہماری داستانوی ادبیات میں بھی شامل ہیں۔ بیوی کو کھانا تیار کرنے کا کہہ کر کوئی دریا کے کنارے تک کسی کام سے جاتا ہے، وہاں پھسلتا ہے اور ایک نئی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ وہاں شادی کرتا ہے، بچے پیدا

کرتا ہے، ایک عمر گزارتا ہے اور پھر ایک دم کسی جھٹکے سے گزرتا ہوا اپنی پہلی دنیا میں لوٹ آتا ہے۔ گھر پہنچتا ہے تو بیوی ابھی کھانا تیار کر رہی ہوتی ہے۔ وہ جو ئی زندگی کے کتنے ہی زمانے گزار کر گھر واپس آتا ہے، واپس آ کر دیکھتا ہے کہ یہاں تو زمانہ ابھی وہیں کا وہیں ہے۔ تو جناب وقت کی یہ چال۔۔ زمانے کا یہ رنگ، کیا بھید ہے؟ ''زمانے کو برا مت کہو، ہم خود زمانہ ہیں'' **(حدیث قدسی)**

حالیہ دنوں کی سائنسی کہانیوں میں روشنی کی رفتار سے سفر کرنے کی چند مغربی کہانیاں سامنے آئی تھیں۔ جن کے مطابق زمینی، بحری اور ہوائی سفر کے سارے ذرائع بے کار ہو جائیں گے اور انسان پلک جھپکتے میں دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے میں پہنچ جائے گا۔

ایسی ساری نئی پرانی کہانیوں اور مذہبی معتقدات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کوئی کہہ سکتا ہے کہ مذہب اور ادب ایک دوسرے سے استفادہ کر رہے ہیں لیکن میرے نزدیک مذہب اور ادب درحقیقت ایک دوسرے کی ایسی سچائی کی توثیق کر رہے ہیں، جو ہمارے لیے کچھ کچھ معلوم سی ہوتے ہوئے بھی نامعلوم کا دیار ہے۔

اب سائنس نے بھی اس دیار میں اپنا حصہ ڈالنا شروع کیا ہے۔ اس سلسلے میں جتنی پیش رفت ہو چکی ہے، وہ بھی حیران کر دینے کے لیے بہت زیادہ ہے، جبکہ اس کے امکانات اتنے زیادہ نا قابلِ یقین حد تک حیران کن ہیں کہ بندہ سوچتا جائے اور حیرت آمیز مسرت سے لبالب بھرتا چلا جائے۔

گزشتہ دس برسوں سے ایک سائنسی تحقیق ہو رہی تھی۔ اس سلسلہ میں ۲۰۰۳ء سے ایک سُرنگ کی تعمیر کا کام شروع کیا گیا۔ سوئٹزرلینڈ اور فرانس کی سرحد پر واقع CERN کے مقام پر ''یورپی لیبارٹری برائے ذراتی فزکس'' میں کائنات کی ابتدا کے بارے میں معروف سائنسی نظریہ ''بڑے دھماکے'' (Big Bang) کو دہرانے کا پروگرام بنایا گیا۔ اس تجربہ کو مختلف ممالک کے قابلِ ذکر سائنس دانوں کی ایک محدود تعداد نے ''یورپی لیبارٹری برائے ذراتی فزکس'' میں براہ راست دیکھا جبکہ کمپیوٹر کے ذریعے مجموعی طور دنیا بھر کے دس ہزار سائنس دانوں نے اس تجربہ کا مشاہدہ کیا۔ سوئٹزرلینڈ اور فرانس کی سرحد پر دائرے کی شکل میں بنائی گئی سترہ میل لمبی سُرنگ میں چند ذرات پر ''بڑے دھماکے'' کا تجربہ آزمایا گیا۔ اس سے نہ صرف اس سائنسی تصور کی توثیق ہوئی کہ

13.7 بلین سال پہلے کائنات ایک بڑے دھماکے کے نتیجہ میں معرضِ وجود میں آئی، بلکہ بعض نئے انکشاف بھی سامنے آئے۔۱۹۶۴ء میں ایک برطانوی سائنس دان پیٹر ہگز نے پہلی بار ایسے کسی ذرّے کا ذکر کیا تھا جو مادے اور توانائی کے بارے میں ایک عظیم تر نظریے کی گم شدہ کڑی ہے۔ اردو دنیا کے لیے اتنا لکھ رہا ہوں کہ ڈاکٹر عبدالسلام کا بھی پیٹر ہگز کے اس سائنسی نظریے کے ساتھ تعلق تھا۔

اب ہوا کیا کہ بڑے دھماکے کے تجربہ کے دوران ایک انوکھا ''پارٹیکل'' دیکھنے میں آیا۔ بڑے دھماکے کا عمل شروع ہونے سے پہلے وہ انوکھا سب پارٹیکل سامنے آیا اور اس نے جیسے اس سارے عمل کا فرمان جاری کیا اور پھر غائب ہوگیا۔اس کے ساتھ ہی بڑے دھماکے کا عمل شروع ہو گیا۔وہ انوکھا سب پارٹیکل جس نے بڑے دھماکے کے عمل میں کلیدی کردار ادا کیا، اسے مذکورہ سائنس دان کے نام کی نسبت سے ''ہگز بوسون'' کا نام دیا گیا ہے اور اس کی کارکردگی کی نوعیت کے باعث ''گاڈ پارٹیکل'' **(۳)** کا نام بھی دیا گیا ہے۔اب یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ کائنات کا وجود اسی لیے ممکن ہوسکا کہ مادے کو حجم اور توانائی ''گاڈ پارٹیکل'' کی بدولت ملے تھے۔

مذکورہ سب پارٹیکل کو ''گاڈ پارٹیکل'' نام دے کر سائنس دانوں نے مجھ جیسے ''نان سائنس'' بندے کے لیے سہولت فراہم کر دی۔ مجھے ایسے لگتا ہے کہ یہ سب پارٹیکل مذہبی زبان میں حکمِ خداوندی تھا، وہ آیا اور اس کا آنا ''کُن'' کا اعلان تھا۔ چنانچہ اس کے ساتھ ہی سترہ میل لمبی دائرے کی شکل میں بے حد محدود سطح کا سہی لیکن تخلیقِ کائنات کا منظر ایک بار پھر دہرا دیا گیا۔

کُن کا اک لفظ اسیروں پہ کہیں سے اترا
آسماں ہوگئے تخلیق قفس کے اندر **(۴)**

عجیب اتفاق ہے کہ ۲۰۰۳ء میں سوئٹزرلینڈ میں وہ سرنگ بننا شروع ہوئی، جس میں یہ تجربہ کیا گیا۔ تب میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ ایسا کوئی تجربہ ہونے جا رہا ہے، لیکن اُسی برس ایک غزل ہوئی جس میں میرا یہ شعر بھی شامل تھا۔ یہ حسنِ اتفاق میرے لیے ذاتی مسرت کا باعث ہے۔

ایک بھارتی خاتون سائنس دان نے جو اس سارے منظر کو دیکھنے والوں میں شامل تھیں،

بعد میں کہا کہ ''گاڈ پارٹیکل''، ہمیں دوبارہ دکھائی نہیں دیا لیکن ہم اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔اس کی مثال ایسے ہے جیسے ہم کسی کھیت میں کوئی سوئی تلاش کر رہے ہوں۔لیکن چونکہ اس کی ہستی ہے، اس لیے ہم اسے ڈھونڈ رہے ہیں، چاہے اس میں کتنا وقت ہی کیوں نہ لگ جائے۔

''گاڈ پارٹیکل'' کی صورت میں ایک ہلکی سی جھلک دکھائی دی ہے تو ہمارے عظیم سائنس دان بھی، اپنی اصطلاحات کے دائرے میں رہتے ہوئے سہی خدا کی تلاش میں نکل کھڑے ہیں۔ مجھے تو یہ سارے سائنس دان اس وقت کے صوفی لگنے لگے ہیں۔نام اور نوعیت کے فرق کے باوجود جستجوئے الٰہی کا یہ جذبہ اپنی جگہ دلچسپ بھی ہے اور حیران کن بھی۔سائنس دانوں کی پہلی کوشش یہ ہے کہ گاڈ پارٹیکل کے ذریعے یہ معلوم کیا جا سکے کہ مادے کو حجم کیسے ملا؟ پھر مادے کو توانائی اور توانائی کو مادے میں تبدیل کر لینے کا کوئی آسان رستہ تلاش کرنا مشکل نہ رہے گا۔

یہاں تک لکھتے ہوئے میں سچ مچ حیرت اور خوشی سے بھر گیا ہوں۔اگر مذکورہ کامیابیاں حاصل ہوگئیں تو سامنے کی بات یہ ہے کہ سچ مچ میں روشنی کی رفتار سے سفر کرنا ممکن ہو جائے گا۔یہ روشنی کی رفتار سے سفر کر سکنے کی بات مذہبی عقائد اور قصے کہانیوں سے ہوتی ہوئی عملی صورت اختیار کرنے کے قریب آ گئی ہے۔

لا تنفزون الا بسُلطٰن (۵)

تم ''سلطان'' کے بغیر زمین وآسمان کے کناروں سے نہیں نکل سکتے۔

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰؐ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

کل تک جن باتوں کو محض قصے کہانیاں اور خوش اعتقادی کہا جا رہا تھا، آج سائنس ان باتوں کی توثیق کرنے لگی ہے۔کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے ان گنت رموز، کلوننگ کا اسرار، اور اب گاڈ پارٹیکل تک رسائی کی کاوش، یہ سب کچھ یک جا ہوگیا تو بات صرف روشنی کی رفتار سے سفر کرنے تک نہیں رہے گی۔مزید پتہ نہیں کیا سے کیا ہو جائے گا۔

اللہ نور السموات والارض اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔اس نور کا منبع تو پتہ نہیں کہاں

ملے لیکن ایک سرا گاڈ پارٹیکل کی صورت میں ملنے والا ہے۔ یہ موضوع مجھے مزید غور وفکر کی طرف مائل کر رہا ہے، مجھے اندازہ ہے اس راہ میں دو چار نہیں بہت سارے سخت مقام آئیں گے، لیکن جستجو سچی ہو تو پھر سختیاں بھی آسان ہو جاتی ہیں۔ زمان کا خود خدا ہونا اور خلا کی چوتھی ڈائمنشن کے طور پر وقت کی دریافت، ادب، سائنس، اور الٰہیات کے وسیع تر موضوع کو مزید ہم آہنگ کر رہے ہیں۔

ادب، سائنس اور الٰہیات کے الگ الگ جہانوں میں سے گزرتے ہوئے اَن دیکھے جہانوں کی سیر کرنا اور پھر ان سب میں کسی نہ کسی نوعیت کی ہم آہنگی تلاش کرنا اور اس پر مزید غور وفکر کرنا میرے لیے ہمیشہ مسرت آمیز حیرت کا باعث رہا ہے۔ بچوں جیسی یہ مسرت آمیز معصوم حیرت میرے لیے عمر کے اس حصے میں بھی بہت بڑی نعمت ہے۔

میرے محدود سے پڑھنے، لکھنے کا بہت بڑا انعام ہے۔

حوالہ جات:

۱): **عمرِ لاحاصل کا حاصل** از حیدر قریشی

ناشر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ مطبوعہ ۲۰۰۹ء۔ص نمبر ۴۷۵ تا ۴۹۹

۲) **مضمون 'سائنس کی حیرت انگیز دنیا' از ڈاکٹر عطاء الرحمٰن، مطبوعہ روزنامہ جنگ۔ ۲۰ اکتوبر ۲۰۱۲ء**

۳) **www.dw.de//a-16076444**

۴): **ماہنامہ شاعر ممبئی۔ شمارہ نومبر ۲۰۰۴ء۔ص ۱۴** ۵/ **) سورہ الرحمٰن آیت ۳۳**

تدریس نامہ دہلی۔ اپریل تا جون ۲۰۱۳ء

ماہنامہ **سبق اردو** بھدوہی، انڈیا۔ شمارہ: ۳۴، مئی، جون ۲۰۱۳ء

سہ ماہی **شعرو سخن** مانسہرہ شمارہ: ۵۴۔ اپریل تا جون ۲۰۱۳ء

سہ ماہی **احساس** پشاور۔ شمارہ: ۳، ۲۰۱۳ء / **کولاژ** کراچی۔ شمارہ نمبر ۲۔ ۲۰۱۳ء

ایک اضافہ

روزنامہ جنگ ۲۸ فروری ۲۰۱۴ء کی اشاعت میں ڈاکٹر عطاء الرحمٰن کا ایک مضمون پڑھا۔

http://jang.com.pk/jang/feb2014-daily/28-02-2014/col5.htm

اس میں حیاتیاتی سائنس کی نئی اور حیران کن پیش رفت کا ذکر ہے۔ جس کے مطابق گزری ہوئی عمر کو پیچھے کرنے کا تجربہ ہوا ہے۔ اس آزمائشی تجربہ کے نتیجہ میں ۲ سال کے چوہے چھ مہینے کے ہو گئے۔ یہ تجربہ مزید کامیاب ہوا تو انسانی عمر کو پیچھے کرنے کی دوا ایجاد ہو جائے گی۔ اس پر پہلے تو ''عذرا کی واپسی'' یاد آئی۔ پھر ایک لطیفہ نما کہانی یاد آئی۔ پرانے زمانے میں ایک دیہاتی نوجوان کمائی کرنے گاؤں سے باہر جاتا ہے۔ چار پانچ سال کے بعد واپس آتا ہے۔ اپنے گھر کی کنڈی کھٹکھٹاتا ہے تو بوڑھی ماں کی بجائے ایک حسین وجمیل دوشیزہ دروازہ کھولتی ہے۔ جوان گھبرا جاتا ہے کہ شاید کسی اور کا در کھٹکھٹا دیا ہے لیکن وہ دوشیزہ ''بیٹا!'' کہتے ہوئے اس کے گلے لگ جاتی ہے۔ ماجرا یہ کھلا کہ کوئی حکیم صاحب گاؤں میں آئے تھے دونوں بوڑھے بوڑھی نے ان کی بہت خدمت کی تو جاتے ہوئے وہ انہیں جادو کی گولیاں تحفے میں دے گئے۔ حکیم صاحب نے بتایا کہ ایک گولی کھانے سے انسان دس سال کم عمر بن جائے گا۔ بوڑھی نے جوان ہونے کے شوق میں دو گولیاں کھالیں اور کچھ زیادہ جوان ہو گئی۔ بیٹا پوچھتا ہے ابا کہاں ہیں؟ تو ماں بتاتی ہے انہوں نے تو چار پانچ گولیاں ایک ساتھ کھا لی تھیں، وہ پنگھوڑے میں پڑے سو رہے ہیں۔ یہاں تک تو کہانی اور سائنس میں ایک ربط سامنے آ گیا۔ لیکن الٰہیاتی شعبہ میں بھی یہ کرشماتی بلکہ معجزاتی حوالہ موجود ہے۔

ایک بار ایک بزرگ صحابیہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر تھیں اور اپنے لیے جنت میں جانے کے حوالے سے کچھ عرض کر رہی تھیں۔ حضورِ اکرم ﷺ نے ازراہِ تفنن فرمایا کہ کوئی بوڑھی عورت جنت میں داخل نہ ہوگی۔ اس پر وہ صحابیہ رونے لگ گئیں تو حضور ﷺ نے مسکرا کر فرمایا کہ جنت میں جانے سے پہلے تمام بوڑھوں کو جوان کر دیا جائے گا۔ اب اسے حسنِ اتفاق کہہ لیں کہ مجھے جہاں نئی ایجادات وانکشافات سے حیرت ہوتی ہے وہیں ان کا ربط بیک وقت ادب کی کسی نہ کسی صورت سے اور مذہب کی وسیع تر صورت سے کسی نہ کسی طور مل جاتا ہے اور میری حیرت مسرت آمیز ہو جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ادب، سائنس اور الٰہیات میں ربطِ باہم کا یہ کسی داخلی نوعیت سفر سدا جاری وساری رہے گا۔

(ح۔ق)

ادب، میڈیا اور انٹرنیٹ

ادب کا میڈیا سے شروع ہی سے ایک تعلق قائم رہا ہے اور اس تعلق کے ساتھ میڈیا سے ایک فاصلہ بھی رہا ہے۔ پرنٹ میڈیا میں کتاب کی صورت میں ادب کی اشاعت سے لے کر اخبار اور رسالوں میں ادب کی اشاعت تک ایک تعلق چھاپہ خانوں کی ابتدا سے چلا آ رہا ہے۔ اور اخبار کی اہمیت و افادیت کے باوجود ادب نے صحافت سے اپنا الگ تشخص بھی شروع سے قائم رکھا ہے۔ اہلِ صحافت نے ادب کی جداگانہ شناخت کو کبھی اپنی عزت کا مسئلہ نہیں بنایا۔ یوں کئی شاعر اور ادیب کئی اخبارات و رسائل کے مدیران رہ چکے ہیں، اور کئی صرف مکمل صحافی حضرات بھی اخبارات و رسائل کے ایڈیٹرز رہ چکے ہیں۔ اس وقت بھی پرنٹ میڈیا میں یہ ملی جلی صورت دیکھی جا سکتی ہے۔ شاعر اور ادیب نہ ہوتے ہوئے بھی عام طور پر رسائل و جرائد کے مدیران میں زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ادب کی سوجھ بوجھ بھی معقول حد تک ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اخبارات اور غیر ادبی رسائل میں بھی ادب کو مناسب جگہ ملتی رہتی ہے۔ ہر چند ادب ان کی پہلی یا دوسری ترجیح نہیں ہوتی پھر بھی ادب سے یکسر صرفِ نظر نہیں کیا جاتا۔ ادب اور صحافت کی دنیا میں ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ اور کاری گری کی روایات بھی شروع سے ملتی ہیں۔ اس سلسلہ میں ادب میں شبلی نعمانی سے لے کر نیاز فتح پوری تک قمر زمانی بیگم اور ان سے ملتے جلتے فرضی قصوں کے اسکینڈلز بھی دیکھے جا سکتے ہیں اور اخبار ''فتنہ'' اور ''جواب فتنہ'' جیسے تماشے بھی ریکارڈ پر موجود ہیں۔ ایک منفی رویہ ہونے کے باوجود ان سب واقعات میں ادب، آداب کی ایک تہذیب بھی ساتھ ساتھ چلتی رہی ہے۔ پھر ادب اور صحافت میں ایسے واقعات آٹے میں نمک کی مقدار

سے بھی کم رہے ہیں۔ ان کے برعکس ہجو گوئی کی ایک روایت طویل عرصہ سے اردو ادب میں موجود ہے اور صحافت میں بھی شدید اختلاف رائے کی صورت میں اس کی کئی مثالیں مل جاتی ہیں۔ اس سب کچھ کے باوجود ادب اور پرنٹ میڈیا کے درمیان ایک فاصلہ اور ایک ہم آہنگی ہمیشہ سے موجود رہی ہے اور اس خاص نوعیت کے تعلق میں ایک باوقار طریقِ کار صاف دکھائی دیتا ہے۔

پرنٹ میڈیا کے بعد جب ریڈیو کے ذریعے ہوا کے دوش پر صحافت کے فروغ کی صورت نکلی تو اس میں ادب کا بھی تھوڑا بہت حصہ ہمیشہ شامل رہا ہے۔ ریڈیو سے سرکاری ٹی وی کے دور تک بھی اس روایت کو تھوڑی بہت ہیرا پھیری اور جانبداری کے ساتھ سہی لیکن پھر بھی قائم رکھا گیا۔ سرکاری ٹی وی نے اسٹیبلشمنٹ کے منظورِ نظر یا پھر متعلقہ ٹی وی حکام کے پسندیدہ ادیبوں کو نمایاں کیا۔ اس دور میں ''میڈیا کرز'' رائٹرز کی باقاعدہ کھیپ تیار کی گئی۔ معیاری تخلیقی ادب کو عام طور پر نظر انداز کیا گیا۔ میڈیا کر رائٹر بنے بغیر ادب کی خاموشی کے ساتھ خدمت کرنے والوں کو نظر انداز کیا گیا۔ تاہم یہاں ادب کے نام پر جو کچھ پیش کیا گیا اُس کی میڈیائی ضرورت کو اہمیت اور اولیت دینے کے باوجود اُس میں ادب کا ایک کم از کم معیار بہر حال ملحوظ رکھا گیا۔ اس دورانیہ میں بعض ادیبوں کے مختلف نوعیت کے منفی رُخ اور منفی کام بھی سامنے آئے لیکن ان کی مقدار آٹے میں نمک کے برابر رہی۔

یہاں تک پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر ادب کے حوالے سے جو کچھ پیش کیا جاتا رہا، اس کے دوش بدوش بلکہ اس سب سے ایک قدم بڑھ کر ادبی رسائل بھی اپنا کردار ادا کرتے رہے۔ بے شک اختلاف رائے رکھنے والے رسائل کے درمیان شدید اختلاف بھی نمایاں ہوا، ادبی مسابقت کی دوڑ میں، ان جرائد میں قارئین کی آراء کے ذریعے مدیر ہی کے موقف کو ابھارنے کی دیدہ دانستہ کاوشیں بھی ہوئیں۔ ادبی فیصلوں میں ڈنڈی مارنے کا رجحان بڑھا، اس کے باوجود ادبی رسائل کا ادب کے فروغ کا مجموعی کردار اتنا موثر تھا کہ ادبی دنیا کی چھوٹی موٹی کوتاہیاں قابلِ معافی بن جاتی تھیں۔

نئے ہزاریے کی پہلی صدی کے آغاز کے ساتھ سیٹلائٹ کے ذریعے ٹی وی چینلز کی بہار

اور یلغار آئی تو ساتھ ہی انٹرنیٹ کے ذریعے اشاعت کے وسیع تر مواقع میسر آ گئے۔ سیٹلائٹ نے پرائیویٹ چینلز کی بھرمار کر دی۔ چینل مالکان کے درمیان ریٹنگ کی دوڑ شروع ہو گئی۔ سب سے پہلے خبروں کو پیش کرنے کی ہوڑ میں مصدقہ اور غیر مصدقہ کا فرق ہی نہ رہنے دیا گیا۔ جو آگے نکل جاتا ہے خبر کو سب سے پہلے پیش کرنے پر بار بار فخر کا اظہار کرتا ہے اور جو پیچھے رہ جاتا ہے وہ اپنی ناکامی کو اپنی صحافیانہ اخلاقیات کا نمونہ بنا کر بیان کرنے لگتا ہے۔ جس قوم کو کسی اہلِ نظر کی رہنمائی کی ضرورت تھی اسے خبروں اور ان پر مختلف النوع تبصروں کے جال میں پھنسا دیا گیا ہے۔

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

زمانے کی رفتار میں تیزی آئی تو میڈیا نے اس رفتار کو تیز تر کر دیا۔ بے شک اتنی باخبری مہیا کر دی گئی ہے کہ انسان بے خبری کو ترس کر رہ گیا ہے۔ اس کے بہت سے سماجی فائدے بھی ہوئے ہیں لیکن اس کے فائدوں کے مقابلہ میں ہونے والے دور رس نقصانات کہیں زیادہ ہیں۔ اس سے صحافت میں بلیک میلنگ کا ریٹ بھی آسمان تک جا پہنچا ہے۔ میڈیا جس کرپشن اور معاشرتی لوٹ کھسوٹ کا سب سے زیادہ شور مچاتا ہے خود اس کے اپنے کئی مالکان اور کئی میڈیا اسٹارز نہ صرف ہر طرح کی اخلاقی و غیر اخلاقی کرپشن میں ملوث ہیں بلکہ ٹیکس چوری کلچر کو فروغ دے کر خود بھی اسی لوٹ کھسوٹ کا حصہ بنے ہوئے ہیں، جس کے خلاف بظاہر دن رات احتجاج کر رہے ہوتے ہیں۔ ایک طرف میڈیا کی آزادی کے علمبردار بننے کا دعویٰ کرتے ہیں دوسری طرف ''آزادی'' کی حد اتنی ہے کہ مذہبی دہشت گردوں کے سامنے سراپا احتیاط بنے ہوتے ہیں۔ سلمان تاثیر کو دن دیہاڑے شہید کر دیا گیا اور میڈیا کو جرأت نہ ہوئی کہ ان کے نام کے ساتھ شہید کا لفظ بول سکتا۔ دہشت گردوں کے بارے میں کھل کر بات کرتے ہوئے ہر کوئی احتیاط کرتا ہے لیکن ان کی وکالت کرنے والے کسی اگر مگر کے بغیر انہیں ''ہمارے'' قرار دے کر انہیں بے قصور ظاہر کرتے ہیں۔ یہ سماجی سطح پر میڈیائی رویے کی ہلکی سی جھلک ہے۔ ٹی وی کے تجزیاتی پروگرام تجزیہ کم اور ذاتی خواہشات کے آئینہ دار زیادہ ہوتے ہیں۔ نقالی کار رجحان میڈیا کے غیر تخلیقی ارکان

کی ذہنی صلاحیت کو تو بخوبی اجاگر کرتا ہے لیکن اس رجحان کے باعث بعض تخلیقی اذہان بھی نقلِ محض بن کر رہ گئے ہیں۔ کسی ایک چینل پر کوئی حالاتِ حاضرہ کا پروگرام اپنے کسی خاص انداز کی وجہ سے کامیاب لگنے لگتا ہے تو حقائق تک رسائی حاصل کیے بغیر دوسرے چینلز بھی ملتے جلتے انداز کے پروگرام کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ مارننگ شوز، کرائمز رپورٹس پر مبنی پروگرامز، معاشرتی مسائل، جادو ٹونے اور جنات کے موضوعات سے لے کر کامیڈی شوز تک مسلسل نقالی کا رجحان دیکھا جا سکتا ہے۔ کامیڈی شوز میں پنجابی اسٹیج شوز کا عامیانہ پن پوری طرح سرایت کر گیا ہے۔ پنجابی اسٹیج شو میں تھوڑی سی اصلاحِ احوال کی ضرورت تھی۔ مثلاً رشتوں کی تذلیل کرنے کی بجائے ان کے احترام کو ملحوظ رکھنا، ہر کسی کا تمسخر اڑانے کی بجائے، اور جسمانی عیوب کی تضحیک کرنے کی بجائے معاشرے کے حقیقی معائب پر طنز کرنا اور مزاح کی صورت میں بھی دوسروں کو نشانہ بنانے کی بجائے خود کو زد پر رکھنا جیسی تبدیلیاں کر لی جائیں تو پنجابی اسٹیج شو آج بھی عالمی معیار کا تھیٹر بن سکتا ہے۔ ٹی وی چینلز نے پنجابی تھیٹر کے فنکاروں کی پوری پوری فوج اپنے شوز میں بھرتی کر لی لیکن اصلاحِ احوال کی طرف کسی اینکر نے بھی توجہ نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج مختلف چینلز کے مزاحیہ شوز عمومی طور پر ویسا منظر پیش کر رہے ہیں جیسا ہندوستان کی بعض مسلمان ریاستوں کے زوال کے وقت ان معاشروں میں وہاں کی تہذیب کے نام پر انتہا درجہ کی پھکڑ بازی رائج ہو چکی تھی۔ خدانہ کرے کہ یہ سارے ٹی وی شوز پاکستان کے کسی تہذیبی یا جغرافیائی زوال کی علامت بن جائیں۔ اور بعد میں ان ٹی وی شوز کی تہذیب کی بنیاد پر اس قومی زوال کی کہانی کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ بہتر ہوگا کہ ایسے پروگراموں کے اینکر نقل در نقل کی لہر میں ہر کسی کی تذلیل کرنے کی بجائے شائستہ مزاح کے لیے محنت کر سکیں۔ کیا دوسروں کی تذلیل و تضحیک کیے بغیر شائستہ مزاح پیدا نہیں کیا جا سکتا؟۔ بہتر ہوگا کہ اپنے تمام تر علم و فضل کے باوجود کامیڈی شوز کے اینکر زحضرات پہلے طنز و مزاح سے متعلق بنیادی لٹریچر کا مطالعہ کر لیں۔ ہو سکتا ہے کہ انہیں اسی بہانے اپنی بعض شخصی کمزوریوں کا ادراک ہو جائے اور وہ ان پر قابو پا کر اپنے شوز کو بلیک میلنگ اسٹائل کی بجائے سچ مچ کے مزاحیہ پروگرام بنانے میں کامیاب ہو جائیں۔

سرکاری ٹی وی نے اسٹیبلشمنٹ کی پسند اور اپنے حکام کی پسند کو ملحوظ رکھتے ہوئے جن میڈیا کر دانشوروں، شاعروں اور ادیبوں کو قوم کا ترجمان بنایا تھا، اس بوئی ہوئی فصل کو کاٹنے کا وقت آیا تو آزاد میڈیا نے اس نوعیت کے میڈیا کر دانشوروں کے بھی نمبر دو قسم کے دانشوروں کی کھیپ تیار کر لی۔ اور اب ایسے دانشوروں کی اتنی کھیپ تیار ہو چکی ہیں کہ ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ پرائیویٹ چینلز پر تلفظ کی فاش نوعیت کی غلطیاں اپنی جگہ، اشعار کو انتہائی برے انداز سے، مسخ کر کے اور مکمل بے وزن کر کے پڑھتے ہوئے بھی یہ نئے میڈیا کر دانشور اتنے پُر اعتماد دکھائی دیتے ہیں کہ بندہ یہی سوچتا رہ جاتا ہے کہ اگر یہ ادب ہے تو پھر واقعی ادب کی موت ہو چکی۔ اتنے چینلز کی بھرمار کے باوجود ایک بھی چینل ایسا نہیں جہاں زیادہ معیاری نہ سہی کم از کم پی ٹی وی کے پرانے معیار کے ادبی پروگرام ہی پیش کیے جا سکیں۔

انٹرنیٹ کی دنیا اتنی وسیع تر اور گلوبل ولیج کی بھرپور ترجمان ہے کہ اس کے مثبت فوائد کو جتنا اپنایا جائے اس میں خیر ہی خیر ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ ہماری اردو دنیا نے اس کے بہت سارے مثبت فوائد سے اچھا استفادہ کیا ہے۔ اردو کی متعدد لائبریریوں کا قیام، ان لائبریریوں میں دینیات سے لے کر ادب اور سائنس تک مختلف موضوعات کی کتب کی آسان فراہمی ایک مثبت پیش رفت ہے۔ ہر چند اس میدان میں ابھی بہت کچھ کیا جانا باقی ہے لیکن جتنا کچھ دستیاب ہے وہ بھی اپنی جگہ نعمتِ خداوندی ہے۔ نعمتِ خداوندی کے الفاظ میں نے یونہی نہیں لکھ دیئے۔ والد صاحب بتایا کرتے تھے کہ ان کے بزرگوں کے زمانے میں بخاری شریف کی زیارت ہو جانا ہی بہت بڑی سعادت اور بہت بڑا کارِ ثواب سمجھا جاتا تھا۔ کہاں سو، سوا سو سال پہلے کا وہ زمانہ اور کہاں آج کی دنیا کہ بخاری شریف سمیت حدیث کی ساری کتب آن لائن دستیاب ہیں اور ان کے اردو ترجمے بھی موجود ہیں۔ قرآن شریف کے مختلف تراجم کی دستیابی کے ساتھ قرات سکھانے کا خودکار نظام تک مہیا کر دیا گیا ہے۔ یہی صورتِ حال دوسرے مذاہب کی کتبِ مقدسہ کے معاملہ میں ہے۔ دینیات سے ہٹ کر دوسرے موضوعات کے حوالے سے کسی نوعیت کی تعلیمی ضرورت یا تحقیقی کام کے لیے مطلوب ہر قسم کا مواد عموماً انٹرنیٹ پر مل جاتا ہے۔ صحت مند تفریح کا

سامان بھی موجود ہے۔ معلوم انسانی تاریخ میں معلومات کی اتنے وسیع پیمانے پر فراہمی اتنی آسان اور اتنی ارزاں کبھی نہیں تھی۔ انٹرنیٹ پر کوئی بھی سنجیدہ اور بامعنی کام کرنے والوں کے لیے اپنے بلاگس بنانے سے لے کر اپنی ویب سائٹس بنانے تک کی سہولیات موجود ہیں۔ اردو میں لکھنے کی سہولت بھی عام کر دی گئی ہے۔ مختلف ٹی وی چینلز جو ہر جگہ نہیں دیکھے جا سکتے انٹرنیٹ کے ذریعے ان کی دستیابی بھی آسان ہو چکی ہے۔ موبائل فون پر ساری انٹرنیٹ سروسز کا مہیا کر دیا جانا بجائے خود ایک حیران کن کام ہے جو اَب معمولاتِ زندگی میں شمار ہوتا ہے۔

اس قسم کی مزید ہزار ہا خوبیاں ہیں جو انٹرنیٹ کی برکت سے ہر خاص و عام کے لیے دستیاب ہیں۔ لیکن ان سب کے دوش بدوش ایک ایسی خرابی بھی انٹرنیٹ پر موجود ہے جو کم از کم ہمارے معاشرے اور ہمارے ماحول کے لیے انتہائی تباہ کن ہے۔ سوشل میڈیا کے نام پر فیس بک، ٹویٹر اور یوٹیوب سے لے کر مختلف ٹی وی شوز کو پیش کرنے والے انٹرنیٹ ٹی وی نیٹ سروسز تک میں آزادیٔ اظہار کے نام پر نجی تاثرات دینے کے جو تماشے لگے ہوئے ہیں، وہ گھٹیا پروپیگنڈہ کے باعث محض دل کی بھڑاس نکالنے کے ٹھکانے بن کر رہ گئے ہیں۔ ایسے ٹھکانے جہاں بعض اوقات بازاری زبان اور گالی گلوچ کی سطح سے بھی زیادہ گھٹیا زبان کو استعمال کیا جا رہا ہوتا ہے۔ مذہبی، فرقہ وارانہ، سیاسی، ادبی اور دیگر مختلف سماجی گروہوں کی اختلافی سرگرمیاں اظہارِ رائے کی تمیز اور تہذیب کے ساتھ چلتیں تو معاشرے کے لیے خیر کا موجب بن سکتی تھیں۔ لیکن جہاں مذہب اور فرقوں کے نام پر غلیظ ترین زبان استعمال کی جاتی ہو اور انتہائی ذلیل ترین حرکات کا مظاہرہ کیا جاتا ہو، وہاں زندگی کے باقی شعبوں میں کسی خیر کی صورت دیکھنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ اظہارِ رائے کی یہ مادر پدر آزادی سوشل میڈیا کے کسی بھی فورم پر دیکھی جا سکتی ہے۔ اس آزادی کا ایک سخت مگر ایک لحاظ سے دلچسپ اثر اخبار اور ٹی وی پر دیکھنے کو ملا۔ میں نے دیکھا کہ دوسروں پر بہت زیادہ بااصول بنتے ہوئے بے اصولی تنقید کرنے والے ٹی وی اینکرز سوشل میڈیا پر اپنے بارے میں دیئے جانے والے گالیوں والے ردِعمل پر مایوس تھے اور بعض ایسے ردِعمل سے اس حد تک دل برداشتہ تھے کہ یہ کام چھوڑ کر کسی دیہات میں بس جانے کا ذکر بھی کر رہے تھے۔ ادب میں پرانے

زمانے میں ایسے قبیلے موجود رہے ہیں جو قلمی غنڈہ گردی کرتے ہوئے خود سے اختلاف کرنے والوں کے خلاف گم نام مراسلہ بازی کیا کرتے تھے اور اس مراسلہ بازی میں انتہائی لچر اور فحش زبان استعمال کی جاتی تھی۔ اسی طرح کے ایک ادبی قبیلے کے ایک کالم نگار کو میں نے دیکھا کہ وہ اپنے کالم میں اخلاقیات کی دُہائی دے رہے تھے۔ مجھے اس قبیلے کی کئی پرانی سرگرمیاں یاد آئیں اور مجھے ایک پل کے لیے یہ سب اچھا لگا کہ مکافاتِ عمل کی ایک صورت دیکھنے کو ملی۔ لیکن یہ سب تو شاید میرے لیے کسی حد تک ذاتی نوعیت کی خوشی ہو سکتی تھی۔ جس سے کچھ دیر کے بعد میں خود بھی شرمندہ ہوا۔ اگر ادبی تہذیب کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ سب شرمناک تھا اور میں بہر حال سوشل میڈیا کی مادر پدر آزادی کے باعث گندی زبان کے استعمال کی مذمت کروں گا۔

سوشل میڈیا پر جو چیز بہت زیادہ مقبول ظاہر کی جاتی ہے، بعض استثنائی صورتوں کو چھوڑ کر عموماً یہ مقبولیت مصنوعی اور خود ساختہ ہوتی ہے۔ مختلف گروہوں نے اپنی انٹرنیٹ ٹیمیں تشکیل دے رکھی ہیں جو ایک سے زیادہ اکاؤنٹس بنا کر ''کمپنی کی مشہوری'' کرتے رہتے ہیں۔ اس مصنوعی گیم کی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیے صرف ٹاپ کی دو مثالیں پیش کروں گا۔ پاکستان کی دو شخصیات سوشل میڈیا کی سب سے مقبول شخصیات تھیں۔ پہلے نمبر پر سابق صدر جنرل پرویز مشرف اور دوسرے نمبر پر سابق کرکٹر اور آج کے ایک سیاسی لیڈر عمران خان۔ سوشل میڈیا پر اپنی سب سے زیادہ مقبولیت کے دھوکے میں جنرل پرویز مشرف بے تاب ہو کر لندن سے پاکستان پہنچ گئے۔ اور پھر جلد ہی قانونی موشگافیوں کی زد میں آ کر قیدِ تنہائی میں ڈال دیئے گئے۔ عمران خان اپنی انٹرنیٹ مقبولیت کے بل پر ایک بال سے دو مضبوط وکٹوں کو گرانے نکل کھڑے ہوئے اور بڑی مشکل سے اور دوسروں کی مدد لے کر صرف ایک صوبے میں حکومت بنا پائے۔ سوشل میڈیا میں سیاسی اور سماجی سطح پر مقبولیت کا بھرم کھولنے کے لیے اور اصل حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیے یہ دو مثالیں کافی ہیں۔

سوشل میڈیا کے ذریعے جرائم کی نت نئی ترکیبوں کے سلسلے بھی سامنے آنے لگ گئے ہیں۔ سماجی سطح پر کتنے ہی گھر ان روابط کے باعث نہ صرف ٹوٹے ہیں بلکہ تباہ ہو کر رہ گئے ہیں۔

جنسی بے راہروی اور بلیک میلنگ سے اغوا برائے تاوان تک کتنے ہی جرائم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ادبی لحاظ سے بھی سوشل میڈیا پر کوئی خوش کن صورتِ حال دکھائی نہیں دیتی۔ ایک طرف تو بے وزن شاعروں کی بھرمار ہے اور انہیں داد دینے کا وسیع سلسلہ بھی مربوط طور پر دکھائی دیتا ہے۔ دوسری طرف جینوئن ادیبوں کی اپنی اپنی ٹولیاں اور مدح سرائی کے بچکانہ سلسلے ہیں۔ ان فورمز کا ایک فائدہ ضرور ہوا ہے کہ کئی ایسے شاعروں اور ادیبوں کے بارے میں جو یہ تاثر موجود تھا کہ وہ شہرت سے بے نیاز ادبی کام کرنے کی لگن میں مگن رہتے ہیں۔ یہاں ان کی بے نیازیوں کے بھرم کھلے ہیں۔ اور شہرت کے حصول کے لیے ان کی جانب سے ایسی ایسی مضحکہ خیز حرکات دیکھنے میں آئی ہیں کہ اپنے ادیب کہلانے پر بھی شرمندگی سی ہونے لگتی ہے۔ یہاں ادب کے تعلق سے دو نسبتاً معقول واقعات کا ہلکا سا اشارا کرنا چاہوں گا۔

فیس بک پر بعض ادیبوں نے اپنے الگ الگ فورمز بھی بنا رکھے ہیں۔ ایک فورم پر اعلان کیا گیا کہ یہاں ایک شاعر کی نظم پیش کی جایا کرے گی اور اس پر سیر حاصل گفتگو ہوا کرے گی۔ پھر اُس ساری گفتگو کو فلاں ادبی رسالہ میں شائع کر دیا جایا کرے گا۔ پہلے ایک دو دوسرے شعراء کی نظمیں پیش ہوئیں، ان پر بات بھی چلی۔ اس کے بعد زیرِ گفتگو رسالہ کے مدیر نے اپنی نظم پیش کی۔ اس میں لوگوں نے زیادہ دلچسپی نہ لی۔ کوئی خاص گفتگو نہ ہو پائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو مکالمہ رسالہ میں شائع کیے جانے کا اعلان کیا گیا تھا، وہ شائع نہیں کیا جا سکا۔ ایک اور شاعر نے اپنے نام کے بغیر نظم پیش کی تو بعض قارئین نے اسے سنجیدگی سے نہیں لیا۔ بعض نے ہلکا سا مذاق اُڑایا۔ اس پر شاعر موصوف نے اپنے نام کے ساتھ قارئین کو بتایا کہ آپ جس شاعر کی نظم پر ایسی رائے دے رہے ہیں، اگر آپ کو اس کا نام معلوم ہو جائے تو آپ سب کے منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ جائیں گے۔ اس پر قارئین نے تقاضا کیا کہ شاعر کا نام بتائیں، انہوں نے اپنا اسمِ گرامی بتایا کہ یہ میری نظم ہے۔ اور پھر انہوں نے دیکھا کہ ان کے انکشاف کے بعد بھی قارئین کے رویے میں کوئی فرق نہ آیا اور پھر فیس بک کے قارئین کے رویے پر خود ان کا اپنا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ مذکورہ دونوں نظم نگار نظم کے اچھے شاعر ہیں۔ لیکن اپنی تمام تر بے نیازی کے باوجود

فیس بک پر مقبولیت کے شوق میں انہیں تیسرے درجہ کا ادبی شعور رکھنے والوں کے ہاتھوں تمسخر کا نشانہ بننا پڑا۔

میڈیا کرد انشوروں کی طرح سوشل میڈیا نے بھی اپنی قماش کے شاعروں کی ایک کھیپ پیدا کی ہے۔ان میں بعض اچھے شعر کہنے والے شاعر بھی موجود ہیں۔تاہم یہاں ان کی عوامی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ جب ان کی کوئی غزل فیس بک پر سجائی جاتی ہے تو سات شعر پڑھے جانے کے ٹائم سے بھی پہلے ہی اس غزل کی تعریف میں سات قارئین (عموماً خواتین) کی جانب سے اسے پسند کرنے کے ریمارکس آجاتے ہیں۔اور دمبدم ان کی مقبولیت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہاں مجھے ایک پرانے مزاحیہ پروگرام ''ففٹی ففٹی'' کا ایک لطیفہ یاد آگیا ہے۔پروگرام میں ایک میوزیم دکھایا جاتا ہے۔اس میوزیم میں موجود ایک قلم پر بات ہوتی ہے۔گائیڈ بتا رہا ہوتا ہے کہ اس تاریخی قلم سے پروگرام ''ففٹی ففٹی'' کی تعریف میں دس ہزار خطوط لکھے گئے ہیں۔اور پھر مزید وضاحت کرتا ہے کہ یہ قلم ''ففٹی ففٹی'' کے پروڈیوسر کا ہے۔''ففٹی ففٹی'' والوں کا لطیفہ سو فی صد حقیقت کی صورت میں فیس بک کے ''مقبول ترین شاعروں'' میں دیکھا جاسکتا ہے۔

ادب اور صحافت کے حوالے سے میں شروع میں ہی قمر زمانی بیگم اور اخبار ''فتنہ'' اور ''جواب فتنہ'' کا ذکر کر چکا ہوں۔سوشل میڈیا کے جن معائب کا میں نے ذکر کیا ہے، وہ سب ادب سمیت ہمارے پورے معاشرہ میں کسی نہ کسی رنگ میں موجود رہے ہیں۔تاہم ان سب کی مقدار آٹے میں نمک کی طرح رہی ہے۔سوشل میڈیا پر خرابی یہ ہوئی ہے کہ یہ سارے معائب اور ساری خرابیاں اس حد تک بڑھ گئی ہیں کہ نمک میں آٹے والی صورت بن گئی ہے۔ پرانی برائیوں کو بڑے پیمانے پر دہرانے کے ساتھ ہم نے کئی نئی برائیاں بھی ایجاد کر ڈالی ہیں۔وہ ساری ایجادیں سوشل میڈیا سے ہوتی ہوئی ہمارے پورے معاشرے میں سرایت کرنے لگی ہیں۔

ان ساری برائیوں کا عام طور پر اور ادبی خرابیوں کا خاص طور پر تدارک کرنے کے لیے ایک تجویز میرے ذہن میں آتی ہے۔سوشل میڈیا پر کسی بھی فورم کی رکنیت کے لیے اس ملک کے شناختی کارڈ کے مطابق اس کے نمبر کا اندراج لازم کیا جانا چاہیے۔اور ہر فورم پر ایک شناختی کارڈ پر ایک

اکاؤنٹ کھولنے کی پابندی لگ جائے۔ اگر شناختی کارڈ کے نمبر کے بغیر کسی کو بھی اکاؤنٹ کھولنے کا موقعہ نہ ملے، اور پہلے سے موجود اکاؤنٹس کو بھی شناختی کارڈ نمبر کے ساتھ مشروط کر کے ری فریش کیا جائے تو پہلے مرحلہ میں پچاس فی صد سے زائد اکاؤنٹ غائب ہو جائیں گے۔غائب ہونے والے اکاؤنٹس کی شرح پچاس فی صد سے زائد ہو سکتی ہے، کم ہرگز نہیں ہوگی۔اس تجویز کو میں نے سادہ انداز میں بیان کیا ہے۔حکومتی سطح پر تیکنیکی ماہرین اسے مزید غور کر کے زیادہ موثر بنا سکتے ہیں۔

ادب ہو یا زندگی کا کوئی اور شعبہ ہو، اختلاف رائے کے اظہار کا حق ہر کسی کو ملنا چاہیے۔اس پر کوئی ناروا پابندی لگے تو اس کی مزاحمت کی جانی چاہیے۔لیکن چوروں کی طرح چھپ کر وار کرنے والوں اور اختلاف رائے کے نام پر انتہائی شرم ناک قسم کی گالیاں بکنے والوں کو اس سے باز رکھنے کے لیے، ان کی شناخت واضح ہونی چاہیے۔اگر پاکستان آغاز کرے اور جنوبی ایشیا کے ملکوں کو ساتھ لے کر عالمی سطح پر حکومتوں کو تحریک کی جائے تو شناختی کارڈ نمبر کی بنیاد پر سوشل میڈیا کے فورمز کی رکنیت کو مشروط کر کے سائبر ورلڈ کے ان سارے فورمز کو زیادہ مہذب، بہتر اور موثر بنایا جاسکتا ہے۔خرابیاں یکسر ختم نہیں ہوں گی لیکن ان میں خاطر خواہ کمی ہوگی اور انٹرنیٹ کی اس جدید تر دنیا میں ہم سب کو اپنی خامیوں پر قابو پا کر بہتر اور صحت مند کردار ادا کرنے کا موقعہ ملے گا۔تب ہم سب اس گلوبل ولیج کے اچھے شہری بن سکیں گے۔

انٹرنیٹ میگزین **ادبی منظر** اسلام آباد۔شمارہ مارچ ۲۰۱۴ء

http://issuu.com/adabi-manzar/docs/adabi_manzar_shumara_1

عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد۔شمارہ نمبر ۱۹۔مئی ۲۰۱۴ء

سہ ماہی **کولاژ** کراچی۔شمارہ نمبر ۳۔سال ۲۰۱۴ء

عالمی ادبی انعامات اور اردو دنیا

ادبی انعامات ہماری اردو دنیا کے ہوں یا عالمی نوعیت کے ہوں، یہ کبھی بھی میرا مسئلہ یا موضوع نہیں رہے۔ مقامی، قومی اور بین الاقوامی، ہر سطح پر یہ پبلک ریلشننگ اور مضبوط لابنگ کا کھیل ہیں۔ جو تعلقاتِ عامہ اور طاقت ور لابی کا بندہ ہوتا ہے وہ انعام جیت جاتا ہے۔ یہ کوئی چوہا دوڑ نہیں بلکہ ہاتھی دوڑ ہوتی ہے۔ قومی سطح پر نذیر ناجی، منشا یاد اور ڈاکٹر ظہور اعوان کے تحریر کردہ ذاتی تجربات پڑھنے کے بعد اس کھیل کی ساری حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ عالمی سطح کے انعامات میں بھی یہی منظر بڑی سطح پر ہوتا ہے۔ میں مقامی نوعیت سے لے کر بین الاقوامی سطح تک کی اس انعامی گیم سے تھوڑا بہت باخبر تو رہتا ہوں لیکن اسے میں نے کبھی موضوع نہیں بنایا۔

اس برس ''دی مین بکر پرائز ۲۰۱۳ء'' کا اعلان ہوا اور اردو کے بعض لکھنے والوں کا اس پر ردِ عمل سامنے آیا تو اس بکر پرائز کا سارا منظر نامہ میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ لگ بھگ پانچ ماہ پہلے مسعود اشعر کے کالم میں یہ نوید دی گئی کہ اس بار اس انعام کے ٹاپ ٹین میں اردو کے انتظار حسین بھی شامل ہیں۔ کچھ اور کالم نگار ادیبوں نے بھی اس کا چرچا کیا اور بی بی سی کی اردو ویب سائٹ تک سے کام لے کر لابنگ کا عمل جاری رکھا گیا۔ ٹھیک ہے یہ سب اپنی لابی کو مستحکم کرنے کا طریق تھا، اچھا کیا گیا۔ لیکن اب مئی ۲۰۱۳ء میں جب بکر پرائز کا نتیجہ سامنے آیا تو امریکی افسانچہ نگار Lydia Davis کے افسانچوں نے بڑے بڑے ناولوں کو ڈھیر کر دیا۔ Lydia Davis اس سال کا انعام جیت گئیں۔ اندازہ ہوا کہ ان کی لابی زیادہ مضبوط اور موثر تھی۔ اگر انتظار حسین کی لابنگ

زیادہ مضبوط ہوتی تو یقینی طور پر وہ یہ انعام جیت جاتے، ایسا نہیں ہوا تو اس میں کوئی حرج نہیں، یہی بہت ہے کہ وہ اس انعام کے ٹاپ ٹین میں شامل رہے۔ اس نتیجہ کے اعلان کے بعد مسعود اشعر نے پھر جو کالم لکھا اس میں انعام جیتنے والی خاتون کی نگارشات کو بہت کمتر جتاتے ہوئے دکھ کا اظہار کیا گیا۔ ان کی بات درست ہو سکتی ہے لیکن کیا پاکستان میں بلکہ پوری اردو دنیا میں ایک طویل عرصہ سے بے شمار کم تر اور بعض اوقات نا اہل قسم کے لکھنے والوں کو بڑے بڑے انعامات سے نوازتے ہوئے کئی اہم اور زیادہ اچھا لکھنے والے شاعروں اور ادیبوں کو نظر انداز نہیں کیا گیا؟ جن لوگوں کو ادیب کہلانے پر جرمانہ یا کوئی اور بڑی سزا ہونا چاہیے تھی انہیں بڑے ایوارڈز سے نوازا گیا ہے۔ جب آپ خود اپنے گھر میں بد دیانت ہیں تو دوسروں کو کس دیانت داری کا درس دینا چاہتے ہیں۔ اور اپنے لیے کون سا حق یا انصاف مانگتے ہیں۔

بکر پرائز سے مجھے اردو ادب اور نوبل پرائز کا قصہ یاد آ گیا ہے۔ ادب کا نوبل پرائز اپنی اہمیت کے لحاظ سے بکر پرائز سے بڑا انعام ہے۔ اس انعام کے لیے اردو دنیا سے تعلق رکھنے والے صرف دو ادیبوں کو نامزد کیا گیا جو ٹاپ تھری تک پہنچے۔ انڈیا سے قرۃ العین حیدر اور پاکستان سے ڈاکٹر وزیر آغا۔ انڈیا سے قرۃ العین حیدر ایک بار ٹاپ تھری میں شامل رہیں، لیکن انہیں یہ انعام نہ مل سکا۔ پاکستان سے ڈاکٹر وزیر آغا کا نام تین سال تک ہر بار ٹاپ تھری میں شامل رہا لیکن انہیں بھی انعام نہیں دیا گیا۔ البتہ سویڈش رائٹرز یونین کی جانب سے ڈاکٹر وزیر آغا کو باقاعدہ طور پر سویڈن میں مدعو کیا گیا اور اس تنظیم کی جانب سے وزیر آغا کا شاندار استقبال کیا گیا، تقریبات میں ان کی ادبی خدمات پر انہیں خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ ''سویڈش اکیڈمی'' کی جانب سے بھی ان کے اعزاز میں شایانِ شان تقریب برپا کی گئی۔ ساری تقریبات کا سویڈن کے اخبارات میں بڑے پیمانے پر تذکرہ کیا گیا۔ یہ بھی بڑا اعزاز تھا۔ اس پرانی تقریب کی تفصیل کے سلسلہ میں جب میں نے ڈنمارک میں اردو کے معروف شاعر اور ادیب نصر ملک سے استفسار کیا تو انہوں نے اپنی یکم جون ۲۰۱۳ء کی ای میل میں جو تفصیل فراہم کی وہ انہیں کے الفاظ میں یہاں درج کیے دیتا ہوں۔

''آغا جی (اللہ اُن کے درجات بلند کرے) پانچ نومبر سنہ انیس سو چورانوے میں سویڈن

آئے تھے۔انہیں سویڈش رائٹرز یونین اوراسی یونین کی انٹرنیشنل شاخ نے مشترکہ طور پر مدعو کیا تھا اوراپنے قیام کے دوران انہوں نے مختلف ادبی اجتماعات میں پاکستان، ہندوستان اور بحیثیت مجموعی پورے جنوب ایشیا میں ادیبوں کے مسائل ان کے طرزِ عمل اور لکھاریوں کے لیے اظہار خیال کی آزادی کی اہمیت اوراسی طرح کے دیگر موضوعات پر لیکچر دیئے تھے۔ان کا سب سے بڑا اوراہم لیکچر''سویڈن کی قدیم ترین یونیورسٹی''اُپسالا'' کے بڑے ہال میں ہوا تھا۔یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ آغا جی سویڈش رائٹرز یونین کی جانب سے''بطور''پاکستانی مندوب''مدعو کیے گئے تھےاوراس حیثیت میں انہوں نے کئی تقریبات میں خطاب کیا۔اوراس کے ساتھ ہی اسی یونین کی انٹرنیشنل شاخ (سویڈش اکیڈمی۔ناقل) نے آغا جی کو''پورے جنوب ایشیا کے مندوب'' کے طور پر نمائندگی کرنے کو بلایا تھااور یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا جو برصغیر کے کسی ایک''فرد'' کو حاصل ہوا تھا اوروہ تھے،ہم سب کے آغا جی۔وزیر آغا جی''

(ای میل **نصر ملک بنام حیدر قریشی**۔01.06.2013)

اردو دنیا سےاور پاکستان سے پہلی بار کسی ادیب اور دانشور کو اتنی عزت اوراحترام دیا گیا تھا۔لیکن نوّے کی دَہائی میں جب ڈاکٹر وزیر آغا کا نام تین بار نوبل پرائز کے لیے آرہا تھا تو پاکستان کے اردو کے بعض حلقوں کو سانپ سونگھ گیا تھا۔یہ تین سال ان حلقوں نے کس عالمِ کرب میں گزارے وہی جانتے ہیں یا ان کا خدا۔اور جب تین سال بیت گئے تو سب نے سُکھ کا سانس لیا۔سب کی جان میں جان آئی۔جب انعام نہیں ملا تو بعض لوگوں نے طنزیہ جملوں سے کیسے جلے دل کے پھپھولے پھوڑے،وہ سب ریکارڈ پر موجود ہے۔اگر ہماری اردو دنیا بہ استثنائے چند کسی ادبی تہذیب سے آشنا ہوتی تو اُس وقت بھی یہ کہا جاتا کہ دنیا میں ادب کے سب سے بڑے ایوارڈ کے لیے تین سال تک بار بار ٹاپ تھری میں شامل ہونا وزیر آغا ہی کا نہیں،پاکستان کا بھی اعزاز ہےاوراردو دنیا کے لیے بھی باعثِ عزت ہے۔سویڈش رائٹرز یونین کی باضابطہ دعوت اور شاندار پذیرائی تو بذاتِ خود ایسا اعزاز ہے جو وزیر آغا کے بعد ابھی تک کسی اردو والے کو نصیب نہیں ہو سکا۔

بے شک انتظار حسین کا بکر پرائز برائے سال ۲۰۱۳ء کے ٹاپ ٹین میں شمار ہونا بھی اعزاز ہے،لیکن ڈاکٹر وزیر آغا کا ادب کے نوبل پرائز کے ٹاپ تھری میں شمار ہونااور پھر تین سال تک شمار ہوتے جانا اس سے کہیں بڑا اعزاز تھا۔میں پہلے اعزاز کے نتیجہ پر اردو دنیا کی منافقت اور حالیہ اعزاز کے نتیجہ پر رونا دھونا دیکھ کر شرمندہ ہوا ہوں۔یہ اقربا پروری،یہ پارٹی بازی،ادبی زندگی کے دہرے معیار والے ہمارے عمومی کردار کو اجاگر کرتے ہیں۔ایسے رویوں والی ادبی برادریوں کے ساتھ یہی کچھ ہوتا ہے جو ہوا ہے۔پھر گلہ کس بات کا!

''ادب نامہ''۔روزنامہ صبح ایبٹ آباد۔۶ جون ۲۰۱۳ء

''ادب نامہ'' روزنامہ دنیا لاہور۔۱۲ جون ۲۰۱۳ء

ساحرلدھیانوی: کچھ ادبی، کچھ ذاتی تاثر

ادبی دنیا میں داخل ہونے سے تھوڑا عرصہ قبل مجھے جن شاعروں نے غیر معمولی طور پر اپنی طرف متوجہ کیا، ان میں ترقی پسندوں میں فیض احمد فیض اور ساحرلدھیانوی جبکہ جدید نظم نگاروں میں میراجی اور ن م راشد سرِ فہرست تھے۔ مذہب کے روایتی شکنجہ کے خلاف شاعری پڑھ کر اُس عمر اور زمانہ میں اچھا لگتا تھا۔ اب بھی ایسا برا نہیں لگتا۔ اقبال کے ''شکوہ'' سے لے کر بعض ترقی پسندوں کے ہاں مذہب کی ظاہر پرستی کے ''مذہبی شکنجے'' کی مذمت تک ساری شاعری اچھی لگتی رہی ہے۔ لیکن ہستیٔ باری تعالیٰ کا اقرار اور اس کی جستجو کا سفر ہمیشہ سے میری سوچ کا محور رہا ہے۔ چنانچہ جب ن۔م راشد کے ہاں ''اسرافیل کی موت'' پڑھنے کا موقعہ ملا تو میں نے اس کی معنوی توجیہہ کر کے خود کو راشد کے قریب رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن جب راشد کے ہاں ''خدا کا جنازہ لیے جا رہے ہیں فرشتے'' (**پہلی کرن**) پڑھنے کا موقعہ ملا تو راشد کی نسبت طبیعت میں ایک تکدر پیدا ہو گیا۔ انہوں نے یہ کوئی نئی بات نہیں کہی تھی۔ نیطشے اپنی مشہور تمثیل میں ''خدا کی موت'' کا اعلان کر چکا تھا اور راشد نے اسی بات کو دہرایا تھا، سو راشد کے معاملہ میں ایک فاصلہ سا پیدا ہوا۔ اس فاصلے کے احساس کو میراجی کی قربت کے احساس نے کسی حد تک سنبھالا دیا۔ میراجی کے ہاں شروع سے ہی جو حیران کر دینے والی بات ملی تھی، وہ ان کی نظم ''سلسلۂ روز و شب'' کی ابتدا تھی۔

''خدا نے الاؤ جلایا ہوا ہے
اُسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے
ہر اک سمت اس کے خلا ہی خلا ہے''

دکھائی دینے اور دکھائی نہ دینے کا میراجی کا تصور ان کی نظم ''جُز و اور کُل'' سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ تاہم ''سلسلۂ روز و شب'' کی آخری لائن تک خلا کا جو ذکر ملتا ہے، وہ تدریجاً ہستیٔ باری تعالیٰ کی تفہیم میں میرے کام آتا رہا۔ خلا کے توسط سے خدا کو سمجھنے میں میری یادوں کے باب ''رہے نام اللہ کا'' میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہ سولہ سال کی عمر کی سوچ سے ساٹھ سال کی عمر تک کی سوچ کا سفر قرار دیا جا سکتا ہے۔ میں ایسا ہی سمجھتا ہوں۔

ساحرلدھیانوی کے حوالے سے بات ترقی پسند شاعروں کی ہونا چاہیے تھی، میں جدید نظم گو شعراء کا ذکر لے بیٹھا، لیکن ترقی پسند شعراء کی طرف آنے سے پہلے یہ تمہید ضروری تھی۔ اگرچہ یہ قدرے طویل ہو گئی ہے۔ جدید نظم کے میراجی اور راشد کی طرح ترقی پسند شاعروں میں سے مجھے فیض اور ساحرلدھیانوی زیادہ پسند رہے ہیں۔ فیض احمد فیض اور ساحرلدھیانوی کو پسند کرنے میں پلڑا اوپر نیچے ہوتا رہتا۔ فیض رسمِ دعا یا دنہ ہونے کے باوجود دعا کے قائل تھے۔ میں رسمِ دنیا کو ایک حد تک نبھانا ضروری (مجبوری) سمجھتا ہوں لیکن رسمی دعا کا نہیں بلکہ قلبی دعا کا قائل ہوں۔ سو خود کو کسی حد تک فیض کے قریب محسوس کیا۔ فیض کی بعض نظمیں ترقی پسندانہ مزاج کے مطابق ہیں تو بعض نظمیں ایسی بھی ہیں جو جدید نظم اور ترقی پسند نظم کے درمیان پُل کا کردار ادا کرتی دکھائی دیتی ہیں اور انہیں نظموں سے فیض کی نظم نگاری میں ادبی شان نمایاں ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ پھر رومانٹک مزاج کی ریشمی شاعری جو انقلابی شاعری کے دوش بدوش چلتی رہی۔

ساحرلدھیانوی کے ہاں اس نوعیت کے اشعار نے کچی عمر ہی میں چونکا دیا تھا۔

عقائد وہم ہیں، مذہب خیالِ خام ہے ساقی
ازل سے ذہنِ انساں بستۂ اوہام ہے ساقی
حقیقت آشنائی اصل میں گم کردہ راہی ہے
عروسِ آگہی پروردۂ ابہام ہے ساقی

بعد میں علم ہوا کہ ترقی پسند شعراء کو مذہب کے خلاف لکھنے کی خصوصی تلقین تھی، چنانچہ ہر ممتاز ترقی پسند شاعر نے اپنی اپنی ہمت اور بساط کے مطابق اس موضوع کو نبھایا۔ ساحرلدھیانوی

نے بھی اس موضوع کو احکامات کی تعمیل کے طور پر خوب خوب نبھایا، عمومی طور پر ان کے مذہب مخالف اشعار نظریاتی تعصب کو ظاہر کرتے ہیں لیکن جہاں کہیں وہ مذہب کی ظاہری صورت کے منفی رُخ کو ہدف بناتے ہوئے طنز سے زیادہ شوخی سے کام لیتے ہیں وہاں ان کی ایسی شاعری بھی دلچسپ ہو جاتی ہے۔لیکن جہاں شوخی کم ہوتی ہے وہاں مذہب پر حملہ آور ہونے کا تاثر نمایاں ہونے لگتا ہے۔''طرحِ نَو'' مذہب کی شدید مذمت سے بھری ہوئی نظم ہے۔ یہاں تک تو بات گوارا رہتی ہے کہ مذہب کے نام پر لوگوں کی جیبیں کاٹنے والوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔

بیزار ہے کنشت وکلیسا سے اک جہاں
سوداگرانِ دین کی سوداگری کی خیر

لیکن جب ساحر لدھیانوی یہاں تک پہنچتے ہیں۔

ابلیس خندہ زن ہے مذاہب کی لاش پر
پیغمبرانِ دہر کی پیغمبری کی خیر

تو ایسے لگتا ہے جیسے وہ بھی نیطشے کے ''اعلان'' کے زیرِ اثر آ رہے ہیں، لیکن براہِ راست خدا کو انہوں نے یہاں بھی زد پر رکھنے کی جسارت نہیں کی۔ایک احتیاط کر گئے یا ان سے از خود احتیاط ہو گئی۔
ساحر کے ہاں اس نوعیت کے مزید چند اشعار بھی دیکھتے چلیں۔ یہ کچھ محتاط اور کچھ بے باک قسم کے اشعار ہیں، ان اشعار کی تمام تر بے باکی بھی ساحر لدھیانوی کو ن م راشد کی ''خدا کا جنازہ'' جیسی پستی میں گرنے سے بچائے رکھتی ہے۔

مِرا الحاد تو خیر ایک لعنت تھا سو ہے اب تک
مگر اس عالمِ وحشت میں ایمانوں پہ کیا گزری
چلو وہ کفر کے گھر سے سلامت آ گئے لیکن
خدا کی مملکت میں سوختہ جانوں پہ کیا گزری

سرِ مقتل جنہیں جانا تھا وہ جا بھی پہنچے
سرِ منبر کوئی محتاط خطیب آج بھی ہے
کون جانے یہ ترا شاعرِ آشفتہ مزاج
کتنے مغرور خداؤں کا رقیب آج بھی ہے

لے دے کے اپنے پاس فقط اک نظر تو ہے
کیوں دیکھیں زندگی کو کسی کی نظر سے ہم

فیض اور میرا جی کے برعکس ساحر لدھیانوی کے افکار زیادہ واضح اور دوٹوک تھے لیکن ساحر لدھیانوی نے ن۔م۔راشد کی طرح ہستیِ باری تعالیٰ کو براہِ راست ہدف نہیں بنایا۔اس کے برعکس تمام تر دہریت کے باوجود ایک انجانی جستجو کا سفر بھی ان کے ہاں ملتا ہے اور اس جستجو کے ساتھ ''اپنے ذوقِ طلب'' کے خام ہونے کا احساس و اعتراف بھی اس رنگ میں ملتا ہے۔

ابھی تک راستے کے پیچ وخم سے دل دھڑکتا ہے
مرا ذوقِ طلب شاید ابھی تک خام ہے ساقی

فلم ''ہم دونوں'' کا بھجن ''اللہ تیرو نام، ایشور تیرو نام۔'' کو اگر حمد یہ بھجن یا دعائیہ بھجن کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ یہ صرف فلمی ضرورت نہیں بلکہ ایک ''مسلمان دہریے'' کے دل کی آواز بھی ہے۔
فیض صاحب کی ''مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ'' اور ساحر لدھیانوی کی ''تاج محل'' دونوں اتنی شاندار ترقی پسند نظمیں ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کسے دوسری نظم پر ترجیح دی جائے۔ذاتی طور پر میں دو وجوہات کی بنا پر ساحر لدھیانوی کی نظم کو ترجیح دیتا ہوں۔پہلی وجہ یہ کہ ''مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ'' کو ملکۂ ترنم نور جہاں نے ایسے خوبصورت انداز سے گایا ہے کہ گویا اس نظم کو امر کر دیا ہے۔نور جہاں کے گائے جانے کے بعد جب کبھی فیض سے یہ نظم سنانے کی فرمائش کی جاتی تو وہ خود کہتے بھئی یہ نظم تو اب نور جہاں کی ہو

چکی۔اس کے برعکس نظم ''تاج محل'' کو نہ تو ایسے انداز میں گایا گیا اور نہ ہی کسی گائیکی کی بنیاد پر اس کی کوئی شناخت قائم ہوئی،اس کی ساری اہمیت اور قدر و قیمت اس کی اپنی شعری لفظیات اور اپنی ادبی شان سے ہی ظاہر ہوئی۔ دوسری وجہ یہ کہ دونوں نظمیں اشتراکی نظریات کی حامل ہیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ اور خصوصاً سوویت یونین کے انہدام کے بعد فیض کی نظم بھی جیسے اپنی اہمیت کھو بیٹھی ہے۔صرف ایک مشہور گیت بن کر رہ گئی ہے۔جبکہ وقت بدلنے کے باوجود ساحر لدھیانوی کی نظم ''تاج محل'' نئے تناظر میں زیادہ اہم بن کر سامنے آرہی ہے۔یہ نظم اس احساس کو اجاگر کرتی ہے کہ جس وقت مغربی دنیا جدید علوم اور نئی ایجادات کے جدید سفر پر گامزن ہو رہی تھی، ہمارے ہند کے بادشاہ شاہی قلعے،شاہی مقبرے اور دوسری شاہی عمارات بنانے میں ہی مگن تھے۔نہ انہیں بدلتے ہوئے زمانے کی رفتار کا کوئی ادراک تھا، نہ اپنی مملکت کی ترقی اور عوام کی فلاح و بہبود کا کوئی تصور ان کے پیش نظر تھا۔

''تاج محل'' کے بعد ساحر لدھیانوی کی نظم ''مادام'' نے مجھے بے حد متاثر کیا۔پھر ''کبھی کبھی''،''فن کار''،''فرار''جیسی نظموں سے ساحر نے اپنے سحر میں گرفتار کیے رکھا۔''نذرِ کالج'' بنیادی طور پر لدھیانہ کالج سے خارج کیے جانے والے ساحر کی اپنی روداد ہے۔لیکن یہ کیسی نظم ہے کہ مجھے ابتدائی عمر میں بھی پسند تھی اور اب بھی جیسے مجھے یہ ساحر سے زیادہ اپنی کہانی لگنے لگتی ہے۔اس نظم کے چند اشعار یہاں پیش کرنا چاہوں گا۔

اے سرزمین پاک کے یارانِ نیک نام
باصد خلوص شاعرِ آوارہ کا سلام
تُو آج بھی ہے میرے لیے جنتِ خیال
ہیں تجھ میں دفن میری جوانی کے چار سال
ہم ایک خار تھے جو چمن سے نکل گئے
ننگِ وطن تھے، حدِ وطن سے نکل گئے
اس سرزمیں پہ آج ہم اک بار ہی سہی

دنیا ہمارے نام سے بیزار ہی سہی
لیکن ہم ان فضاؤں کے پالے ہوئے تو ہیں
گریاں نہیں پہ یاں سے نکالے ہوئے تو ہیں

مجھے اس اعتراف سے کوئی عار نہیں کہ متعدد دوسرے اچھے شاعروں کے اثرات کی طرح میرے ہاں ساحر کی فلمی و غیر فلمی شاعری کا غیر ارادی اثر آتا رہا ہے۔جس سے شعوری سطح پر کوئی متاثر ہو وہ لاشعوری طور پر کسی نہ کسی رنگ میں اپنا اثر ضرور ڈالتا ہے۔اب غور کرتا ہوں تو بعض اشعار اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

دیکھا تو تھا یوں ہی کسی غفلت شعار نے
دیوانہ کر دیا دلِ بے اختیار نے
(ساحر لدھیانوی)

یونہی دیکھا تھا جسے چشمِ تماشائی سے
اب نکلتا ہی نہیں روح کی گہرائی سے
(حیدر قریشی)

تنگ آ چکے ہیں کشمکشِ زندگی سے ہم
ٹھکرا نہ دیں جہاں کو کہیں بے دلی سے ہم

گریز کا نہیں قائل حیات سے لیکن
جو سچ کہوں کہ مجھے موت ناگوار نہیں
(ساحر لدھیانوی)

زندگی اور موت کے بارے میں نے بہت سارے شعر کہے ہیں لیکن یہاں ایک مثال پر

اکتفا کروں گا۔

اور تھے حیدرؔ جو اس کی چاہ میں مرتے رہے
ہم نے اُلٹے ہاتھ سے جھٹکی ہوئی ہے زندگی

اچھے اچھے معروف شاعروں کے ہاں بھی ساحر لدھیانوی کی شاعری کی گونج سنائی دیتی ہے۔ ساحر کی ایک نظم جس کے کچھ حصے گائے بھی گئے ہیں۔ بڑا مشہور گیت ہے۔

''پیار پر بس تو نہیں ہے مرا لیکن پھر بھی، تو بتا دے کہ تجھے پیار کروں یا نہ کروں''

ساحر لدھیانوی کا یہ مردانہ انداز پروین شاکر کے ہاں نسائی روپ کے ساتھ یوں ظاہر ہوتا ہے۔

میں اس کی دسترس میں ہوں مگر وہ
مجھے میری رضا سے مانگتا ہے

ساحر لدھیانوی جب روایتی ترقی پسندوں کی ''تعمیلِ ارشاد'' پروگرام کی طرح شاعری کرتے ہیں تو وہی موضوعات ان کے ہاں گھسے پٹے انداز میں آتے ہیں جیسے دوسرے ترقی پسند شاعروں کے ہاں ملتے ہیں۔ گھن گرج، نعرہ بازی، انقلاب سے دنیا بدل دینے کے دعوے، ایسے ایسے دعوے جن کا خود اپنی ذاتی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا (کسی بھی نظریاتی شاعر اور ادیب کے قول و فعل میں کچھ نہ کچھ ہم آہنگی تو دکھائی دینی چاہئے۔) لیکن جب جب وہ اپنے مخصوص موضوعات کو تخلیقی سطح پر مس کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں وہیں ان کے اشعار میں جیسے عصر کو عبور کر لینے کی قوت دکھائی دینے لگتی ہے۔

دہر کے حالات کی باتیں کریں
اس مسلسل رات کی باتیں کریں

فلم ''نوجوان'' کے گیت ''ٹھنڈی ہوائیں لہرا کے آئیں'' سے بطور شاعر اپنے فلمی کیریئر کا آغاز کرنے والے ساحر لدھیانوی نے ''میں پل دو پل کا شاعر ہوں'' تک فلمی شاعری کو اعلیٰ ادبی معیار تک پہنچا دیا۔ ''پھر صبح ہوگی''، ''ہم دونوں''، ''وقت''، ''ہمراز'' اور ''گمراہ'' جیسی کتنی ہی فلموں کے کیسے کیسے گانے جیسے ہماری زندگی کا حصہ بنے ہوئے ہیں۔ جنسی جذبات کو کسی حد تک کھل کر اور

پھر لطافت کو ملحوظ رکھ کر بیان کرنا ساحر لدھیانوی کی شاعری کا کمال ہے۔ ان سے پہلے جنسی جذبات یا تو بہت زیادہ ملفوف انداز میں بیان کیے جاتے یا پھر فحاشیت کا تاثر پیدا کرتے ہوئے پھوہڑ پن سے بیان کیے جاتے تھے۔ اس سے ہٹ کر زندگی کے دوسرے معاملات و مسائل سے متعلق انسانی نفسیاتی و جذباتی اتار چڑھاؤ کی کتنی کیفیات کی ترجمانی ان کے گیتوں میں موجود ہے۔

فلم ''دھند'' کے ایک گیت میں تو فلسفیانہ سطح پر زندگی کے بھید کو بھی ساحر لدھیانوی نے کتنے سہل اور آسان پیرائے میں بیان کر دیا ہے۔

سنسار کی ہر شئے کا اتنا ہی فسانہ ہے
اک دھند سے آنا ہے، اک دھند میں جانا ہے
اک پل کی پلک پر ہے ٹھہری ہوئی یہ دنیا
اک پل کے جھپکنے تک ہر کھیل سہانا ہے

فلم کاجل کا بھجن ''تو را من درپن کہلائے'' اتنا پُر تاثیر ہے کہ سنتے ہی بندہ سوچتا ہے کہ سادھو بن کر کسی جنگل کی راہ لی جائے۔ اور فلم ''چترلیکھا'' کا گیت ''سنسار سے بھاگے پھرتے ہو بھگوان کو تم کیا پاؤ گے''، سُن کر ساری تپسیا ترک کر کے دنیا کی گہما گہمی میں شامل ہو کر زندگی سے لطف کشید کرنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ دونوں گیتوں کے اشعار ایک ساتھ پیش کر رہا ہوں۔

فلم کاجل کا بھجن

پرانی اپنے پربھو سے پوچھے، کس ودھی پاؤں تو ہے
پربھو کہے تو من کو پالے، پا جائے گا مو ہے

تو را من درپن کہلائے
بھلے بُرے سارے کرموں کو دیکھے اور دکھائے
من ہی دیوتا، من ہی ایشور، من سے بڑا نہ کوئے

من اجیارا جب جب پھیلے جگ اجیارا ہوئے
اس اُجلے درپن پر پرانی دھول نہ جمنے پائے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
سکھ کی کلیاں، دُکھ کے کانٹے، من سب کا آدھار
من سے کوئی بات چھپے نہ من کے نین ہزار
جگ سے چاہے بھاگ لے کوئی، من سے بھاگ نہ پائے۔۔۔۔
تن کی دولت ڈھلتی چھایا، من کا دھن ان مول
تن کے کارن، من کے دھن کو مت ماٹی میں رول
من کی قدر بھلانے والا ہیرا جنم گنوائے۔۔۔۔۔۔۔۔۔

فلم چترلیکھا کا گیت

سنسار سے بھاگے پھرتے ہو بھگوان کو تم کیا پاؤ گے
اس لوک کو بھی اپنا نہ سکے، اُس لوک میں بھی پچھتاؤ گے
یہ پاپ ہے کیا اور پُن ہے کیا، رِیتوں پر دھرم کی مہریں ہیں
ہر یُگ میں بدلتے دھرموں کو کیسے آدرش بناؤ گے۔۔۔۔
یہ بھوگ بھی ایک تپسیا ہے، تم تیاگ کے مارے کیا جانو
اپمان رچیتا کا ہوگا، رچنا کو اگر ٹھکراؤ گے۔۔۔۔۔۔۔
ہم کہتے ہیں یہ جگ اپنا ہے، تم کہتے ہو جھوٹا سپنا ہے
ہم جنم بِتا کر جائیں گے، تم جنم گنوا کر جاؤ گے۔۔۔۔۔

ساحر لدھیانوی خوش قسمت تھے کہ انہیں ایس ڈی برمن کے ذریعے پہلا گیت لکھنے کا چانس ملا تو آگے چل کر انہیں خیام جیسے موسیقار کی قربت ملی۔ خیام نے ساحر سے مقررہ موسیقی پر گیت لکھوانے کی بجائے ان کی لکھی ہوئی شاعری کی بنیاد پر دھنیں ترتیب دیں اور انہیں مقبول عام گیت بنا دیا۔ امرتا پریتم نے ساحر لدھیانوی سے جس محبت اور وابستگی کو بیان کیا ہے وہ سب سچ

ہوگا لیکن مجھے یہ سوال ہمیشہ الجھن میں مبتلا کرتا ہے کہ امرتا پریتم نے یہ سارا انکشاف اس وقت کیوں کیا جب ساحر لدھیانوی اپنی شہرت کے عروج پر تھے۔

ادبی دنیا کے بعض لکھنے والوں نے ساحر لدھیانوی کی فلمی شاعری کو کمتر گردانا ہے۔ مجھے اس موقف سے اتفاق نہیں ہے۔ ساحر لدھیانوی کی فلمی شاعری روایتی فلمی گیتوں سے الگ اپنی پہچان کراتی ہے۔ ہر چند ان کے زمانے کے بیشتر فلمی شاعر بذاتِ خود عمدہ ادبی شاعر تھے، تاہم ساحر لدھیانوی کی ادبی آن بان باقی سب سے الگ دکھائی دیتی ہے۔ ان کی عام شاعری اور ان کے فلمی گیت سب عوام کے دلوں کی دھڑکن تھے اور ان کی ادبی حیثیت بھی مستحکم ہے۔ ان پر اعتراض کرنے والوں کی اپنی شاعری کو سامنے لا کر ساحر لدھیانوی کے گیتوں سے اور عام شاعری سے ان کا موازنہ کیا جائے تو نام نہاد معترضین کے اعتراض کا سارا بھرم کھل جائے۔

ساحر لدھیانوی کو قریب سے دیکھنے اور قریب سے جاننے والوں نے ان کی زندگی کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے جس سے ساحر کی خوبیوں اور کمزوریوں کا تھوڑا بہت اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہاں مجھے اپنے پسندیدہ شاعر کی ایک دو کم زوریوں اور کوتاہیوں کا بھی تھوڑا سا ذکر کرنا ہے۔ مظہر امام نے اپنے خاکوں کے مجموعہ ''اکثر یاد آتے ہیں'' میں ساحر لدھیانوی کا جو ذکر کیا ہے، اس کا ایک اقتباس یہاں پیش کر رہا ہوں۔ اس میں ساحر کی ادبی اور شخصی دو کمزوریوں کا ہلکے سے اشارے میں مناسب ذکر آ گیا ہے، اور میں اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

''ساحر لدھیانوی جنہیں فلمی دنیا سے وابستہ ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا بمبئی سے آئے تھے۔ ہم لوگ پاس کے ایک چائے خانے میں بیٹھے۔ ذکر فلمی دنیا کا آیا تو وہ اس زمانے کی بعض بڑی ہیروئنوں کا مذاق اڑانے لگے کہ ان سے ٹافی کے علاوہ اور کسی موضوع پر بات نہیں کی جا سکتی۔ پھر پرکاش پنڈت سے مخاطب ہو کر کہنے لگے: بھئی مجاز کو انجکشن وکشن دلوا کر اس کی شادی کرا دو۔'' (آج میں سوچتا ہوں کہ ساحر نے خود انجکشن وکشن لے کر شادی کیوں نہ کی)۔ کانفرنس میں نیا مینی فیسٹو پیش ہونا تھا۔ ساحر کہنے لگے، بھئی بحث ہوگی۔ ڈرافٹ مینی فیسٹو پڑھ کر تیاری کرنی چاہیے۔ ساحر نے بحث میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ حصہ کیا لیتے، وہ بحث کے دوران موجود ہی نہیں

تھے۔(شاید انہیں بھی اب 'ٹافی' کے علاوہ کسی موضوع سے دلچسپی نہیں تھی)''

ایک اور غلطی یا کوتاہی جو ساحر لدھیانوی سے سرزد ہوئی، انہوں نے بمبئی میں جو جائیداد بنائی، اسے لاوارث چھوڑ گئے۔ان جیسے انقلابی اور غریبوں کے ہمدرد کو اپنی زندگی میں ہی اس کا کوئی بہتر بندوبست کر لینا چاہیے تھا۔اگر وہ بمبئی کے غریبوں، بے کس لوگوں کی امداد کے لیے کوئی صدقۂ جاریہ قسم کا انتظام کر جاتے تو آج کتنے مستحق لوگ وہاں سے فیض یاب ہو کر، ساحر لدھیانوی کے انسانیت کی خدمت والے خوابوں کی تعبیر پا رہے ہوتے اور ساحر لدھیانوی کی روح کے لیے سکون موجب بن رہے ہوتے۔لیکن ان کی وفات کے بعد کروڑوں کی جائیداد (جو شاید اب اربوں روپے مالیت تک پہنچ چکی ہو) ان لوگوں نے ہتھیا لی جن کا ساحر لدھیانوی کے خوابوں سے شاید کوئی خاص تعلق نہیں تھا۔وہ صرف قبضہ گروپ کے لوگ تھے۔

ایسی کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود ساحر لدھیانوی ترقی پسند تحریک کے ایسے بڑے شاعر ہیں جنہیں فیض احمد فیض کے برابر شمار کیا جانا چاہیے۔ابھی تک ایسا نہیں ہوا تو اس کی وجہ ساحر لدھیانوی کی اپنی بے نیازی رہی ہے۔انہوں نے اپنے ڈھب کی بہت خوبصورت شاعری کی۔بمبئی کی فلمی گیتوں کی انڈسٹری پر چھائے رہے لیکن انہوں نے نہ تو اردو دنیا کی سطح پر اپنی ادبی حیثیت کی طرف کوئی خاص توجہ کی اور نہ ہی بین الاقوامی سطح پر کسی طرح کی لابنگ کا سوچا۔فیض احمد فیض نہ صرف اردو کی قومی سطح پر مسلسل نمایاں ہوتے رہے بلکہ انہوں نے بین الاقوامی سطح پر بھی اچھی لابنگ کی اور اس کے ثمرات بھی حاصل کیے۔

اگر اب اردو دنیا ساحر لدھیانوی کے خاص نمبر زاسی طرح جاری کرنے لگی جیسے وسیم فرحت صاحب شائع کرنے جا رہے ہیں تو مجھے امید ہے کہ ساحر شناسی کا عمل آہستہ آہستہ آگے بڑھے گا۔اردو دنیا سے آگے جا کر بین الاقوامی سطح پر ان کے فن کی طرف توجہ کی جانے لگے گی اور پھر ادبی دنیا ساحر لدھیانوی کے بارے میں بہتر فیصلہ کر سکے گی کہ وہ کتنے بڑے ترقی پسند شاعر تھے۔فیض جتنے بڑے یا ان سے کم بڑے۔

وسیم فرحت صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنے رسالہ سہ ماہی ''اردو'' کے ساحر

لدھیانوی نمبر کے لیے مجھے کچھ لکھنے کی تحریک کی اور یوں ساحر لدھیانوی سے ادبی محبت کا ایک پرانا قرض اس مضمون کی صورت میں کچھ ادا کرنے کی کوشش کر سکا ہوں۔مضمون شاید کچھ زیادہ مربوط نہیں ہے لیکن اس بکھراؤ کی حالت میں بھی میرے احساسات کی سچائی میرے لیے کافی ہے۔

سہ ماہی **شعرو سخن** مانسہرہ شمارہ:۵۵۔جولائی تا ستمبر ۲۰۱۳ء

سہ ماہی **اردو**، امراوتی۔ساحر لدھیانوی نمبر اپریل تا دسمبر ۲۰۱۳ء

رسول حمزہ کی نظموں کے تراجم
اصل ترجمہ نگار فیض احمد فیض

میرے مضمون ''رسول حمزہ کی نظموں کے تراجم: اصل ترجمہ نگار کون؟''[۱] کے سلسلہ میں تازہ ترین تحقیقی پیش رفت یہ ہوئی ہے کہ نظموں کے اصل ترجمہ نگار فیض احمد فیض ہیں اور ظ۔انصاری پر سرقہ کا کوئی الزام بھی نہیں آتا۔اس پیش رفت کا سہرا ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ کے سر ہے۔اس سلسلہ میں حقیقتِ حال کو بیان کرنے سے پہلے ایک بات بطور تمہید کرنا چاہوں گا۔میرا مذکورہ بالا مضمون روزنامہ ہمارا مقصد دہلی[۲] میں دو قسطوں میں شائع ہوا تھا۔تب میں نے اس مضمون کو سوشل میڈیا کے مختلف فورمز پر خود بھی ریلیز کیا تھا اور بعض دوسرے احباب نے بھی اس مضمون کو نمایاں کیا تھا۔فیض شناسی اور فیض فہمی کے بعض ''ماہرین'' کو بھی یہ مضمون بطور خاص بھیجا گیا تھا۔تاہم اس پر تحقیقی زاویے سے کہیں بھی کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔لیکن الماس کے شمارہ نمبر ۱۳ میں جیسے ہی یہ مضمون شائع ہوا اور جرمنی پہنچا،اسی روز مجھے ڈاکٹر کرسٹینا نے ای میل کے ذریعے تحقیق کی نئی صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

اس سارے پس منظر کے ساتھ جب نظموں کے توارد کے مسئلہ کی تحقیق کی پیش رفت کو دیکھا ہے تو مجھے ایک اور زاویے سے طمانیت کا احساس ہوا ہے۔جرنلزم اور سوشل میڈیا کی یلغار کے سامنے ادب کا منظر جیسے دھندلایا ہوا لگ رہا تھا۔ادبی رسائل اور جرائد جیسے اپنی اہمیت کھو رہے تھے۔بے شک جرنلزم کے نئے ذرائع بے حد طاقت ور ہیں اور سوشل میڈیا کی برق رفتاری نے روابط کے لحاظ سے دنیا کو سچ مچ گلوبل ولیج میں بدل کر رکھ دیا ہے۔اس کے باوجود سنجیدہ ادبی معاملات کا اہم ترین فورم اب بھی ادبی جریدہ ہے،ادبی رسالہ ہے۔جون ۲۰۱۱ء کی شروع کی

تاریخوں میں چھپنے کے بعد ایک سال کے عرصہ تک سوشل میڈیا کے ذریعے کسی نے بھی مزید تحقیق میں دلچسپی نہیں دکھائی۔ان محققین اور مولفین نے بھی توجہ نہیں کی جو فیض صدی میں فیض شناسی کی کتابیں لکھ کر اور تالیف کر کے اپنی ان کتابوں کی رونمائی کی تقریب دنیا بھر میں مناتے رہے ہیں۔لیکن جیسے ہی شاہ عبداللطیف یونیورسٹی خیر پور سندھ کے تحقیقی مجلّہ الماس میں یہ مضمون شائع ہوا،پہلے دن ہی اس کا نوٹس لیا گیا اور تحقیق کا دوسرا پہلو بلکہ اصل پہلو بھی سامنے آ گیا۔اس سے ادبی جرائد کی اہمیت اور قدر و قیمت کا یقین بڑھا ہے۔کم از کم میرے لیے تو یہ ایک خوشکن صورت حال ہے۔سو میں اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سوشل میڈیا کی برکات سے انکار کیے بغیر اردو کے سنجیدہ اور معیاری ادبی جرائد کی اہمیت قائم ہے اور جب تک ادب کی اہمیت سلامت ہے،ادبی جرائد کی اہمیت قائم رہے گی۔

اب اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ڈاکٹر کرسٹینا نے الماس شمارہ نمبر ۱۳ میں میرا مضمون پڑھ کر مجھے یہ ای میل بھیجی:

''قریشی جی!ابھی الماس میں آپ کا مضمون دیکھا۔اتفاق سے میں نے اس موضوع پر لکھا ہے،عنقریب پاکستانیت آن لائن جرنل میں شائع ہونے والا ہے۔ظ۔انصاری نے اپنی کتاب میں صاف لکھا ہے کہ انہوں نے رسول حمزہ کے دوست فیض احمد فیض کے کچھ تراجم شامل کر لیے ہیں۔حوالہ دیکھئے ''سوویت یونین کے پندرہ شاعروں کا منتخبہ کلام'' ماسکو۔۱۹۷۴ء۔صفحہ ۱۰۸۔اس سے سارا جھگڑا ہی ختم ہو گیا۔پتہ نہیں کسی نے اس طرف دھیان کیوں نہیں دیا۔''[۳]

اس کے جواب میں میری طرف سے اسی روز یہ جواب بھیجا گیا:

''کرسٹینا جی!یہ تو آپ نے بہت اچھی خبر سنائی۔ماسکو والے بھی اس سے بے خبر تھے۔اچھا ہوا تحقیقی حوالے سے ایک کام اپنے اچھے انجام کو پہنچا۔اچھا ہو گا اگر آپ یہ مضمون الماس میں بھی بھیج دیں۔بے شک اسے میرے مضمون کے تناظر میں اپ ڈیٹ کر لیں۔آپ کا مخلص حیدر قریشی''[۴]

میری خواہش تھی اور میں نے کوشش بھی کی کہ ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ اس سارے قضیہ کے

حوالے سے ایک مضمون لکھیں لیکن انہوں نے اس سلسلہ میں ایک وضاحتی مکتوب لکھنے کی حد تک رضامندی ظاہر کی تو میں نے ان سے اجازت لے کر پھر خود یہ مضمون لکھنے کا فیصلہ کیا۔ یہاں اپنے سابقہ مضمون کا ایک اقتباس درج کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ جب ڈاکٹر لدمیلا نے اس توارد کی طرف توجہ دلانے کو میرا ''کمال'' قرار دیا تو میں نے صاف گوئی کے ساتھ لکھا کہ:

''میرے مذکورہ ''کمال'' کی حقیقت یہ ہے کہ ۷ مئی ۲۰۱۱ء کو جب میں ڈاکٹر ناصر عباس نیر سے ملنے کے لیے ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں گیا تو وہاں ان کے پاس ''منظوم ترجمے: ظ انصاری'' دیکھنے کا موقعہ ملا اور وہیں ناصر عباس نیر کی طرف سے اس قضیہ پر فکرمندی کا اظہار ہوا۔ ان کے توسط سے ان تراجم تک رسائی کے بعد میں نے بیت السبوح لائبریری فرینکفرٹ سے ''نسخہ ہائے وفا'' حاصل کی اور اس سب کے نتیجہ میں یہ مضمون مکمل کیا ہے۔ ابھی ناصر عباس نیر اور ڈاکٹر لدمیلا اس موضوع پر اپنی اپنی تحقیق کر رہے ہیں، ان کی تحقیق کے نتائج سامنے آنے کے بعد صورتحال مزید واضح ہو سکے گی۔ دوسرے ادباء بھی جو اس قضیہ میں سنجیدہ اور تحقیقی نوعیت کی دلچسپی رکھتے ہیں اپنے طور پر اظہار خیال کر سکیں گے۔''[۵]

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ میں نے تب بھی اپنے مضمون کو اپنا کوئی کمال نہیں سمجھا تھا۔ اسی حوالے سے اب مزید وضاحت کرنا چاہوں گا کہ سات مئی ۲۰۱۱ء کو ہائیڈل برگ میں ناصر عباس نیر سے چند گھنٹوں کی ملاقات ہوئی تھی۔ اس میں گزشتہ اٹھارہ انیس برسوں کی بے شمار ادبی اور ذاتی باتیں ہوئی تھیں۔ اسی دوران ظ۔ انصاری کی کتاب وہاں دیکھی تو اس موضوع پر بات ہوئی۔ کتاب کو بالکل سرسری ہی دیکھا۔ کتاب ساتھ لے جانے کی خواہش ظاہر کی تو ناصر عباس نیر نے بتایا کہ یہ ڈاکٹر کرسٹینا کے لیے لایا ہوں اور انہیں دینا ہے۔ ہائیڈل برگ سے اپنے گھر واپس جا کر جب مجھے مضمون لکھنے کا خیال آیا تو میں نے ناصر عباس نیر سے کہا کہ مجھے متعلقہ صفحات کی نقول مہیا کر دیں تو ممنون ہوں گا۔ انہوں نے کرم کیا اور بظاہر توارد والی نظموں اور کتاب کے شروع کے صفحہ کی کاپیاں مجھے ای میل سے بھیج دیں۔ اور انہی کی بنیاد پر میں نے اپنا مضمون مکمل کر لیا۔ اگر پوری کتاب میری دسترس میں ہوتی تو میں خود اس وضاحت تک پہنچ جاتا جس کی طرف اب ڈاکٹر کرسٹینا نے توجہ دلائی ہے۔ یہاں ڈاکٹر کرسٹینا کی طرف سے ارسال کردہ ،ظ۔ انصاری کے پیش لفظ کے متعلقہ معین الفاظ بھی درج کر دیتا ہوں۔

''رسول حمزہ توف کے دوست فیض احمد فیض نے ان میں بعض کو اردو لباس عطا کیا تھا اور ہم نے وہ

بھی شامل کر لئے''[۶]

بہرحال اب ڈاکٹر کرسٹینا کی نشان دہی کے بعد یہ امور واضح ہو گئے ہیں کہ:

۱۔ رسول حمزہ کی زیر بحث ساتوں نظموں کے تراجم فیض احمد فیض نے کیے تھے۔

۲۔ ظ۔ انصاری نے بھی سرقہ نہیں کیا تھا، بلکہ کتاب کے اندر اپنے مضمون/پیش لفظ میں فیض کے تراجم کا حوالہ دے دیا تھا۔

۳۔ ظ۔ انصاری کی کتاب کا پورا نام ''سوویت یونین کے پندرہ شاعروں کا منتخبہ کلام'' تھا۔ البتہ اندر کے ایک پورے صفحہ پر ''منظوم ترجمے ظ۔ انصاری'' بھی لکھا ہوا تھا۔ مجھے یہی صفحہ موصول ہوا تھا۔

اپنے پہلے مضمون میں درپیش توارد کی صورت حال پر میں نے حیرانی کا اظہار تو کیا تھا لیکن فیض احمد فیض اور ظ انصاری میں سے کسی پر بھی سرقہ کا الزام لگانے سے مکمل احتیاط کی تھی۔ میں نے صاف لکھا تھا کہ:

''ان تراجم کو دونوں میں سے کسی ایک کا بھی سرقہ کہنا مناسب نہیں ہے، لیکن یہ توارد حیران کن ضرور ہے۔ فیض صاحب کی شہرت اور عظمت رسول حمزہ کی شاعری کے کسی بھی ترجمہ سے کہیں زیادہ بلند و بالا ہے جبکہ ظ انصاری روسی زبان پر عبور رکھنے کے باعث خود ایک ماہر ترجمہ نگار تھے، انہیں فیض صاحب کی ترجمہ کردہ نظمیں جوں کی توں اٹھا لینے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ تو پھر یہ کیا ماجرا ہے؟''[۷]

مجھے خوشی ہے کہ ڈاکٹر کرسٹینا کی طرف سے توجہ دلائے جانے کے بعد یہ سارا معاملہ صاف ہو گیا ہے۔ ایک ادبی حقیقت واضح طور پر سامنے آ گئی ہے اور میں برملا اس کا اعتراف کرتا ہوں۔ رسول حمزہ کی متنازعہ سات نظموں کے ترجمہ نگار فیض احمد فیض ہی تھے۔

حوالہ جات

۱۔ تحقیقی مجلّہ **الماس** شعبۂ اردو شاہ عبداللطیف یونیورسٹی خیر پور سندھ۔ شمارہ نمبر ۱۳۔ سال ۲۰۱۱۔۲۰۱۲۔ ص ۲۷۔ مدیر: ڈاکٹر محمد یوسف خشک

۲ روزنامہ **ہمارا مقصد** دہلی شمارہ یکم جون ۲۰۱۱ء اور دو جون ۲۰۱۱ء

۳ ڈاکٹر کرسٹینا کی ای میل بنام حیدر قریشی 12.09.2012 09:57

۴ حیدر قریشی کی ای میل بنام ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ 12.09.2012 / 10:37

۵ مضمون ''رسول حمزہ کی نظموں کے تراجم: اصل ترجمہ نگار کون؟'' از حیدر قریشی
مطبوعہ تحقیقی مجلّہ **الماس** شعبۂ اردو شاہ عبداللطیف یونیورسٹی خیر پور سندھ۔ شمارہ نمبر ۱۳۔
سال ۲۰۱۱۔۲۰۱۲۔ صفحہ ۷۵۔ مدیر: ڈاکٹر محمد یوسف خشک

۶ ظ۔ انصاری۔ ''سوویت یونین کے پندرہ شاعروں کا منتخبہ کلام'' صفحہ نمبر ۱۰۸۔ مطبوعہ ماسکو۔ ۱۹۷۴ء

۷ مضمون ''رسول حمزہ کی نظموں کے تراجم: اصل ترجمہ نگار کون؟'' از حیدر قریشی
مطبوعہ تحقیقی مجلّہ **الماس** شعبۂ اردو شاہ عبداللطیف یونیورسٹی خیر پور سندھ۔ شمارہ نمبر ۱۳۔
سال ۲۰۱۱۔۲۰۱۲۔ صفحہ ۷۳۔ مدیر: ڈاکٹر محمد یوسف خشک

مطبوعہ: ہم عصر ڈاٹ ڈی کے مدیر نصر ملک۔ مورخہ ۱۴/اکتوبر ۲۰۱۲ء

http://www.urduhamasr.dk/dannews/index.php?mod=article&cat=Literature&article=859

روزنامہ **آج** پشاور ادب سرائے۔ ۱۹/اکتوبر ۲۰۱۲ء

شاہ عبداللطیف یونیورسٹی خیر پور۔ شعبہ اردو۔ جرنل ''الماس'' شمارہ نمبر ۱۴۔ سال اشاعت ۲۰۱۳ء

ترقی پسند تنقید

سجاد ظہیر اور آج کا عہد

(نوٹ: اس مضمون میں بات ترقی پسند تنقید کے حوالے سے ہے
لیکن ضمناً بعض تحقیقی امور کا تذکرہ بھی کرنا ناگزیر ہے۔ ح۔ق)

ترقی پسند تحریک کو ابتدا میں ہی سجاد ظہیر جیسی متوازن شخصیت نصیب ہوگئی تھی۔ تنظیمی کارکردگی اور اس کے دوررس نتائج اپنی جگہ، بطور نقاد بھی سجاد ظہیر کو ترقی پسند تنقید کا مثالی نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

سجاد ظہیر نے جہاں ترقی پسند قواعد وضوابط اور معیاروں کو بیان کیا وہیں انہوں نے تحریک سے ہٹ کر لکھنے والوں کی اہمیت اور قدر و قیمت کا بھی ادراک کیا۔ چنانچہ ترقی پسند تنقید کو بلکہ پورے ترقی پسند ادب کو انتہا پسندانہ رویوں سے بچانے کے لیے انہوں نے معتدل طرزِ عمل اختیار کیا۔ ایسے ماحول میں جب غزل کو درباری شعری صنف کہہ کر ادب بدر کرنے کی باتیں ہو رہی تھیں، سجاد ظہیر نے ایک عمومی ادبی فضا میں اس قسم کی رہنمائی کرنا ضروری سمجھا:

۱۔ ''شاعر کا پہلا کام شاعری ہے۔ وعظ دینا نہیں۔ اشتراکیت وانقلابیت کے اصول سمجھانا نہیں۔ اصول سمجھانے کے لیے کتابیں موجود ہیں، اس کے لیے ہم کو نظمیں نہیں چاہئیں۔ شاعر کا تعلق جذبات کی دنیا سے ہے۔ اگر وہ اپنے تمام ساز وسامان تمام رنگ و بو، تمام ترنم وموسیقی کو پوری طرح کام میں نہیں لائے گا، اگر فن کے اعتبار سے اس میں بھونڈا پن ہوگا، اگر وہ ہمارے

احساسات کو لطافت کے ساتھ بیدار کرنے سے قاصر ہوگا تو اچھے سے اچھے خیال کا بھی وہی حشر ہوگا جو دانے کا بنجر زمین میں ہوتا ہے۔'' **(غلط رجحان ۔ شاہراہ)**

۲۔ ''جب ہم مختلف اصناف کو جانچیں اور پرکھیں تو ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ایک صنف کا دوسری صنف سے فرق بھی دیکھیں۔ مثلاً ہمیں اس کا تو اختیار ہے کہ جب ہم دو پھولوں کا مقابلہ کریں تو گلاب کو چمیلی پر مجموعی حیثیت سے ترجیح دیں، لیکن اگر ہم فطرت کے ان دو بہشتی تحفوں کی علیحدہ اور منفرد خوبیوں کو بھی نہیں سمجھتے تو پھر ہماری تنقید یک طرفہ اور نامکمل اور اس لئے گمراہ کن ہوگی۔ شعر و ادب زندگی کے ہر پہلو کی ہزاروں نئے اور دل فریب انداز میں تنقید اور تصویر کشی کرتے ہیں۔ انھیں نمایاں کرتے ہیں اور بے شمار طریقوں سے ہمارے دل و دماغ کو متاثر اور محظوظ کرتے ہیں۔ ایک وقت اور ایک موقع پر زندگی کا ایک خاص پہلو زیادہ لائق توجہ ہوسکتا ہے۔'' **(سجاد ظہیر ''روشنائی'' سے ماخوذ)**

سجاد ظہیر چونکہ ترقی پسند تحریک کے بنیادگزاروں میں شامل تھے، اس لیے ان سے اس حوالے سے بعض بنیادی نوعیت کے سوال کیے گئے تو انہوں نے بڑے سلیقے کے ساتھ ان سوالوں کو بیان کر کے ان کے حوالے سے اپنا موقف واضح کیا۔

''بعض لوگ سوال کرتے ہیں کہ جب ہر دور میں ترقی پسند ادب کی تخلیق ہوتی رہی ہے اور جب حالی، شبلی اور اقبال بھی ترقی پسند ہیں تو پھر آخر ترقی پسند مصنفین کی انجمن بنانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟

یہ سوال ایسا ہی ہے جب دنیا میں ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک پھول کھلتے رہے ہیں تو باغ لگانے کی کیا ضرورت ہے؟ اس انجمن کی ضرورت اسی وجہ سے ہوئی جس وجہ سے دوسری انجمنوں کی ہوتی ہے یعنی کہ انسان اجتماعی طور پر ادبی مسائل پر گفتگو اور بحث کریں۔ انسان اور جماعت کو سمجھیں، سماجی کیفیت کا تجزیہ کریں اور اس طرح مشترکہ نصب العین قائم کریں اور اس کے مطابق عمل کریں۔ یہ اجتماعی کوشش انفرادی کوشش سے بہتر ہوگی۔'' **سجاد ظہیر**

سجاد ظہیر کے تنقیدی سلیقے کا اثر نقادوں کی اگلی کھیپ تک گیا۔ احتشام حسین، مجنوں

گورکھپوری، ممتاز حسین، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر قمر رئیس، سے لے کر محمد علی صدیقی اور ڈاکٹر رشید امجد تک نقادوں نے ادبی سلیقے اور تہذیب کو ملحوظ رکھا۔ کہیں اختلاف رائے میں تلخی بھی در آئی تو اس کے اظہار میں ایک تہذیبی وقار کو ہمیشہ قائم رکھا گیا۔ لیکن ترقی پسند تحریک کی بہت زیادہ مقبولیت کے نتیجہ میں عام ترقی پسند نقادوں میں بعض خرابیاں بھی راہ پانے لگیں۔ یہ خرابیاں اپنی عوامیت کے باعث اس حد تک راہ پا گئیں کہ پڑھے لکھے نقادوں کے لیے بھی صورتِ حال کو سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ میں چند تاریخی خرابیوں کی طرف ہلکا سا اشارہ کروں گا۔ تحریک سے تعلق رکھنے والے کمزور ترین تخلیق کاروں کو بھی غیر معمولی اہمیت دی جانے لگی اور تحریک سے اختلاف رکھنے والے کئی اہم اور بڑے تخلیق کاروں کو رد کیا جانے لگا۔ اس تنقیدی رویے سے ایک طرف ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر لکھنے والوں میں نعرہ بازی رواج پانے لگی اور تخلیقی حسن ماند پڑنا شروع ہوگیا۔ دوسری طرف یہ رویہ غیر ترقی پسند ادیبوں کے باقاعدہ بائیکاٹ کرنے کی قرارداد منظور کرنے پر منتج ہوا۔ یہ ایسی تاریخی غلطی تھی جس کا خمیازہ پھر تحریک کو تادیر بھگتنا پڑا۔ تاہم ان غلطیوں کا ادراک بھی کر لیا گیا اور پھر ان کے ازالہ کی کوشش بھی کی گئی۔ ترقی پسند تحریک کے نسبتاً بعد میں آنے والے نقادوں نے اس ازالہ میں اہم کردار ادا کیا۔ محمد علی صدیقی نے اس سلسلہ میں خاصا کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر رشید امجد نے تو بعض غلطیوں کا برملا اعتراف کیا۔

''ہمارے اکثر ترقی پسندوں نے بغیر سوچے سمجھے مذہب کو اپنا مخالف بنا لیا۔ اس میں انگریزوں کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ کمیونزم کا مقابلہ کوئی فکری تحریک ہی کر سکتی ہے، چنانچہ انہوں نے ایک پلاننگ کے تحت اسلام اور کمیونزم کا تضاد پیدا کر دیا حالانکہ اسلام اور کمیونزم کے بنیادی عقائد اور اخلاقیات ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں۔ اقبالؔ نے یونہی تو نہیں کہہ دیا تھا کہ ؎ نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب ۔۔۔ عبید اللہ سندھی نے کہیں لکھا ہے کہ لینن اسلام کے بارے میں نرم گوشہ رکھتے تھے اور سٹالن تو برطانیہ کے خلاف مسلمانوں کا ایک بلاک بنانا چاہتے تھے۔ لیکن شاطر برطانیہ نے نہ صرف یہ بلاک نہیں بننے دیا بلکہ الٹا مسلمانوں کو کمیونسٹوں سے ایسا لڑایا کہ یہ لڑائی پھر مسلمان ہی نے لڑی۔ انگریز کا یہ منصوبہ افغانستان میں جا کر مکمل

ہوا۔ ہمارے ترقی پسند عملی کی بجائے آئیڈیلسٹ تھے۔انہوں نے نہ تو یہاں کے ثقافتی مزاج کو سمجھا اور نہ مذہب کے گہرے اثرات کو محسوس کیا۔''

(ڈاکٹر رشید امجد کی خودنوشت **تمنا بے تاب** صفحہ نمبر ۱۳۱۔۱۳۰ سے اقتباس)

سجاد ظہیر اس حقیقت کو مذہب کے وسیع تر مفہوم، روحانی حوالے سے بہت پہلے ان الفاظ میں بیان کر چکے تھے۔

''علم وفن ہنر، آرٹ ادب اور اخلاق کے وہ خزانے جو گذشتہ دوروں میں ہمارے اسلاف نے اپنی جسمانی، ذہنی اور روحانی کاوش سے جمع کئے ہیں وہ ہمارا سب سے بیش قیمت سرمایہ ہے۔''

اس وقت ایک طرف تو علی احمد فاطمی اور پروفیسر شہناز نبی جیسے ترقی پسند ناقدین ہیں جو ادب کی جدید تر صورت حال سے بھی باخبر ہیں ترقی پسند ادب کے معیارات اور قلم کی تہذیبی اقدار کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں۔ مذکورہ بالا ناقدین اور ان جیسے دوسرے نئے ناقدین کی تربیت اسی علمی و ادبی ماحول میں ہوئی ہے جو سجاد ظہیر کے ذریعے احتشام حسین سے رشید امجد تک اردو ادب میں ایک مستحکم روایت کے طور پر موجود ہے۔لیکن ان مثبت رویوں کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں ایسی منفی مثالیں بھی موجود ہیں کہ جہاں خود کو نیا مارکسی نقاد سمجھنے والے بعض نوآموز ادب اور تہذیب سے بہت دور جا پڑتے ہیں۔اختلاف رائے، شدید نوعیت کا اختلاف رائے بھی تہذیب اور سلیقے سے بیان کیا جا سکتا ہے۔

میں اس سلسلہ میں خود اپنی چند تحریروں کے حوالے سے بات کرنا زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔فیض صاحب کے حوالے سے مجھے بارہا ایسا لکھنا پڑا جو ان کے شایانِ شان نہیں تھا، لیکن درپیش مسئلہ کی سنگینی کے باعث اس سے اغماض برتنا ادبی لحاظ سے مناسب نہ تھا۔سو میں نے وہ سب کچھ لکھا، لیکن اس لکھنے میں نہ صرف فیض صاحب کے مقام اور مرتبہ کو ملحوظ رکھا بلکہ اختلافی معاملہ کو تہذیب و شائستگی کے ساتھ پیش کیا۔ جہاں کوئی نیا تحقیقی مواد سامنے آیا تو اس کا برملا اعتراف کیا۔اس سلسلہ میں تین مختلف معاملات کو یہاں بیان کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

فیض صاحب کی کتاب ''شام شہریاراں'' میں رسول حمزہ کی سات نظموں کے

اردو تراجم شامل ہیں۔یہی تراجم ظ۔انصاری کی کتاب ''سوویت یونین کے پندرہ شاعروں کا منتخبہ کلام'' میں شامل تھے۔میں نے دستیاب مواد اور معلومات کی بنیاد پر اس پر ایک مضمون لکھا ''رسول حمزہ کی نظموں کے تراجم: اصل ترجمہ نگار کون؟''۔اس مضمون میں اس توارد کی نشان دہی تو کی ہے لیکن فیض احمد فیض اور ظ۔انصاری میں سے کسی کو بھی نہ مطعون کیا، نہ کسی پر سرقہ کا الزام لگایا بلکہ اس یقین کے اظہار کے ساتھ کہ دونوں میں سے کوئی بھی ایسا سرقہ نہیں کر سکتا، ساری صورتِ حال پر حیرت کا اظہار کیا اور ترقی پسند محققین کو اس معاملہ میں توجہ کرنے کے لیے کہا۔ترقی پسند دوستوں کو تو اس طرف توجہ دینے کی توفیق نہ ملی لیکن ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ نے اس سلسلہ میں ظ۔انصاری کے ان الفاظ کی طرف توجہ دلائی:

''رسول حمزہ تو ف کے دوست فیض احمد فیض نے ان میں بعض کو اردو لباس عطا کیا تھا اور ہم نے وہ بھی شامل کر لئے''۔

اس مبہم سے اعتراف میں ان نظموں کی کوئی نشان دہی نہیں کی گئی جن کا ترجمہ فیض احمد فیض نے کیا تھا۔اس کے باوجود جیسے ہی اس حقیقت کا علم ہوا میں نے فوراً ایک اور مضمون لکھا اور اس میں واضح طور پر اعتراف کیا کہ: ''رسول حمزہ کی متنازعہ سات نظموں کے ترجمہ نگار فیض احمد فیض ہی تھے۔''

اگر کج بحثی کر کے شہرت حاصل کرنا مقصود ہوتا تو اسی بات کو لے بیٹھتا کہ ظ۔انصاری نے سرسری اور مبہم سا ذکر کیا ہے پورے طور پر کوئی حوالہ نہیں دیا۔ پھر محض شہرت کمانے کے لیے ایک واضح سٹوری گھڑی جا سکتی تھی۔آج کے اسکینڈل بازی کے دور میں ایسی سٹوریز گھڑ لینا کوئی مشکل کام نہیں رہا۔ یہاں صرف اپنے موقف کو واضح کرنے کے لیے دو تین سٹوریز میں سے ایک کو مختصراً یہاں بیان کر دیتا ہوں۔

''جناب! فیض اور ظ۔انصاری دونوں ماسکو نواز تھے۔سوویت سرکار کے کارندے تھے۔وہاں سے حکم صادر ہوا کہ رسول حمزہ کی نظموں کے تراجم مختلف زبانوں میں کرائے جائیں۔ شعبہ اردو کی جانب سے اردو زبان کے لیے ممتاز ترجمہ نگار ظ۔انصاری کو منتخب کیا گیا۔انہوں نے

ترجمے کر دیئے۔ جب یہ ترجمے کچھ اوپر کے حکام تک پہنچے تو انہوں نے کہا کہ ظ۔ انصاری اچھے ترجمہ نگار ہیں لیکن مشہور آدمی نہیں ہیں، فیض شاعر بھی ہیں اور مشہور بھی۔ اس لیے ان کا نام اردو ترجمہ نگار کے طور پر دے دیا جائے۔ حکم سن کر سب نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ کس کی مجال تھی کہ فیصلہ کے خلاف کوئی بات کرتا۔ سوویت یونین میں سارے عظیم انقلابی سر تسلیم خم کر لیا کرتے تھے، فیض صاحب نے بھی سرِ تسلیم خم کیا۔ یوں بیٹھے بٹھائے فیض روسی زبان سے اردو زبان میں ترجمہ کرنے والے ماہر بن گئے''۔

یہ سٹوری نہ صرف قرینِ قیاس لگتی ہے بلکہ اس میں جان بھی ہے۔ اگر اسے اچھالا جاتا تو دائیں بازو کے ادیبوں کی ہمدردیاں آسانی سے مل جاتیں اور مل جل کر اتنا شور مچالیا جاتا کہ فیض کی بدنامی ہوتی نہ ہوتی، اپنی شہرت میں چار چاند ضرور لگ جاتے۔ لیکن میں نے ایسی کسی بھی اوچھی حرکت سے نہ صرف گریز کیا بلکہ بزرگوں کے ذکر پر ممکنہ حد تک ان کے ادب کو بھی ملحوظ رکھا۔ یہ تو ہوئی فیض کی ترجمہ نگاری کے حوالے سے بات۔ اب ان کی عمر کے آخری حصہ کی ایک نظم کے بارے میں اپنے ایک مضمون کا اقتباس پیش کرنا چاہوں گا۔ یہ مضمون پہلی بار ''تخلیق'' لاہور کے شمارہ ستمبر، اکتوبر ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا تھا۔ فیض احمد فیض نے اساتذہ کے اشعار سے جو براہ راست اکتساب کیا ہے، مضمون میں اس کا ذکر یوں کیا گیا تھا۔

''فیض کی آخری چند بڑی نظموں میں سے ایک نظم ''**مرے دل مرے مسافر**'' کا ایک حصہ ملاحظہ فرمائیں:

سرِ کوئے ناشناساں، ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا، کبھی اس سے بات کرنا
جو ملے نہ کوئی پرساں، بہم التفات کرنا
تمہیں کیا کہوں کہ کیا ہے، شبِ غم بُری بلا ہے
ہمیں یہ بھی تھا غنیمت جو کوئی شمار ہوتا
ہمیں کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

اس نظم میں مصحفی اور غالب کی واضح گونج کے باوجود فیض نے پُرانے لفظوں میں نئی معنویت پیدا کر دی ہے۔'' (**مضمون ''اردو نظم روایت سے جدیدیت تک''، بحوالہ ''حاصلِ مطالعہ''**)

شاعری میں کہیں سے مصرعہ لیا جائے تو اسے کامازمیں دینے کی مستحکم روایت موجود ہے۔ ایسی روایت کے ہوتے ہوئے فیض احمد فیض نے مصحفی اور غالب کے مصرعوں کو کامازمیں دینے کا تردد نہیں کیا بس ہلکی سی کمی بیشی کے ساتھ انہیں اپنا بنالیا۔ لیکن میں نے اس بات کو ایک مہذب پیرائے میں نشان زد کیا ہے۔

اور اب ایک تازہ ترین مسئلہ بھی پیش کیے دیتا ہوں۔ پاکستان کے ایک اخبار کے ادبی ایڈیشن میں میری طرف سے یہ خبر شائع ہوئی۔

فیض احمد فیض اور امریکی مفادات

''فیض احمد فیض ترقی پسند تحریک کے اہم ترین شاعر ہیں۔ سوشلسٹ انقلاب کی جدوجہد کے لیے ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ راولپنڈی سازش کیس کے نام سے مشہور سوشلسٹ انقلاب کی ناکامی کے بعد انہیں ۱۹۵۱ء میں قید کی سزا ہوئی۔ اس لحاظ سے فیض کی شخصیت امریکہ مخالف کے طور پر جانی جاتی ہے۔ لیکن اب ۱۷/اپریل ۲۰۱۳ء کو مبشر لقمان کے پروگرام ''کھرا سچ'' میں ایک حیران کن امریکی دستاویز سامنے آئی ہے۔ ۲۷ جون ۱۹۵۴ء کی یہ امریکی دستاویز سیاست اور بیوروکریسی سے وابستہ اہم پاکستانی شخصیات کی لسٹ پیش کر رہی ہے، جن کی پروجیکشن امریکی مفادات کے لیے مفید ہے۔ ان ناموں میں سیاست دانوں اور بیوروکریٹس کو چھوڑ کر ادب و صحافت سے وابستہ مشہور سوشلسٹ رہنما میاں افتخار الدین کا نام بھی شامل ہے جو خاصا حیران کن ہے لیکن ان سے بھی زیادہ حیران کن نام فیض احمد فیض کا ہے۔ کیا گرفتاری کے بعد جیل میں ہی کہیں کسی قسم کا کوئی سمجھوتہ طے پا گیا تھا یا امریکہ ویسے ہی فیض احمد فیض کی پروجیکشن کو اپنے مفادات کے لیے بہتر سمجھ رہا تھا۔ یہ امریکی ڈاکومنٹ مذکورہ پروگرام میں آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے جو اس لنک پر دستیاب ہے۔

http://www.zemtv.com/2013/04/17/kharra-sach-with-mubasher-lucman-17th-april-2013/

اس سارے معاملہ کو سوویت یونین اور امریکہ کی سرد جنگ کے دور کے تناظر میں دیکھنا بے حد ضروری ہے۔ یہ انکشاف فیض کے مداحوں سے سنجیدہ تحقیق کا تقاضا کر رہا ہے۔ کیونکہ اس سے فیض احمد فیض کی نظریاتی اور اخلاقی پوزیشن مجروح ہو رہی ہے۔'' (مطبوعہ روزنامہ صبح ایبٹ آباد۔''**ادب نامہ**''۲۵/اپریل۲۰۱۳ء)

اس خبر کی اشاعت کے بعد بعض ترقی پسند اور بعض غیر ترقی پسند دوستوں نے اپنے اپنے طور پر ردِعمل ظاہر کیا۔ کچھ ان کا جواب دیتے ہوئے اور کچھ خود مزید سوچتے ہوئے اس حوالے سے چند نکات ذہن میں آئے، ان میں سے چند اہم نکات یہاں بیان کر دیتا ہوں تا کہ اس موضوع پر مزید مکالمہ اور تحقیق کی گنجائش نکل سکے۔

ا۔ جس دن راولپنڈی میں انقلابی احباب کی میٹنگ ہوتی ہے، ریکارڈ کے مطابق اس میں فیض صاحب نے فوجی کاروائی کی مخالفت کی تھی۔ اس میٹنگ کے بعد اسی روز کسی نے حکام بالا کو اس سازش کی خبر پہنچا دی اور اگلے روز ہی کاروائی کر کے انقلابیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ترقی پسند انقلابیوں کی مخبری کس نے کی؟ پاکستان میں اس سازش کیس کا جو ریکارڈ ہے وہ آج تک سامنے نہیں لایا گیا۔ ہو سکتا ہے وہ ریکارڈ سامنے آئے تو مخبری کرنے والے کا نام سامنے آ جائے۔ تاہم امریکی دستاویز سامنے آنے کے بعد شک کی نظریں ایک بار تو فیض صاحب کی طرف بھی اُٹھتی ہیں۔

۲۔ ۱۹۵۴ء سے پہلے تک فیض صاحب ادبی حلقوں میں تو مقبول تھے لیکن عوامی سطح پر مقبول نہ تھے۔ ۱۹۵۴ء (امریکی ہدایت والے مراسلہ) کے بعد سے ہی ان کی عوامی مقبولیت ہونے لگی۔ گلوکاروں کی آوازوں میں فیض کی شاعری کے گلوں میں رنگ بھرنے لگے، اور وہ عوام میں مقبول ہوتے چلے گئے۔

۳۔ یہ حقیقت ہے فیض صاحب کی شخصیت اتنی پُر اثر ہے کہ ان کو شک کی نظر سے دیکھتے ہوئے بھی آنکھ جھک جاتی ہے، لیکن تحقیقی معاملات میں محبت اور عقیدت کی بجائے حقائق کو اہمیت دینا پڑتی ہے۔ جو امریکی، سوویت یونین کے پولٹ بیورو کی اہم ترین شخصیت گورباچوف تک کو اپنا گرویدہ

بنا سکتے ہیں، ان کے لیے فیض احمد فیض شاید اتنا بڑا ٹاسک نہیں رہ جاتے۔ خصوصاً ایسے پس منظر کے ساتھ کہ وہ برٹش آرمی میں رہ چکے تھے اور وہاں برطانوی سامراج کے لیے فوج میں بھرتی ہونے کی تحریک دینے کے نغمات بھی لکھا کرتے تھے۔ ان حقائق کے ساتھ یہ حقیقت بھی شامل کر لی جائے کہ آزادی کے بعد فیض صاحب جب انگلینڈ جاتے، اور اپنے پرانے فوجی افسر کو ملنے جاتے تو ہمیشہ اپنی فوجی وردی پہن کر جایا کرتے تھے۔

ایسے حقائق کو مدِ نظر رکھ کر اگر نئے سرے سے تحقیق کی جائے تو امریکی دستاویز کی حقیقت بہتر طور پر کھل کر سامنے آ سکتی ہے۔ فیض کے تعلق سے میری یہ ساری باتیں، یہ سارے حقائق شدید نوعیت کے ہونے کے باوجود ادب اور تمیز کے دائرے میں رہ کر لکھے گئے ہیں، اسی لیے ان سے اختلاف رکھنے والے ادیب بھی مجھ پر تہذیب کے دائرے سے باہر جانے کا الزام نہیں لگا سکیں گے۔

یہاں مجھے ممتاز ترقی پسند نقاد محمد علی صدیقی شدت سے یاد آ رہے ہیں۔ علامہ اقبال کا وہ تاریخی خط پہلی بار منظرِ عام پر آیا تھا جس میں انہوں نے اپنے تاریخی خطبہ الٰہ آباد میں مذکور خود مختاری کی وضاحت کرتے ہوئے صاف لکھا تھا کہ وہ ہندوستانی فیڈریشن کے اندر رہتے ہوئے خود مختاری مانگ رہے ہیں۔ اس پر ظاہر ہے پاکستان کے بعض حلقوں کی طرف سے شدید ردِعمل ظاہر ہونا تھا، سو ہوا۔ تب محمد علی صدیقی نے بڑے علمی وقار کے ساتھ کہا تھا کہ ہمارے لیے تاریخی حقائق محترم ہونے چاہئیں اور انہیں کی روشنی میں ہی بات کی جانی چاہیے۔ یہاں بھی کسی بڑے سے بڑے تنازعہ کی صورت میں تاریخی حقائق کی پرکھ کی جائے اور پھر انہیں محترم مان کر بات ادب اور سلیقے کے ساتھ کی جائے تو علمی مکالمہ آگے بڑھ سکتا ہے۔ تحقیق سے بعض مخفی حقائق سامنے لائے جا سکتے ہیں۔

بے شک اردو ادب میں بعض اوقات مختلف ادیبوں اور گروہوں کے درمیان شدید محاذ آرائی ہوئی ہے، اس کے نتیجہ میں ''مار دھاڑ سے بھرپور'' معرکہ آرائیاں تو ہوئی ہیں لیکن ان میں علمی معاملات خال خال ہی دکھائی دیتے ہیں۔ علمی معاملات میں اتفاق رائے ہو یا اختلاف رائے، اظہار میں

ہمیشہ ایک سلیقہ، ایک تہذیب اور مکالمہ کی مسلسل گنجائش موجود رہتی ہے اور رہنی چاہیے۔

اس ساری تمہید طولانی کے بعد مجھے یہ کہنا ہے کہ ترقی پسند تحریک کے حوالے سے بھی اور مارکسی تنقید کے حوالے سے بھی اب چند ایسے نئے لکھنے والے سامنے آرہے ہیں جن کا انداز نگارش نہ صرف جارحانہ ہے بلکہ اندازِ تخاطب بھی بدتہذیبی پر مبنی ہے۔ان نئے لکھنے والوں کا ترقی پسند تنقید کی صحت مند علمی روایت سے دور کا بھی واسطہ دکھائی نہیں دیتا۔اس کی وجہ بھی موجود ہے کہ ایسے لکھنے والوں نے اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کی روایات کو پڑھا ہی نہیں۔مغربی دنیا سے جو کچا پکا پڑھنے کو مل گیا، اسی پر انحصار کر کے، ہر کسی پر لٹھ لے کر چڑھ دوڑے۔سو ضرورت اس امر کی ہے کہ ترقی پسند نقادوں اور ادیبوں کی جانب سے ایسے غیر مہذب لکھنے والوں کی اصلاح کی طرف توجہ کی جائے۔انہیں سجاد ظہیر سے لے کر شہناز نبی تک ترقی پسند تنقید کی صحت مند روایت کا احساس دلایا جائے۔اگر وہ پھر بھی ''زباں بگڑی سو بگڑی تھی، خبر لیجیے دہن بگڑا'' کی تصویر بنے رہتے ہیں تو ممتاز ترقی پسندوں کو ایسے مارکسی نقاد کہلانے والوں سے اپنی بے زاری کا کھل کر اظہار کرنا چاہیے۔ورنہ یہ نوآموز درسی نوعیت کے نقاد ترقی پسند تحریک اور تنقید کے لیے ماضی کی غلطیوں کی طرح حال اور مستقبل کی مستقل غلطی بن کر رہ جائیں گے۔

آخر میں ادب میں مقصدیت کے موضوع پر ڈاکٹر وزیر آغا کی ایک تحریر کا اقتباس دے کر اپنا مضمون مکمل کرتا ہوں۔

''ادب کبھی بے مقصد نہیں ہوسکتا۔اگر اخلاقیات کا ایک اپنا مقصد ہے اور سیاسیات کا اپنا! اسی طرح اگر کاروبار، زراعت حتیٰ کہ ورزش اور کھیل تک کے اپنے اپنے مقاصد ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ادب کا بھی ایک اپنا مقصد نہ ہو۔مگر یہ مقصد زندگی کے باقی شعبوں کے مقاصد سے قطعاً جدا ہے اور جمالیاتی تسکین کے ذریعے تزکیۂ نفس پر منتج ہوتا ہے۔ادب اپنے خالق اور قاری دونوں کے جذباتی تشنج کو فرو کر کے انہیں ایک ارفع تر انسانی سطح پر لے آنے کی کوشش کرتا ہے اور اس سے بڑا مقصد اور کیا ہوسکتا ہے؟۔کیسی عجیب بات ہے کہ ادب کو اس کی اصل کارکردگی اور مقصد سے ہٹا کر بعض دوسرے مقاصد کے لیے آلۂ کار بنانے کی کوشش کی جائے۔ضمناً یہ بھی

عرض کر دوں کہ ادب کی تخلیق کا عمل ایک قطعاً آزاد عمل ہے۔اسے اگر کسی مینی فیسٹو کے تابع کر دیا جائے تو یہ فی الفور رُک جائے گا اور ادب کے بجائے اشتہارات چھپنے لگیں گے۔''

(ادب اور مقصدیت از ڈاکٹر وزیر آغا بحوالہ دائرے اور لکیریں)

یونیورسٹی جرنل ''**دستاویز**'' کلکتہ۔شمارہ دسمبر ۲۰۱۳ء۔ترقی پسند تنقید نمبر

جدید ادب کا میرا جی نمبر

(ظفر اقبال کے جواب میں)

روزنامہ دنیا لاہور کے ۱۷ اور ۱۸ ستمبر کے شماروں میں ظفر اقبال صاحب کے کالم ''دال دلیہ'' میں جدید ادب کے میرا جی نمبر پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس میں میرا جی کے خلاف حیران کن حد تک جارحانہ رویہ اختیار کیا گیا ہے۔ بہت ساری غیر متعلق اور دوسری باتیں بھی چھیڑ دی گئی ہیں۔ دوسرے معاملات پر دیگر متعلقہ ادیب حضرات ظفر اقبال صاحب کو مناسب جواب دے سکیں گے۔ اُن غیر متعلق باتوں میں الجھنے کی بجائے میں یہاں صرف اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ جدید ادب کے میرا جی نمبر میں پروفیسر ڈاکٹر مظفر حنفی کا ایک مضمون شامل ہے ''میرا جی: شخصیت کے ابعاد اور فن کی جہات''۔ جدید ادب کے میرا جی نمبر کے صفحہ ۹۳ پر درج اس مضمون کا ایک اہم اور ٹو دی پوائنٹ اقتباس توجہ طلب ہے، سو یہاں پیش ہے:

''میرا جی کے متفرق اشعار پڑھتے ہوئے مجھے بے ساختہ ظفر اقبال یاد آ گئے۔ تین چار آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

ملائیں چار میں گر دو تو بن جائیں گے چھ پل میں
نکل جائیں جو چھ سے دو تو باقی چار رہتے ہیں

کیا پوچھتے ہو ہم سے یہ ہے حالتِ جگر
پی اس قدر کہ کٹ ہی گیا آلتِ جگر

چہرے کا رنگ زرد، مئے ناب کا بھی زرد
یہ رنگ ہیں کہ رنگ ہے پیشاب کا بھی زرد

دن میں وظیفہ اس کا کئی بار کیجیے
اپنے جگر کے فعل کو بیدار کیجیے

یعنی زبان کی توڑ پھوڑ اور مضامین کی اکھاڑ پچھاڑ کا جو کام ظفر اقبال آج کر رہے ہیں، اُس کا آغاز میرا جی نے ۷۰۔۸۰ برس پہلے کر دیا تھا۔ دیکھیں وہ میرا جی کے اس فیضان کا اعتراف کب کرتے ہیں۔''

اس میں ایک ادبی بات ادبی سلیقے اور واضح ثبوت کے ساتھ بیان کی گئی تھی۔ میرا جی کے حوالے سے یہ انکشاف بھی میرے پیش نظر تھا جب میں نے اسی میرا جی نمبر کے صفحہ نمبر ۸ پر اپنے اداریہ میں یہ لکھا:

''میرا جی سے بہت سارے لکھنے والوں نے کسی نہ کسی رنگ میں اکتساب کیا، فیض اُٹھایا لیکن عمومی طور پر غالباً ان کی عوامی مقبولیت نہ ہونے کی وجہ سے، ان کے اعتراف میں بخل سے کام لیا۔ یہ کوئی الزام تراشی نہیں ہے، بس ادبی دنیا کے طور طریقوں کا ہلکا سا گلہ ہے۔۔ صرف یہ احساس دلانے کے لیے کہ اگر کچھ فیض اُٹھایا ہے تو میرا جی کا تھوڑا سا اعتراف کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ اگر کہیں سے کچھ سیکھنے کو مل جائے، کوئی رہنما نکتہ مل جائے، کوئی تحریک مل جائے اور اس ذریعہ کا فراخدلانہ اعتراف کر لیا جائے تو ایسا اعتراف نہ صرف قلبی خوشی اور ذہنی اطمینان کا موجب بنتا ہے بلکہ اس کے نتیجہ میں ادبی زندگی کے بابرکت ہو جانے کا احساس بھی ہوتا ہے۔''

مظفر حنفی صاحب کا انکشاف اور میری مذکورہ گزارش اصل بات تھی، جس کے سامنے آنے پر ظفر اقبال صاحب ایماندارانہ اعتراف کرنے کی بجائے اتنا طیش میں آ گئے کہ میرا جی کے ہر اس کام کو بھی رد کر دیا جس کا اعتراف فیض احمد فیض، ن۔م۔ راشد، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر

جمیل جالبی، سید وقار عظیم، اختر الایمان، ڈاکٹر عبادت بریلوی، جیلانی کامران، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر رشید امجد، انتظار حسین اور شمیم حنفی جیسی سینئر اور جید ادبی شخصیات نے برملا طور پر کیا ہوا ہے۔ یہاں انتظار حسین کے ایک تازہ کالم کا ایک اقتباس پیش کر کے بات ختم کرتا ہوں۔ اہلِ ادب تصویر کا دوسرا رُخ دیکھنے کے بعد خود فیصلہ کریں کہ ظفر اقبال صاحب کے متشددانہ ردِعمل کے پسِ پردہ موجود اصل حقیقت کیا ہے۔ انتظار حسین صاحب لکھتے ہیں:

''ویسے تو میرا جی بھی اتنے ہی توجہ کے مستحق ہیں جتنی توجہ کے مستحق فیض اور راشد سمجھے گئے تھے۔۔۔۔ترقی پسندوں نے جو میرا جی کی مذمت کر رکھی ہے کہ ذہنی طور پر بیمار شاعر ہے۔ ذات کی الجھنوں میں پھنسا رہتا ہے۔ مریضانہ داخلیت پسندی کا شکار ہے، اس پر مت جایئے۔ فیض صاحب کی ترقی پسندی اپنی جگہ مگر جدیدیت کے تصور نے تین شاعروں فیض، راشد، میرا جی کو ایک رسی میں باندھ رکھا ہے یا کہہ لیجیے کہ ایک رشتہ میں پرو رکھا ہے۔ اور وہ جو اردو میں جدید شاعری کی روایت قائم ہوئی اس میں ان تین کی حیثیت اس روایت کے بڑوں کی تھی اور اب بھی ہے۔۔۔۔جدیدیت کے تصور سے متاثر نئے ذہنوں نے زیادہ اثر میرا جی سے قبول کیا۔ یہ تینوں لاہور میں موجود تھے مگر نئی شاعری کے رسیا نوجوان میرا جی کے گرد اکٹھے ہوئے۔ میرا جی ان کے گرو بن گئے۔ مختار صدیقی، یوسف ظفر، قیوم نظر، مبارک احمد، ضیا جالندھری، گویا میرا جی کے زیر اثر ایک پورا مکتبہ شاعری وجود میں آ گیا۔ پھر آگے چل کر جو نو خیزوں کی ایک ٹولی نمودار ہوئی اور جو دعویٰ کرتی تھی کہ جدید شاعر تو اصل میں ہم ہیں۔ اس ٹولی نے بھی اپنا رشتہ میرا جی ہی سے جوڑا۔ حالانکہ ان میں ایسے نگ بھی تھے جو فکری اعتبار سے بائیں بازو سے ہم رشتہ نظر آتے تھے۔ اور میرا جی کا معاملہ یہ تھا کہ جتنے وہ جدیدیت کے حامی تھے اتنے ہی قدیم کے رسیا تھے۔ ان کے مجموعۂ مضمون ''مشرق و مغرب کے نغمے'' پر نظر ڈالیے۔ ایک طرف تو وہ مغرب کے ان شاعروں اور ان اہلِ فکر پر لمبے لمبے مضمون باندھ رہے ہیں جنہیں شاعری میں جدیدیت کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے۔ جیسے بادلیئر، میلارے، والٹ وٹ مین، ڈی ایچ لارنس۔ دوسری طرف بھگتی اور قدیم ہند کے شعراء کے ترجمے کرتے نظر آتے ہیں، جیسے ودیاپتی چنڈی داس، امارو، ساتھ

میں میرا بائی کے نام لیوا بنے ہوئے ہیں۔ گویا نئی اردو شاعری کی روایت وہ اس طرح قائم کرنا چاہتے ہیں کہ اس میں مشرق اور مغرب کے ڈانڈے ملتے نظر آئیں۔ اور قدیم اور جدید کا امتزاج دکھائی دے۔''

(مطبوعہ روزنامہ دنیا لاہور۔ شمارہ: ۲۱ ستمبر ۲۰۱۲ء)

ذکرِ میرا جی اور ظفر اقبال صاحب کا شکریہ

اکیس ستمبر ۲۰۱۲ء کے روزنامہ دنیا میں میری وضاحت کی اشاعت پر ظفر اقبال صاحب نے اپنے آج بائیس ستمبر کے کالم میں اپنے مزید خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ ان میں سے بعض باتیں وہی ہیں جو وہ جدید ادب کے میرا جی نمبر پر تبصرہ کرتے ہوئے غیر متعلق طور پر چھیڑ چکے تھے، اب ذرا ان کا دامن مزید شخصیات کے ذکر سے وسیع کر دیا ہے۔ میں نے پہلے بھی انہیں غیر متعلقہ سمجھ کر نظر انداز کیا تھا اور اب بھی میرے لیے ان باتوں میں الجھنا مناسب نہیں۔ ان کی یہ بات میں نے دلچسپی سے پڑھی کہ ان کی کتابوں کے دیباچے وغیرہ ان کے ناشرین نے اپنی مجبوری کے تحت لکھے یا لکھوائے۔ میں مان لیتا ہوں کہ انہوں نے کبھی کسی نقاد سے اپنے بارے میں کچھ لکھنے کے لیے نہیں کہا ہوگا۔ یہ ادب میں ولیوں والا، صوفیوں والا رویہ ہے۔ صوفیائے کرام وسیع المشرب ہوتے ہیں اور چھوٹی موٹی باتوں کو ہی نہیں بڑی بڑی باتوں کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ظفر اقبال صاحب بھی ادبی دنیا میں چھوٹی موٹی باتوں کو نظر انداز کر دیا کریں۔ میرا جی کے چار متفرق اشعار بھی ایسی ہی چھوٹی سی بات ہیں۔ (اگرچہ ان کا جادو حیران کن ہے) اس کے لیے میرا جی سے بھی درگزر سے کام لیں اور مظفر حنفی صاحب کے معاملہ میں بھی دل میلا نہیں کریں۔ جہاں تک میرا تعلق

ہے، سوائے اس کے کہ کسی کے ساتھ غیر ضروری طور پر کوئی شدید جنگ چھڑ جائے، میں ادبی اختلاف رائے کے باوجود اپنے سینئرز کا احترام کرتا ہوں۔ظفر اقبال صاحب میرے سینئر ہیں ،میں ان کا بھی احترام کرتا ہوں۔میرے ہاں جتنا میرا جی کا اثر ہے،اس سے ملتا جلتا ظفر اقبال صاحب کا اثر بھی ہے اور یہ اثر الگ الگ ہو کر بھی مجھے ایک سا لگنے لگا ہے۔اسی تناظر میں مجھے مظفر حنفی بھی اچھے لگتے ہیں۔سو ظفر اقبال صاحب کا شکریہ کہ انہوں نے اپنی صوفیانہ بے نیازی کے باوجود مجھے بھی اور میرا جی کو بھی کسی رنگ میں یاد رکھا۔اللہ انہیں اس کا اجر عطا فرمائے۔ آمین

(افسوس یہ بے ضرر سی وضاحت روزنامہ دنیا میں شائع ہونے سے رکوادی گئی)

مطبوعہ نایاب خان پور۔میرا جی نمبر۔مارچ ۲۰۱۳ء

شاہد ماہلی: دھند میں لپٹی ہوئی روشنی

شاہد ماہلی سے میرا شخصی سطح کا تعلق ۹۳۔۱۹۹۲ء میں قائم ہوا،لیکن ان سے ادبی تعلق، شخصی تعلق سے لگ بھگ دس سال پہلے قائم ہو چکا تھا۔۸۰ کی دہائی میں ''معیار'' دہلی کے نئے دستخط ادبی پروجیکٹ کے پاکستان بھر میں چرچے تھے۔بڑے شہروں کے شاعر اور ادیب اس انتخاب کے منتظر تھے۔جب انتخاب پاکستان پہنچا تو اس پر ادبی گفتگو کا سلسلہ چل نکلا۔ہم جیسے چھوٹے شہروں کے رہنے والے ادیب معیار کے اعلیٰ معیار کا ذکر پڑھ پڑھ کر ہی مرعوب ہوئے جا رہے تھے۔انہیں دنوں مجھے اسلام آباد جانے کا موقعہ ملا۔وہاں رشید امجد سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے یہ بتا کر ششدر کر دیا کہ معیار کے افسانہ نمبر میں اور نئے دستخط والی کتاب میں میرا افسانہ ''اندھی روشنی'' شائع ہوا ہے۔میرے حیران و ششدر رہونے کی واضح وجہ تھی۔''اندھی روشنی'' میرا سب سے پہلا افسانہ تھا۔اسے لکھنے کے بعد اپنے نام سے چھپوانے میں کچھ ہچکچاہٹ ہو رہی تھی۔بیگم کی اجازت لے کر اس افسانہ کو جدید ادب کے پہلے شمارہ اکتوبر ۱۹۷۸ء میں بیگم کے نام سے شائع کیا۔اس افسانہ کو بعض اہم ادیبوں نے پسند کیا تو خود پر کچھ اعتماد ہونے لگا۔چنانچہ پھر یہ افسانہ اپنے نام سے معیار دہلی کو بھیج دیا۔بھیجنے کو افسانہ بھیج دیا تھا لیکن امید نہیں تھی کہ افسانہ نہ صرف معیار میں چھپ جائے گا بلکہ اس کے بہت ہی خاص نمبر میں شامل ہو جائے گا۔لیکن جب یہ سب کچھ کسی سفارش، کسی حوالے کے بغیر از خود ہو گیا تو بس یہیں سے شاہد ماہلی کے ساتھ ایک غائبانہ نیاز مندانہ تعلق بن گیا۔

۹۳۔۱۹۹۲ء میں جب مجھے جرمنی آنے سے پہلے کچھ عرصہ دہلی میں گزارنا پڑا تو یہیں پر ڈاکٹر صادق اور دیویندر اسر کے ساتھ شاہد ماہلی سے ملنا جلنا ہوا۔سیدھے سادے بھلے مانس سے۔اپنی لفظیات سے لہجے تک دھیمے مزاج کے آدمی۔یہی دھیما پن ان کی شاعری میں بھی

موجود ہے۔ لکھنے کی رفتار سے لے کر شاعری کی آواز تک، ایک خاص دھیما پن۔ شاہد ماہلی کو دیکھیے تو لگتا ہے کوئی بہت ہی بھلا مانس، اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہے، پراسراریت کا ایک ہلکا سا ہالہ ان کی شخصیت کے ارد گرد بھی دکھائی دیتا ہے اور ان کے اندر سے پھوٹتا ہوا بھی محسوس ہوتا ہے۔ ایسی پراسراریت جو خود کسی جستجو سے عبارت ہو۔

مری طرح یہ مہ و مہر بھی ہیں آوارہ
کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے

جب تک شاہد ماہلی سے رابطہ بڑھتا، تب تک مجھے جرمنی آنا پڑ گیا، سو میں جرمنی پہنچ گیا۔ یہاں آ کر یہ تعلق نہ صرف قائم رہا بلکہ مزید مستحکم ہوتا گیا۔ ادارہ معیار دہلی نے میری چند کتابیں شائع کیں۔ ان میں سوئے حجاز، میری محبتیں، افسانے اور ایٹمی جنگ شامل تھیں۔ پھر میری گیارہ کتابوں کا مجموعہ ''عمر لا حاصل کا حاصل'' کا پہلا اور عوامی ایڈیشن بھی معیار پبلی کیشنز دہلی نے شائع کیا۔ ایک ایسا ادارہ جسے میں چند برس پہلے تک ایک خواب کی طرح دیکھتا تھا، اس کے ذریعے میری کتابوں کا چھپنا میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہ تھا۔ اس سارے عمل کے دوران کچھ مالیاتی امور تو درمیان میں آئے لیکن کہیں کوئی تاجرانہ رویہ نہیں تھا۔ مجھے جو کتابیں مطلوب تھیں دوستانہ طور پر واجبی قیمت پر مجھے فراہم کر دی گئیں۔

مارچ ۲۰۰۰ء میں شاہد ماہلی جرمنی بھی تشریف لائے۔ ان کی آمد سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم نے دو صد سالہ جشنِ غالب منا لیا، ایک شایانِ شان تو نہیں لیکن مناسب سی تقریب برپا کر لی۔ ۲۰۰۳ء میں جرمنی سے جدید ادب کا اجراء کیا تو ان کا تعاون شاملِ حال رہا۔ ان کی غزلیں، نظمیں جدید ادب کی زینت بنتی رہیں۔ اب ۲۰۱۲ء میں مجھے ہندوستان جانے کا موقعہ ملا، میرا سفر بنیادی طور پر کولکاتا کے لیے تھا۔ واپسی پر دو دن کے لیے دہلی میں قیام تھا۔ اس قیام کو شاہد ماہلی کی محبت نے اتنا آرام دہ اور پرشکوہ بنا دیا کہ اب بھی ان دو دنوں کی یاد کئی زمانوں کی طرح میرے اندر بسی ہوئی ہے۔ میرے ساتھ جو تقریب ہوئی اس کی قدر و قیمت اپنی جگہ، ان کے توسط سے جن احباب سے ملاقات ہوئی اور علمی و ادبی مکالمہ میں اختلاف رائے کے ساتھ فکری

کشادگی کا احساس ہوا، وہ بجائے خود ایک شاندار تجربہ ثابت ہوا۔

شاہد ماہلی کی شاعری پر بات کرتے ہوئے بیشتر ناقدین نے ان کی نظم کو ان کی غزل پر ترجیح دی ہے۔ بے شک ان کی نظموں کی اپنی ایک اہمیت ہے اور ''نئے مکان کے لیے نظمیں'' کے تحت انہوں نے جو بدلتی ہوئی دنیا کا منظر دیکھا اور دکھایا ہے وہ بہت ہی خاص اہمیت کا حامل ہے۔ تاہم میرا خیال ہے کہ ان کی غزل اتنی اہم ہے کہ ابھی اس کی طرف مزید توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ان کی غزلیہ شاعری سے سرسری گزر جانا اس غزل کے ساتھ زیادتی ہو جائے گی۔ میں نے کوشش کی ہے کہ جن اشعار کو عمومی طور ناقدین اور مضمون نگار حضرات نے اپنے مضامین میں پیش کیا ہے، انہیں دہرانے سے احتراز کروں۔ تاہم اکا دکا اشعار شاید دہرائے بھی جائیں۔ ان کی غزلوں کے اشعار کا یہ انتہائی مختصر سا انتخاب ان کی غزل کے تعارف کی ایک جھلکی ہے۔ ان اشعار میں بعض سے میری ان باتوں کی توثیق بھی ہوتی ہے جن کا ذکر میں بعض حوالوں سے شروع میں کر چکا ہوں۔

حاشیے پر کچھ حقیقت کچھ فسانہ خواب کا
اک ادھورا سا ہے خاکہ زندگی کے باب کا
رنگ سب دھندلا گئے ہیں، سب لکیریں مٹ گئیں
عکس ہے بے پیرہن اس پیکر نایاب کا

وہ روشنی تھی، سائے بھی تحلیل ہو گئے
آئینہ گھر میں اپنی بھی صورت نہیں ملی

غم کی تہذیب، اذیّت کا قرینہ سیکھیں
آؤ اس شہر میں جینا ہے تو جینا سیکھیں
بام و در ٹوٹ گئے، بہہ گیا پانی کتنا

اور برباد کرے گی یہ جوانی کتنا
رنگ کُمھلا دیا، بالوں میں پرودی چاندی
طول کھینچے گی ابھی اور کہانی کتنا

کس قدر بے کیف تھی، بے رس تھی اپنی داستاں
سب حقیقت ہی حقیقت تھی فسانہ کچھ نہ تھا
ایک لمحہ تھا جو ذہن ودل پہ آخر چھا گیا
گردشِ شام وسحر، وقت و زمانہ کچھ نہ تھا

سانسوں میں، رگ وپے میں سمایا ہے کوئی اور
ہے زیست کسی اور کی جیتا ہے کوئی اور
آنکھوں نے بسائی ہے کوئی اور ہی صورت
اس دل کے نہاں خانے میں ٹھہرا ہے کوئی اور

کسی ثواب کی مانند سب کی خواہش تھی
کسی گنہ کی طرح ہر کسی سے ڈرتا رہا

کسی نگاہ میں اِس دل کا احترام تو ہو
یہ سونی سونی سی مسجد ہے اِک امام تو ہو

ناکامیوں کی صبح نہ مایوسیوں کی شام
جلتا ہے مدّتوں سے مرے دل کا دیت نام

نہیں ہے کچھ بھی خلاؤں کی وسعتوں کے سوا
زمیں سے تا بہ فلک اِک سراب ہے یارو
عجیب موڑ پہ آ کر ٹھہر گئی ہے حیات
کوئی خیال نہ خواہش نہ خواب ہے یارو

محدود ہوئی جاتی ہے خوابوں کی زمیں اب
سنتے ہیں ستاروں سے بھی آگے ہے جہاں اور

بزمِ اغیار میں شاہدؔ کے اڑے تھے پُرزے
کوئی چرچا نہ ہوا کوئی تماشا نہ ہوا

ان اشعار پر بات کرنا چاہوں تو ان کے مضامین سے لے کر انداز بیان تک ان کے ہاں کھلنے والے امکانات پر بہت سی باتیں کر سکتا ہوں لیکن یہاں میں صرف ان اشعار کو پیش کر کے شاہد ماہلی کی غزل کے ہلکے سے تعارف پر ہی اکتفا کروں گا۔ ان کے سامنے میں آج بھی وہی ۱۹۸۰ء کے زمانے کا چھوٹے سے شہر کا شاعر ہوں، جسے انہوں نے کسی تعارف کے بغیر تخلیقی سطح پر عزت دی، ادبی طور پر سندِ قبولیت عطا کی۔ ہندوستان میں ''معیار'' جیسے معیاری ادبی جریدہ کے ذریعے مجھے اولین شناخت دی۔ ذاتی تعلق قائم ہونے کے بعد مجھے اپنے قریب آنے کا موقعہ دیا اور اپنی شخصیت کے پراسرار ہالے کو کسی حد تک قریب سے دیکھنے کا موقعہ دیا۔ اپنی داخلی جستجو کو سمجھنے کی ایسی صورت دکھائی کہ ان کی پراسراریت کا ماجرا تو مجھ پر نہ کھل سکا لیکن مجھے خود حیات وکائنات اور ذات والٰہیات تک اسرار در اسرار کی اپنی جستجو کے سفر میں ان کی پراسراریت سے بھی کچھ نہ کچھ روشنی ملی ہے۔ دھند میں لپٹی ہوئی روشنی۔

مطبوعہ کتاب ''**شاھد ماھلی عکس و جھتیں**'' مرتب: **ڈاکٹر رضا حیدر**۔ دہلی

دیویندر اِسر کی آخری ہجرت

دیویندر اسر کے ساتھ میرا براہِ راست رابطہ دہلی میں قیام کے دوران ہوا۔ شاہد ماہلی کے توسط سے ڈاکٹر صادق اور دیویندر اسر سے ملاقات ہوئی تھی۔ تعارف ہو جانے کے بعد ستمبر ۱۹۹۲ء سے دسمبر ۱۹۹۳ء تک دہلی میں قیام کے دوران میری سب سے زیادہ ملاقاتیں دیویندر اسر کے ساتھ رہیں۔ ان کا گھر میری رہائش گاہ سے اتنے فاصلے پر تھا کہ بندہ آرام سے سیر کرتے ہوئے اور ٹہلتے ہوئے ان کے گھر تک پہنچ جاتا تھا۔ سو یہ جغرافیائی قرب ہمارے لیے ذہنی قربت کا باعث بننے لگا۔ ان کے مقابلہ میں شاہد ماہلی اور ڈاکٹر صادق سے کہیں ہفتہ عشرہ کے بعد ہی ملاقات ممکن ہوتی تھی۔ دیویندر اسر کے توسط سے نند کشور وکرم صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان دونوں دوستوں کی گہری دوستی کو ایک لحاظ سے مثالی دوستی قرار دیا جا سکتا ہے۔ دونوں کی اپنی اپنی ادبی ترجیحات تھیں، جو کہیں ایک دوسرے سے قریب تھیں تو کہیں ایک دوسرے کو کاٹتی تھیں۔ اس کے باوجود دونوں میں اتنی ہم آہنگی تھی کہ دونوں ایک دوسرے کے موقف کا احترام کرتے تھے۔ نند کشور وکرم نے تو ایک بار عالمی اردو ادب کا دیویندر اسر نمبر بھی شائع کیا ہے۔

ادبی تحریکات کے حوالے سے دیکھا جائے تو ترقی پسند تحریک سے متاثر ہونے، اس کا سرگرم ادیب رہنے، نظریاتی کارکن کی حیثیت سے قید و بند کی قربانیاں دینے تک اور خفیہ والوں کی زد میں آئے رہنے تک ان کی خدمات کا ایک سلسلہ دکھائی دیتا ہے۔ یہ سب کچھ عمر کے اس حصہ میں رونما ہوا جب وہ نوجوان تھے۔ جوانی کی پختگی تک انہوں نے نئے رجحانات کا مطالعہ بھی شروع کر دیا تھا۔ کسی مغربی دانشور نے کچھ اس قسم کی بات کہی تھی کہ جو شخص نوجوانی میں سوشلسٹ خیالات سے متاثر ہو کر کمزور طبقوں کے لیے ہمدردی محسوس نہیں کرتا، یہ سمجھیں کہ اس کے اندر دل نہیں

ہے۔ اور جو شخص جوانی کے بعد اپنے سوشلسٹ افکار پر نظر ثانی نہیں کرتا، اس کا دماغ نہیں ہے۔ صاحبِ دل نوجوان دیویندر اسر جب عمر کی پختگی کو پہنچے تو جدید ادبی نظریات کے مطالعہ نے انہیں صاحبِ دماغ بھی بنا دیا۔ دیویندر اسر کثیر المطالعہ ادیب تھے۔ وہ ترقی پسند تحریک کے مثبت اثرات کا کبھی بھی انکار نہیں کرتے تھے لیکن وہ اشتراکی مبلغ بھی نہیں رہنا چاہتے تھے۔ اس سلسلہ میں نند کشور وکرم نے اپنے ایک مضمون میں ان کے ایک انٹرویو کا بہت عمدہ حوالہ درج کیا ہے:

''انہوں نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ وہ اشتراکیت سے نہیں بلکہ سیاست سے ہی بیزار ہو گئے ہیں۔ اور وہ ہر قسم کے بند نظریات اور اقتدار کی سیاست کی مخالفت کرتے ہیں کیونکہ یہ فرد کو مانی پولیٹ اور مینیج کرتے ہیں۔ اور وہ انسان کی مینی پولیشن خواہ وہ سیاسی ہو یا معاشی، مذہبی ہو یا ذات برادری کی، اُس کی تائید نہیں کر سکتے۔''

(مضمون ''دیویندر اسر کچھ یادیں'' از نند کشور وکرم)

دیویندر اسر نے ادب کے جدید سے مابعد جدید رجحانات تک گہرا مطالعہ کر رکھا تھا۔ تاہم انہوں نے اپنے لیے کوئی سیدھی لکیر نہیں کھینچی۔ جہاں بہت زیادہ مطالعہ نے انہیں ذہنی کشادگی عطا کی وہیں ان کے بعض مضامین میں ایسا بھی ہوا کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے، وہ واضح طور پر بیان نہیں ہو پایا۔ کثرتِ مطالعہ سے کبھی کبھار ایسا ہو جاتا ہے کہ ہم اپنے ذہن میں ایک واضح نکتہ مدِ نظر رکھے ہوتے ہیں لیکن لکھتے وقت عام قارئین کے لیے اس کی وضاحت پوری طرح سے نہیں ہو پاتی۔ ایسے مقامات پر پھر قاری کو اپنی ذہانت یا اپنے مطالعہ سے کام لے کر نفسِ مضمون کو سمجھنا پڑتا ہے۔ دیویندر اسر کے بعض مضامین کے مطالعہ کے دوران ایسے مقامات سے واسطہ پڑتا ہے۔

تخلیق کار کے طور پر دیویندر اسر کے ہاں ترقی پسند تحریک سے جدیدیت تک کے بیشتر اثرات یکجا ہو جاتے ہیں۔ خصوصاً ان کے افسانوں کے مجموعہ ''پرندے اب کیوں نہیں اُڑتے'' اور ان کے ناولٹ ''خوشبو بن کے لوٹیں گے'' میں ترقی پسندی اور جدیدیت کا امتزاج واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ''خوشبو بن کے لوٹیں گے'' کو میں ان کی سب سے شاندار تخلیق سمجھتا ہوں۔ اس ناولٹ میں ان کی زندگی کی داستان کا دریا گویا کوزے میں سمٹ آیا ہے۔

ضلع کیمبل پور میں پیدا ہونے والے اور وہاں سے راولپنڈی تک کے علاقہ میں پروان چڑھنے والے دیویندر اسر ساری زندگی ہجرت کے کرب سہتے رہے۔ تقسیم برصغیر کے نتیجہ میں ہندو پاک کے دونوں طرف دو طرح کے طبقے سامنے آئے۔ ایک طبقہ تو وہ تھا جس نے کلیموں کی گیم کو بھرپور طریقے سے کھیلا۔ اس طبقہ کے سبھی لوگوں نے کسی نہ کسی رنگ میں ''دادا جی کے پودینے کے باغوں'' کے حوالے دیئے جہاں وہ جھولا ڈال کر جھولا کرتے تھے، اور اس فراڈ کے بل پر ماضی کے فقیر فُقرے بھی لکھ پتی بن کر نئے ملک سے فیض یاب ہوئے۔ جبکہ دوسرا طبقہ دیویندر اسر جیسے لوگوں کا تھا جو زندگی کو کسی مثالی دنیا میں بسر کرنا چاہتے تھے۔ اپنی ذہانت کو عام آدمی کے فائدہ کے لیے کام میں لانا چاہتے تھے۔ لیکن اپنے ماضی کی یادوں کی قیمت کے طور پر وہ مشکوک ٹھہرا دیئے گئے۔ جب ایک دنیا جھوٹ پر جھوٹ بول کر نت نئے کلیم داخل کر کے اپنی جائدادوں میں اضافہ کر رہی تھی، دیویندر اسر جیسے لوگوں پر کیا بیت رہی تھی، دیویندر اسر کی کہانی ان کے ناولٹ ''خوشبو بن کے لوٹیں گے'' کے ان اقتباسات میں دیکھیں:

''تم جہاں پیدا ہوئے ہو، اس دھرتی سے، اس نگر سے، اس گاؤں سے، اس جنگل سے ہجرت کر سکتے ہو لیکن اپنے اندر سے اس دھرتی کو، اس نگر کو، اس گاؤں کو، اس جنگل کو باہر نہیں کر سکتے ___ لیکن میری تہذیب، میرا سماج، میری حکومت، میرا مذہب، میری تعلیم، میری معیشت، روزگار، رشتہ دار، بیوی، بچے مجھے ایک گھیرے میں بند کر کے اس بھوت کو نکالنے کے لیے مجھے ہر روز اذیت دیتے رہتے ہیں لیکن یہ بھوت یا پرچھائیں میرے اندر سے نہیں نکلتی۔''

''تمہیں داخلہ نہیں مل سکتا ___ کیا ثبوت ہے کہ تم وہی ہو جو تم بتا رہے ہو کہ تم نے بی اے پاس کیا ہے۔ کیا ثبوت ہے۔ کوئی کاغذ، کوئی پرچہ، کوئی گواہ، کچھ بھی نہیں تو تمہارے پاس ___ ہاں کچھ بھی تو نہیں تھا میرے پاس ___ نہ کاغذ، نہ پرچہ، نہ کوئی ثبوت، نہ کوئی گواہ، نہ نام، نہ گھر، نہ دیش ___ میرا گھر، میرا نام، میرا چہرہ سب کچھ ریکھا کے اس پار رہ گیا تھا جو کاغذ پر کھینچی، زمین پر اتری اور دلوں کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ تقسیم کا فیصلہ ان لوگوں نے کیا تھا، پنجاب جن کا وطن نہیں تھا۔ ان کا نام تھا، گھر تھا، دیش تھا، پہچان تھی۔ پہچان کیوں نہ ہوتی۔ انہوں نے وائس ریگل

لاج میں لارڈ اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ لنچ کیا تھا۔ ان کے ساتھ تصویر کھنچوائی تھی۔ ان کے پاس اخباروں کے پلندے تھے، شناخت کے سب اوزار تھے اور میرے پاس کاغذ کا ایک پرزہ بھی نہ تھا۔ پہچان کیسے ہوتی؟''

حسن ابدال، کیمبل پور، راولپنڈی، کان پور، دہلی تک کے اسفار دیویندر اسر کی پے در پے ہجرتوں کی داستان ہیں۔ دہلی میں آ کر وہ ٹک گئے تھے۔ لیکن یہاں پھر انہیں داخلی ہجرت کے کرب سے گزرنا پڑ گیا۔ پاکستان میں بچپن میں ماں کی جدائی سہہ لی تھی، دہلی میں بیوی کے مستقل ہجر کا صدمہ درپیش ہوا۔ میاں بیوی میں علیحدگی ہوگئی، یہ مستقل ہجر ایک اور داخلی ہجرت تھی۔ اولاد بھی کسی کام نہ آئی۔ گویا اندر ہی اندر ہجرت در ہجرت کرب کی لہریں اٹھتی رہتی تھیں۔

مابعد جدیدیت کے نام پر بہت سے لوگوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ میں پاکستان سے ہی اس نئے ڈسپلن کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ اس کوشش میں ماہنامہ ''صریر'' کے ایڈیٹر کو ناراض کر بیٹھا۔ ایسے لوگوں کی کچی پکی کتابیں بھی پڑھیں جنہیں خود معلوم نہ تھا کہ مابعد جدیدیت کیا ہے۔ ان کا ابھی تک وہی حال ہے۔ پھر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمٰن فاروقی کی تحریروں سے بھی اس ڈسپلن کو سمجھنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر نارنگ کا بیان اتنا مشکل اور ''عالمانہ'' تھا کہ بہت زور لگا کر بھی کچھ خاص پلے نہ پڑا، اور جو پلے پڑا وہ دل کو نہیں لگا۔ فاروقی صاحب کے ہاں شروع میں مابعد جدیدیت کی تفہیم سے زیادہ جدیدیت کا دفاع دکھائی دیتا تھا، سراسیمگی کی ایک کیفیت جھلکتی تھی۔ ڈاکٹر وزیر آغا سے زبانی گفتگو کے ذریعے اس ڈسپلن کو تھوڑا بہت سمجھنے کی کوشش کی۔ وزیر آغا کا یہ موقف دل کو لگا کہ مصنف کی موت مناسب نہیں ہے اور مصنف، تصنیف اور قاری تینوں کے ذریعے ہی ادب کی تفہیم ہونا بہتر ہے، لیکن پھر بھی بات نہیں بنی۔ یہ سب ۱۹۹۲ء کے درمیان تک کے زمانے کی باتیں ہیں۔ اسی سال کے آخر تک میں دیویندر اسر سے ملاقاتیں کر رہا تھا اور دوسری بے شمار ادبی و غیر ادبی گفتگو کے ساتھ اس ڈسپلن کو بھی آسان پیرائے میں سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں خوشی ہو رہی ہے کہ مابعد جدیدیت کو میں ڈھنگ اور بے ڈھنگے پن سے جتنا سمجھ پایا ہوں، وہ دیویندر اسر سے گفتگو کے ذریعے سمجھ پایا ہوں۔ میں نے تب جو کچھ سمجھا

تھا، آج تک اسی تفہیم پر قائم ہوں لیکن بعد میں ان کے ایک دو مضامین کے ذریعے اندازہ ہوا کہ دیویندر اسر اپنے پہلے موقف سے رجوع کر گئے ہیں۔ میں ہوا کا فرتو وہ کافر مسلماں ہو گیا

میرے ساتھ دیویندر اسر کی گپ شپ بے تکلفی کی حد تک آ گئی تھی۔ میرے کسی شوخ جملہ کا وہ مزہ لیتے اور اس پر مسکراتے ہوئے رائے بھی دیتے لیکن ان کی مسکراہٹ مجھے عموماً کرب آمیز محسوس ہوا کرتی تھی۔ وہ کئی بار مسکرائے لیکن میں نے انہیں کھل کر ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔

دیویندر اسر نے مجھے میرے افسانوں کے ہندی ترجمہ کا خواب دکھایا اور پھر اس کی تعبیر بھی خود ہی مہیا کر دی۔ نند کشور وکرم کے توسط سے ہندی کے ایک پبلشر سے ملوایا۔ پھر افسانوں کے ہندی ترجمہ کا انتظام بھی کرایا۔ اردو کے ایک ناول نگار کی اہلیہ محترمہ نے یہ کام کیا تھا۔ میرے جرمنی پہنچنے کے بعد افسانوں کا ہندی ایڈیشن شائع ہوا۔ میرے افسانوں پر دیویندر اسر نے ایک شاندار مضمون لکھا جو اس کتاب میں پیش لفظ کے طور پر شامل رہا۔ یہ سب کچھ دیویندر اسر کی محبت کا نتیجہ تھا۔ ویسے بعد میں جب ہندی جاننے والے احباب نے اس مجموعہ کے بعض افسانے پڑھ کر سنائے تو احساس ہوا کہ ترجمہ نگار نے بہت کچھ چھوڑ دیا ہے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اردو سے ہندی اور ہندی سے اردو میں ترجمہ کرنے کی بجائے صرف اسکرپٹ تبدیل کرنا چاہیے۔ اگر کہیں فارسی یا سنسکرت کے گاڑھے الفاظ آ رہے ہوں تو حاشیہ میں ان کا مفہوم واضح کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال میرے لیے یہی اعزاز کیا کم ہے کہ دیویندر اسر کی محبت اور توجہ کے نتیجہ میں میرے افسانوں کا ہندی ترجمہ شائع ہو سکا۔

مارچ ۲۰۱۲ء کی آخری تاریخوں میں دہلی میں اپنے دو روزہ قیام کے دوران مجھے جوگندر پال جی اور دیویندر اسر سے بھی ملنا تھا۔ جوگندر پال جی سے تو خود جا کر مل آیا تھا لیکن دیوندر اسر سے ملنا ممکن نہ ہو سکا۔ ڈاکٹر صادق نے ان کی بیماری کی نوعیت سے آگاہ کیا اور مشورہ دیا کہ ملاقات کرنے کی بجائے ان کے لیے دعا کریں۔ میں ایک احساسِ ندامت کے باوجود وہاں جانے سے رک گیا۔ ڈاکٹر صادق بتا رہے تھے کہ ان کے بیٹے ان کی دیکھ ریکھ کے لیے آتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر صادق بھی رابطہ میں رہتے ہیں۔ لیکن دیویندر اسر کی اپنی پوزیشن یہ ہے کہ خود سے فون بھی نہیں اُٹھا

سکتے۔ جوگندر پال جی کے ساتھ مل کر اداس ہوا تو دیویندر اسر سے نہ مل کر دکھی ہوا۔ لیکن یہ خبر جان کر اپنا دکھ کئی گنا بڑھ گیا کہ دیویندر اسر کی وفات کے پندرہ دن کے بعد دنیا والوں کو ان کی وفات کا علم ہو سکا۔ جوگندر پال جی نے سچ لکھا ہے کہ اتنی زیادہ وسیع و عریض ہو کر بھی سالی دلّی کا دل نہیں ہے۔ پندرہ دن تک نہ ان کے کسی بیٹے نے کسی رنگ میں رابطہ کیا نہ کسی دوست نے پتہ کیا کہ کس حال میں ہیں؟

ہجرت در ہجرت کا کرب سہتے سہتے زندگی گزارنے والے دیویندر اسر اپنی زندگی کی آخری ہجرت کسی کو بتائے بغیر اتنی خاموشی سے کر جائیں گے؟ کس نے ایسا سوچا تھا۔

مجھے یہاں پھر ان کے ناولٹ ''خوشبو بن کے لوٹیں گے'' کا اقتباس یاد آ رہا ہے۔

''کتنا سمے بیت گیا، میں نہ اپنی ماں سے الگ ہو سکا اور نہ ہی اپنے اندر کے بچے کو پیچھے چھوڑ سکا۔ اپنی ماں کی نابھی ڈور سے بندھا اور اپنے اندر کے بچے کو گود میں اٹھائے کوئی کتنا لمبا سفر طے کر سکتا ہے۔''

مجھے لگتا ہے کہ موت کی صورت میں اپنی زندگی کی آخری ہجرت کرنے کے بعد دیویندر اسر اب اپنی ماں کے قدموں کے سورگ میں بیٹھے، زندگی بھر کی تھکن اتار رہے ہوں گے۔

''ادب نامہ'' روزنامہ صبح ایبٹ آباد۔ ۱۳ دسمبر ۲۰۱۲ء

http://www.urduhamasr.dk/dannews/index.php?mod=article&cat=Literature&article=928

سہ ماہی **غنیمت** گجرات/کراچی۔ شمارہ: جولائی تا ستمبر ۲۰۱۴ء

ماہیے کا سفر

اردو ماہیا کی بحث وزن اور مزاج سے ہوتے ہوئے اردو میں اس کی اہمیت کے مسئلہ پر غور وفکر کے ساتھ اب جیسے رُک سی گئی ہے۔ ماہیا نگار حضرات اپنی اپنی صلاحیت اور دلچسپی کے مطابق ماہیے کہہ رہے ہیں تاہم اس کے مباحث میں اب پہلی گرم جوشی نہیں رہی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ علمی وادبی سطح پر جو دلائل ہماری طرف سے پیش کیے جاتے رہے، ان پر کج بحثی کرنے والوں کو بھی جلد ہی اپنی علمی کمزوری کا ادراک ہو گیا۔ ایک راگ الاپتے چلے جانے میں اور دلیل کے ساتھ بات کرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ ہمارے مخالفین میں سے سنجیدہ اہلِ ادب نے اس بات کو ایک حد تک خوش دلی سے مان لیا اور باقی نے خاموشی میں عافیت سمجھی۔ اس کے باوجود میرا خیال ہے کہ ایک وقفہ کے بعد ہمارے مخالفین کی جانب سے ایک بار پھر ''شورِ قیامت'' برپا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ تاہم عارف فرہاد کی کتاب ''اردو ماہیے کے خدوخال'' اور ماہیا کے جملہ موضوعات کا احاطہ کرنے والی (میری پانچ کتابوں کی کتاب) ''اردو ماہیا تحقیق وتنقید'' میں اتنا علمی مواد موجود ہے کہ بعد میں اُٹھائے گئے بیشتر اعتراضات کے جواب انہیں میں سے نکال کر دیئے جاتے رہیں گے۔ اس علمی کام میں ایک اور گراں قدر اضافہ ہو گیا ہے۔ اگرچہ ابھی یہ کام کتابی صورت میں سامنے نہیں آیا، تاہم ناگ پور یونیورسٹی سے ڈاکٹر صبیحہ خورشید ''اردو میں ماہیا نگاری'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کر چکی ہیں۔ یہ مقالہ میرے پاس موجود ہے۔ مارچ ۲۰۱۲ء میں جب مجھے کلکتہ کے فیض اور ٹیگور سیمینارز میں جانے کا موقعہ ملا، تب ڈاکٹر صبیحہ خورشید لگ بھگ چوبیس گھنٹے کا ٹرین کا سفر کر کے مجھے ملنے کے لیے کلکتہ آئی تھیں، تب ہی انہوں نے اپنے مقالہ کی یونیورسٹی کی مخصوص جلد مجھے عنایت کی تھی۔

نو ابواب اور بعض ابواب کے کئی ذیلی ابواب پر مشتمل اس مقالہ کے صرف نو ابواب کے عنوان یہاں درج کر رہا ہوں۔

۱۔ اصنافِ شاعری ۲۔ ماہیا اور فنِ ماہیا نگاری (پانچ ذیلی ابواب کے ساتھ)
۳۔ ماہیے کی اقسام ۴۔ اردو میں ماہیا نگاری (دو ذیلی ابواب کے ساتھ)
۵۔ بین الاقوامی سطح پر ماہیا نگاری (دو ذیلی ابواب کے ساتھ)
۶۔ ہندوستان میں ماہیا نگاری ۷۔ مہاراشٹر میں ماہیا نگاری اور انتخاب کلام
۸۔ اردو کی خواتین ماہیا نگار ۹۔ خلاصۂ مقالہ

فل اسکیپ سائز کے ۳۷۴ صفحات پر محیط اس مقالہ کے بعد آخر میں ۱۳ صفحات پر مشتمل کتابیات شامل کی گئی ہے۔ پروفیسر ارشد جمال کی نگرانی میں صبیحہ خورشید نے اس مقالہ کو مقررہ میعاد کے اندر عمدگی سے مکمل کر لیا۔ یہ مقالہ کئی لحاظ سے خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی پہلی اہمیت یہ ہے کہ ایسے وقت میں جب کہ پنجاب سے تعلق رکھنے والے بعض ادباء ماہیے کے بارے میں جان بوجھ کر کنفیوژن پیدا کرنے میں مصروف تھے، اہلِ پنجاب کے حصے کا علمی وتحقیقی کام مہاراشٹر کے شہر ناگ پور کی یونیورسٹی میں کیا گیا اور ماہیے کی تفہیم کا یہ کام ایک لڑکی کو کرنے کا موقعہ ملا۔

اس مقالہ کی ایک اور اہمیت یہ ہے کہ اس میں نہ صرف ماہیے کی بحث میں اٹھائے گئے سارے مباحث کو سامنے لایا گیا ہے، ان کے بارے میں فریقین کے موقف کو ساتھ ساتھ پیش کرتے ہوئے علمی بنیاد پر درست موقف کی نشان دہی کی گئی ہے۔ ڈاکٹر صبیحہ خورشید نے اردو ماہیا کے پاکستان اور مغربی دنیا میں مقیم شعراء کے ذکر کے ساتھ ہندوستان کے ماہیا نگاروں کا خصوصی ذکر کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ہندوستان کے بعض صوبوں کا جزوی طور پر تو بعض صوبوں کا خصوصی طور پر مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ ان صوبوں (ریاستوں) میں مہاراشٹر، بہار، مغربی بنگال، اتر پردیش، پنجاب، مدھیہ پردیش، راجستھان، کرناٹک، آندھرا پردیش کے ماہیا نگاروں کا خاص تذکرہ کیا ہے۔ ہندوستان بھر کے ماہیا نگاروں کا اتنا تفصیلی مطالعہ انہوں نے تقریباً سب سے براہِ راست رابطہ کر کے مکمل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ کلکتہ آئیں تو کلکتہ کے ماہیا نگار شعراء ان سے بخوبی واقف تھے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ ڈاکٹر صبیحہ خورشید نے مقالہ کی تکمیل کے دوران ممکنہ حد تک ہر اہم ماہیا نگار سے رابطہ کیا اور ان کی تخلیقات کو اپنا موضوع بنایا۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر صبیحہ

خورشید کے اس مقالہ کو میں بالواسطہ طور پر خود پر کیے گئے تحقیقی کام میں شمار کرتا ہوں۔

ڈاکٹر صبیحہ خورشید کا مقالہ ۲۰۰۹ء میں منظور کرلیا گیا تھا۔اس کے سال بھر کے بعد میری کتاب ''اردو ماہیا تحقیق وتنقید'' ستمبر ۲۰۱۰ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب میری تین پہلے مطبوعہ کتب اور دو غیر مطبوعہ کتب، گویا پانچ کتابوں پر مشتمل ہے۔ان کتابوں کے نام یہاں درج کررہا ہوں۔

۱۔اردو میں ماہیا نگاری (۱۹۹۷ء) ۲۔اردو ماہیے کی تحریک (۱۹۹۹ء)

۳۔اردو ماہیے کے بانی: ہمت رائے شرما (۱۹۹۹ء)

۴۔اردو ماہیا (ماہیے کے مختلف مجموعوں کے لیے لکھے گئے پیش لفظ)

۵۔ماہیے کے مباحث (یہ مضامین مختلف ادبی رسائل میں چھپ چکے تھے، انہیں یکجا کیا گیا)

اس سارے تحقیقی وتنقیدی کام کے بعد اب ماہیے کی کسی بھی بحث میں کسی بھی نکتۂ اعتراض پر کوئی نئی بات سامنے نہیں آتی اور عام طور پر پہلے سے لکھے ہوئے جواب کو پورے حوالے کے ساتھ دہرا دینے سے ہی کام چل جاتا ہے۔اسے میں ماہیے کے درست وزن والے موقف کی علمی وادبی کامیابی سمجھتا ہوں۔

گزشتہ دس بارہ برسوں میں تخلیقی طور پر اگرچہ پہلے جیسی گہما گہمی تو دکھائی نہیں دی لیکن مختلف ادبی رسائل میں اردو ماہیے شائع ہوتے رہے۔اردو ماہیا نگار کسی بحث مباحثہ کے بغیر اپنی اپنی لگن کے ساتھ ماہیے لکھتے رہے۔ ماہیے کے چند نئے مجموعے بھی منظرِ عام پر آئے۔میں نے ایک عرصہ سے ماہیے کا سالانہ جائزہ لکھنا چھوڑ دیا ہے۔تب سے اب تک بہت سارے نئے مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ان میں سے چند قابلِ ذکر مجموعوں کے نام یہاں درج کررہا ہوں۔

اٹلی سے جیم فے غوری کے ماہیوں کا مجموعہ ''خواب کی کشتی پر''، انڈیا سے علیم الدین علیم کا مجموعہ ''پھول ہتھیلی پر''، پاکستان سے شاکر کنڈان کا مجموعہ ''جلتے صحراؤں میں''، سجاد بخاری کا مجموعہ ''ردائے شبنم''، افضل چوہان کا ''خاموش نہ ہو ماہیا''، انڈیا سے مختار ٹونکی کا ''صدرنگ ماہیے''، انڈیا ہی سے فراز حامدی کی مرتب کردہ کتاب ''راجستھان میں اردو ماہیے کا تخلیقی سفر'' اور پاکستان سے امین خیال کا ''پانی کی کہانی''۔

یہ چند اہم مجموعوں کے نام ہیں۔ان میں ''پانی کی کہانی'' بہت ہی خاص تحفہ ہے۔افضل چوہان اور جیم فے غوری کے ماہیوں کے مجموعوں پر میں تفصیلاً لکھ چکا ہوں جو ان کے مجموعوں میں شامل ہونے کے ساتھ میری کتاب ''اردو ماہیا تحقیق وتنقید'' میں بھی شامل ہے۔اور امین خیال کے مجموعہ ''پانی کی کہانی'' پر بھی اپنی تفصیلی رائے لکھ چکا ہوں جو اس مجموعہ میں بھی شامل ہے اور ''اردو ماہیا تحقیق وتنقید'' میں بھی شامل ہے۔اس صورت میں ''پانی کی کہانی'' بہت ہی خاص تحفہ کیسے ہو گیا؟ اس کی وضاحت ذرا آگے چل کر کرتا ہوں پہلے یہاں اپنے تحریر کردہ ''پانی کی کہانی'' کے پیش لفظ کا کچھ ابتدائی حصہ درج کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

'' پہلا مجموعہ ''یادوں کے سفینے'' تھا ایسے لگتا ہے کہ ان سفینوں پر ایک عرصہ تک سفر کرنے کے بعد انہوں نے اپنے اندر اور باہر کے پانی کو دیکھا۔ پانی کی کہانی کو سنا اور پھر اس کہانی کو اپنے سفر کے حاصل کے طور پر بیان کردیا۔گویا پانی کی کہانی، یادوں کے سفینوں پر کیے گئے اسفار کا حاصل ہے۔تو کتاب کا نام ہی ایک پیش رفت کا احساس دلاتا ہے۔

پانی کی کہانی میں ایک دو جگہ ایسا لگتا ہے کہ وہ کسی ٹیچر کی طرح سمجھانے لگے ہیں۔لیکن پھر اندازہ ہوتا ہے کہ اپنی بات کی بنیاد استوار کرنے کے لیے ایسے ماہیے کہے ہیں۔

پانی کی کہانی ہے　　پانی اک نعمت ہے　　مٹی تو نمانی ہے
خشکی اک حصہ　　جتنا زیادہ ہے　　آپ ہی آگ، ہوا
تِن حصے پانی ہے　　اتنی ہی ضرورت ہے　　اور آپ ہی پانی ہے

سو امین خیال اپنے ٹیچر ہونے کے زمانہ میں بچوں کو پڑھانے کی طرح نہ تو کوئی فارمولا بتانے لگے ہیں، نہ ہی پانی کو فلسفیانہ انداز سے دیکھ رہے ہیں۔ایسا کچھ نہیں ہے۔انہوں نے نہ کوئی فلسفہ بگھارا ہے اور نہ ہی سائنس پڑھانے بیٹھے ہیں۔وہ تو بس ماہیے کی روانی میں، یادوں کی جوانی میں ،ایک سفینے سے دوسرے سفینے تک جاتے آتے پانی کو دیکھتے ہیں، سنتے ہیں، جتنا سمجھ میں آتا ہے سمجھتے ہیں اور پھر اپنی واردات کو سادگی سے بیان کردیتے ہیں۔اسی لیے مذکورہ بالا تین ماہیوں میں سے تیسرے ماہیے سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ پانی کی کہانی میں کئی اور کہانیاں سنانے جارہے

ہیں۔

پانی کی گاگر ہے کیا درد کا لہرا ہے دل بحر کو چھل دی ہے
میں اک قطرہ ہوں سات سمندر سے یار نے تو دل کی
تو پیار کا ساگر ہے بڑھ کر دل گہرا ہے دنیا ہی بدل دی ہے

شروع میں دیئے گئے تین ماہیوں میں سے ''مٹی نمانی'' والے ماہیے سے ہمہ اوست والا معروف صوفیانہ تصور ابھرتا ہے جو ان تین ماہیوں (پانی کی گاگر، درد کا لہرا اور دل بحر) کے ذریعے واضح ہوتا چلا جاتا ہے۔ پہلے تو سب کچھ وہ ''آپ'' ہے۔۔۔۔ پھر ''وہ'' ساگر ہے اور ''میں'' ایک قطرہ ہے۔ اس ''میں'' کو جب درد کی دولت ملتی ہے تو سات سمندروں سے بھی بڑھ کر گہرا ہو جاتا ہے۔ قطرے کی سمندر میں تبدیلی اُس یار کی طرف سے ہے جس نے اپنی ایک لہر کے ذریعے اسے کیا سے کیا کر دیا۔ اس سب کچھ کے باوجود بات تصوف کی دنیا میں گم نہیں ہوتی۔ صوفیانہ رمزوں سے گزرتے ہوئے، امین خیال زندگی کے لیے بہتے ہوئے پانی کے معروف تصور کو بیان کرتے ہوئے، اسے عمر کے مختلف حصوں میں دیکھتے ہیں۔''

یہاں تک تو امین خیال کی ماہیا نگاری پر میری خیال آرائی شامل ہے۔ پنجابی کے ممتاز شاعر ہونے کے ناطے ان کے اردو ماہیے ہمیشہ اردو ماہیا نگاری کے لیے تقویت کا باعث بنتے رہے ہیں۔ لیکن میرے لیے تحفۂ خاص والی بات یہ ہے کہ انہوں نے کتاب کا انتساب ایسی محبت کے ساتھ کیا ہے کہ میں ابھی تک سرشاری کی کیفیت میں ہوں۔ ان کے الفاظ میں انتساب یوں درج ہے۔ **''اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما اور اردو ماہیے کے جانی حیدر قریشی کے نام''**

متعدد دوستوں نے اپنی کتابوں کا انتساب میرے نام کیا ہے۔ ان سب کی محبت اور خلوص کا میں معترف ہوں اور ان سب کا شکر گزار ہوں۔ لیکن امین خیال کے انتساب نے مجھے ایک انوکھی خوشی عطا کی ہے۔ جیسے مجھے ماہیا کے فروغ کے لیے کی جانے والی اپنی ساری جدہ جہد کا اجر اس ایک انتساب کے ذریعے مل گیا ہے۔ شکریہ امین خیال جی!، بے حد شکریہ!

انٹرنیٹ میگزین ''**ادبی منظر**''۔ اسلام آباد۔ شمارہ نمبر ۳۔ جون ۲۰۱۴ء
http://issuu.com/adabi-manzar/docs/adabi_manzar_shumara_3_-_june_2014

سیّد ظفر ہاشمی اور گلبن

گلبن کو جاری ہوئے ابھی چار پانچ سال ہوئے تھے اور مجھے بھی باقاعدہ طور پر ادبی دنیا میں داخل ہوئے تقریباً اتنا ہی عرصہ ہوا تھا جب میرا ایڈیٹر گلبن سے رابطہ قائم ہوا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اکتوبر ۱۹۸۱ کے شمارے میں چھپنے والی میری غزل گلبن میں چھپنے والی میری پہلی تخلیق تھی۔ اس کے بعد کبھی کبھار میری کوئی نہ کوئی چیز گلبن میں چھپ جاتی۔ رسالہ خان پور کے ایڈریس پر موصول ہو جاتا تھا۔ لیکن رابطہ کی یہ صورت ایڈیٹر اور لکھاری کے رشتہ سے زیادہ نہ تھی۔ لگ بھگ دس سال کے رسمی تعلّق کے بعد اس وقت میری سیّد ظفر ہاشمی سے قلمی ملاقات ہوئی جب انڈیا میں ماہیئے کے درست وزن کا مسئلہ گلبن میں پیش کیا گیا۔ گلبن انڈیا کا پہلا ادبی رسالہ تھا جس نے ماہیے کے لوک روپ کو اجاگر کرنے کے لئے فورم مہیّا کیا اور ماہیئے کے فروغ کا آغاز ہوا۔ پھر کب یہ قلمی رابطہ، قلبی رابطہ میں بدل گیا اور گلبن کی جگہ سیّد ظفر ہاشمی نے لے لی اس کا مجھے پتہ ہی نہ چلا۔ حالانکہ گلبن اور سیّد ظفر ہاشمی کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا اسکے باوجود گلبن کے مقابلے میں سیّد ظفر ہاشمی سے میرا قلبی تعلّق مسلسل گہرا ہوتا گیا۔

ادبی سطح پر سیّد ظفر ہاشمی کی تین حیثیتیں ہیں۔ (یہاں مجھے **حاجی معلّق** کی ستّرویں کڑی کا آغاز یاد آ گیا۔) مدیر، طنز و مزاح نگار، اور افسانہ نگار۔ مدیر کی حیثیت سے ان کی ایک خوبی یہ ہے کہ ادب کے بڑے ناموں کے پیچھے نہیں بھاگتے۔ نئے لکھنے والوں کو نسبتاً زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اگرچہ وہ اعلیٰ ادب کے فروغ کے مقابلہ میں اردو زبان کی بقا کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ تاہم انھوں نے اپنے ادبی رسالہ کا ایک کم از کم ادبی معیار ہمیشہ برقرار رکھا ہے۔ ادب کے نام پر دکانداری کرنے والوں کو اور ادبی اکادمیوں کے غیر ادبی طرزِ عمل کو انھوں نے ہمیشہ زد پر لئے رکھا ہے یہ محض بیان کی حد تک بات نہیں ہوتی بلکہ وہ ٹھوس شواہد اور حقائق کی بنیاد پر مضبوط گرفت کرتے

ہیں۔مثلاً گجرات اردو اکیڈمی جسے مکمّل طور پر سرکار کی مالی سرپرستی حاصل ہے اس نے ایک ادبی رسالہ جاری کرنے کا اعلان کیا۔حکومت کی مدد سے مالی فراخدلی کے باوجود پندرہ برسوں میں صرف تین شمارے شائع کئے گئے۔ چوتھا شمارہ ترتیب دینے کے لئے جن صاحب کو اکیڈمی نے ذمہ داری سونپی انھوں نے ادبی تخلیقات کے حصول کے لئے جو باقاعدہ لیٹر جاری کیا اس میں ۲۳ سطروں کے مضمون میں ۱۵ جملے ادبی مضحکہ خیزی کی مثال ہیں اور سب سے زیادہ تماشہ یہ ہوا کہ لیٹر ۷ نومبر ۱۹۹۶ کو جاری کیا گیا اور اس میں مکتوب الیہان سے تقاضہ کیا گیا کہ وہ اپنی تخلیقات ۵ نومبر ۱۹۹۶ تک پہنچا دیں۔ٹھوس دلائل پر مبنی یہ اداریہ جولائی۔اگست ۱۹۹۷ کے گلبن میں پڑھا جا سکتا ہے۔گجرات اکیڈمی نے اپنے دستور میں تبدیلی کی کہ اب اعزاز صرف شاعر اور ادیب ہونے کی بنیاد پر نہیں بلکہ اردو کے لئے مجموعی خدمات کی بنیاد پر دیا جائے گا اور محی الدین بمبے والا کو یہ ایوارڈ دے دیا گیا۔تب سیّد ظفر ہاشمی نے اس غلط بخشی پر احتجاج کرتے ہوئے واضح کیا کہ اگر غیر ادیبوں کی اردو خدمات کو دیکھنا ہے تو پھر ان افراد کو اہمیت دی جائے جو اپنے تعلیمی اداروں کے ذریعہ اردو کی تعلیم عام کر رہے ہیں، خصوصاً اردو میڈیم اسکولوں اور کالجوں کو چلانے والوں کی خصوصی اہمیت بھی بنتی ہے۔ان کی احتجاجی آواز کو نظر انداز کر دیا گیا اور اگلے سال ’’تاریخی دستاویز‘‘ کے موضوع سے متعلّق انگریزی میں ۲۲ کتابیں لکھنے والے اکبر علی ترمذی کو اردو کا ایوارڈ دیا گیا۔اس پر سیّد ظفر ہاشمی نے اکبر علی ترمذی سے ملاقات کر کے بعض دلچسپ حقائق پیش کرنے کے ساتھ اپنے اداریہ میں یہ بھی لکھا:

’’وارث علوی کا تعلّق اردو اور صرف اردو سے ہے۔اگر انھیں چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کی طرف سے پلاسٹک انڈسٹری کے فروغ کے سلسلے میں محض اس بنا پر ایوارڈ دیا جائے کہ وہ بازار سے سودا سلف لانے کے لئے پلاسٹک کی تھیلی استعمال کرتے ہیں تو وہ کتنی مضحکہ خیز بات ہو گی۔‘‘

سیّد ظفر ہاشمی کو بخوبی علم ہے کہ اکیڈمی کے ارباب اختیار ان کے احتجاج کو اہمیت نہیں دیں گے لیکن وہ اپنے مدیرانہ فرض کو پورا کرتے ہوئے اصل حقائق کو ادب کی تاریخ میں محفوظ کئے

جا رہے ہیں۔

مدیر کی حیثیت سے سیّد ظفر ہاشمی نے نہ صرف گلبن کی اشاعت میں باقاعدگی کو قائم رکھا بلکہ ہر سال کے آغاز میں ایک خاص نمبر کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع کیا۔یوں تو گلبن کے خاص نمبر کی اپنی ایک اہمیت ہے تاہم گجرات نمبر، ماہیا نمبر، اور نعت نمبر تینوں خاص نمبرز کی خصوصی اہمیت ہے۔پنجابی اخبار بھنگڑا گوجرنوالہ نے بھی ایک ماہیا اڈیشن پہلے شائع کیا تھا اور اس کی تاریخی حیثیت بھی بنتی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ گلبن کے ماہیا نمبر (۱) کی اشاعت کے بعد اردو ماہیا واقعتاً ایک تحریک کی صورت اختیار کر گیا۔

طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے سیّد ظفر ہاشمی نے **حاجی معلّق** میں سماجی ناہمواریوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔اور اپنی شگفتہ مزاجی کو بھی ظاہر کیا ہے۔اس میں تین مرکزی کردار ہیں حاجی معلّق، میر صاحب، اور مصنّف خود۔حاجی صاحب کے کردار میں ظاہر پرستی ہے۔وہ سود کو حرام مانتے ہیں لیکن اٹکل کے ساتھ اسے حلال بھی کرنا چاہتے ہیں یوں ان کی شخصیت کا مضحک پن نمایاں ہوتا ہے۔یہ مضحک پن ہمیں ہنساتا بھی ہے اور سوچنے پر بھی اکساتا ہے، میر صاحب اور حاجی صاحب کے درمیان ہونے والی ایک گفتگو کا یہ اقتباس دیکھیں۔

’عوام نے نہ تو قرآن سمجھا ہے نہ حدیث پڑھی ہے اور جنھوں نے پڑھا ہے اور سمجھا ہے وہ خود بیان دیتے ہیں کسی کی سنتے نہیں۔آپ کا بیان عوام کے لئے ہوگا۔کچھ بھی کہہ جائیے گا سب چل جائے گا۔صرف اتنا کہہ دیجئے گا کہ قرآن اور حدیث کی رو سے ایسا ہونا چاہیئے۔

کیسا ہونا چاہیئے؟

یہی تو غور کرنے والی بات ہے۔چائے منگوائیے تو کچھ سوچیں۔‘‘

افسانہ نگار کی حیثیت سے سیّد ظفر ہاشمی سیدھے سادے بیانیہ کے قائل ہیں۔ان کے افسانے واقعات کے تانے بانے سے اپنے آپ کو مکمّل کرتے ہیں۔ان کا ایک حالیہ افسانہ **یہ دھرتی ہے بلیدان کی** کئی لحاظ سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔بھارت اور پاکستان کی طرف سے جو ایٹمی دھماکے کئے گئے انھیں کو مدِ نظر رکھ کر انھوں نے بھاتال اور پاتال دو ملکوں کے ایٹمی دھماکوں

کا قصّہ بیان کیا ہے۔ پھر ایک کردار تانترک رنژ بھومی راؤ کے ذریعہ روح کی تسخیر کی فنتاسی پیش کی جاتی ہے۔ راؤ ایک روح کو مسخر کر لیتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ کوئی ایسی صورت کرے کہ ہمارے ایٹم بم تو دشمن کو نابود کر دیں لیکن ان کے ایٹم بم ہم پر چل ہی نہ سکیں یا ہمیں نقصان نہ پہنچا سکیں۔ تب روح اسے کہتی ہے کہ کوئی ایک منتری اپنے پورے خاندان کے ساتھ قربانی دے دے تو ان کے ملک کو پاتال کے ایٹم بم سے بچایا جا سکتا ہے۔ پھر یہ شرط وزیر کو چھوڑ کر کسی ایک ایم پی یا ایم ایل اے کے خاندان کی قربانی پر آجاتی ہے۔ لیکن کوئی وزیر، ایم پی اور ایم ایل اے اپنی اور اپنے پورے خاندان کی قربانی کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ آخر یہ کہ آتما خود تانترک رنژ بھومی کی قربانی لینا چاہتی ہے۔ وہ جان بچا کر بھاگنا چاہتا ہے۔ لیکن آتما کے ہاتھوں ہلاک ہو جاتا ہے۔ یوں اس کہانی میں حب الوطنی کے بڑے بڑے دعوے کرنے والوں کی قلعی کھول کر ایٹم بم سے ہونے والی تباہی کا احساس دلایا گیا ہے۔ اس کہانی میں بھارت کے حوالے سے وہاں کی سیاست کی منافقت کو ظاہر کیا گیا ہے تاہم یہ حقیقت ہے کہ پاکستانی سیاست کی صورت حال بھی بالکل ایسی ہی ہے۔ شاید برصغیر کے مجموعی سیاسی رویوں میں یکسانیت ہے۔

مدیر، طنز نگار اور افسانہ نگار کی حیثیتوں سے ہٹ کر سیّد ظفر ہاشمی بہت اچھے انسان ہیں۔ دوستی کو نبھانے والے لیکن اپنے اصولوں پر قائم رہتے ہوئے دوستی کو نبھانے والے۔۔۔ روایات اور اقدار کا پاس رکھنے والے۔۔ کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا قلمی تعلّق جو قلبی تعلّق بھی بن چکا ہے اب اس سے بھی کچھ زیادہ بن رہا ہے۔ ایسا احساس مجھے اپنی طرف سے کم اور سیّد ظفر ہاشمی کی طرف سے زیادہ ہوتا ہے۔ کہیں یہ محبت ہی کی کوئی صورت تو نہیں؟

مطبوعہ سہ ماہی **توازن** مالے گاؤں۔ جنوری ۔تا اپریل۔ ۲۰۰۱

گلبن کی سلور جوبلی

سیّد ظفر ہاشمی کا ادبی رسالہ **گلبن** اپنی زندگی کے ۲۵ سال پورے کر رہا ہے۔ اس کی سلور جوبلی منانا اس کے تمام قلم کاروں کا فرض بنتا ہے۔ میرا اور گلبن کا تعلّق بہت پرانا ہے۔ اس کے اجراء کے لگ بھگ چار پانچ سال کے بعد میرا اس سے رابطہ ہوا۔ دراصل اس زمانے میں ایک تو انڈیا اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا نظام کچھ مشکوک سا تھا۔ دوسرے میں اپنی زندگی کے ایسے بحران سے گزر رہا تھا جس میں انڈیا کا ڈاک کا لفافہ تو کیا اپنی تخلیقات لکھنے کے لئے کاغذ خریدتے وقت بھی سوچنا پڑتا تھا۔ یہ ۱۹۸۱ء کے لگ بھگ کی بات ہے۔ تب میں خانپور سے **جدید ادب** کا اجراء کر چکا تھا جو میری بیوی کے زیور کے بل پر نکل رہا تھا۔ ایک دوست کو شریک مدیر بنایا۔ ان کے ذمّہ ایک کام یہ بھی تھا کہ انھوں نے ایک اسٹیشنری والے سے کہہ رکھا تھا کہ حیدر قریشی کو جتنی اسٹیشنری درکار ہو دے دیا کریں اور رقم میرے حساب میں لکھ لیا کریں۔ بعد میں ایک وجہ سے (بے حد حقیر سی وجہ سے) وہ دوست کہیں مجھ سے ناراض ہوئے تو بجائے مجھ سے قطع تعلّق کیلئے کہنے کے اس اسٹیشنری والے سے کہہ گئے کہ وہ جب آئے تو اسے کاغذ مت دینا۔ میرے وہم و گمان میں بھی دوست کی خفگی ہوتی تو میں خود احتیاط کرتا لیکن مجھے اسٹیشنری شاپ والے نے کاغذوں کا دستہ دینے سے انکار کرتے ہوئے اس کی وجہ بھی بتا دی تو مجھے اس لئے اور زیادہ شرمندگی ہوئی کہ تب میری جیب میں ایک دستہ کاغذ خریدنے جتنے پیسے بھی نہیں تھے۔ سو ایسے حالات میں جب کاغذ خریدنا بھی مسئلہ بنا ہوا ہو، انڈیا کے ڈاک کے مہنگے مصارف برداشت کرنا میرے لئے خاصہ مشکل تھا۔ اس کے باوجود میں نے **گلبن** سے رابطہ رکھا۔ اگرچہ تب میری اک آدھ غزل اس میں چھپ جاتی تھی اور سچّی بات ہے یہ بھی بہت بڑی بات تھی۔ اس رابطہ میں پہلی بار استحکام اس وقت آیا جب سیّد ظفر ہاشمی نے سعید شباب کا ایک مضمون ''ادبی عدالت میں'' شائع

کیا۔ میری ایک کہانی اور ایک ممتاز اردو افسانہ اور ناول نگار خاتون کی کہانی کا مرکزی خیال آپس میں مل گیا تھا۔ تب سعید شباب نے اس کا نوٹس لیا۔ مگر ان کا مضمون پاکستان میں کسی رسالہ نے شائع نہیں کیا۔ ہماری ادبی دنیا کی مصلحت پسندی (یا منافقت) بعض اوقات کیسے کیسے تلخ حقائق کو نظر انداز کر جاتی ہے یہ تو پھر بہت ہی عام سی بات تھی۔ سیّد ظفر ہاشمی نے اس مضمون کو اہتمام کے ساتھ شائع کیا۔ یوں گلبن سے میرا رابطہ مستحکم ہوا۔ جب انڈیا میں اردو ماہیا کے درست وزن کا مسئلہ باقاعدہ طور پر پیش کیا گیا تب گلبن ہی پہلا ادبی رسالہ تھا جس نے اسے نہ صرف پیش کیا بلکہ اردو ماہیا کو اردو میں مقبول بنانے میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ سو یوں گلبن کے ساتھ میرا ایسا گہرا دوستانہ تعلّق بنتا گیا جس کی بنیاد کسی مادی لالچ یا طمع پر نہیں بلکہ خالصتاً ادبی اخلاص محبّت اور اردو کے فروغ کے جذبہ پر تھی۔ اس کے بعد گلبن نے مجھے ایسے اہتمام سے شائع کیا جیسے بعض ادبی رسالے اپنے فنانسر کو شائع کرتے ہیں۔ حالانکہ گلبن کے لئے میں نے سالانہ چندے سے زیادہ کچھ نہیں کیا۔ اور پھر گلبن کا سالانہ چندہ بھی کیا ہے۔ ڈرافٹ بنوانے جائیں تو سالانہ چندہ سے زیادہ ڈرافٹ فیس پڑ جائے۔ ادبی رسائل کے فنانسر والی بات کی تو مجھ میں ہمّت بھی نہیں تھی۔ لیکن جو گلبن کا سالانہ چندہ ہے اس کی ادائیگی کرتے ہوئے حقیقتاً شرمندگی ہوتی ہے۔ جب گلبن کا اردو ماہیا نمبر شائع ہوا تو پھر اس تعلّق کی جو نوعیت ہوگئی اس کے اظہار کے لئے میرے پاس مناسب الفاظ نہیں ہیں۔ گلبن کے غزل نمبر کے لئے مجھے بہت سا کام کرنے کا موقع ملا اور ایسے لگا جیسے میں اپنے ادبی پرچے کا کام کر رہا ہوں۔

میری ایک اچھّی یا بُری عادت بن گئی ہے کوئی ادبی رسالہ محبّت کے ساتھ تحریریں مانگتا ہے تو وہ بظاہر کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو میں اسے اپنی تحریریں بھیجنا اپنی عزّت سمجھتا ہوں اور کوئی ضخامت کا بڑا ادبی جریدہ اگر اپنی بڑائی کے زعم میں مبتلا دکھائی دے تو میں اسکی طرف دیکھتا بھی نہیں ہوں۔ میرے لیے گلبن ہو یا تسطیر، گلگدہ ہو یا استعارہ۔ توازن ہو یا تشکیل اور قرطاس ہو یا اسباق، ہر ادبی رسالہ اپنی اپنی ادبی اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن میں صرف ان رسائل کو ہی اپنی تخلیقات بھیجتا ہوں جو مجھ سے محبّت کے ساتھ تخلیقات طلب کرتے ہیں۔ تھوڑا عرصہ پہلے مجھے ایک

بہت اچھّے دوست نے کہا کہ آپ فلاں فلاں رسالوں میں چھپتے ہیں اور اپنی تخلیقات کی اہمیت کم کر دیتے ہیں۔ ان فلاں فلاں میں گلبن کا نام بھی شامل تھا۔ مجھے اس دوست کے انداز نظر پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ بیشک بڑے پرچوں کا اپنا ایک تاثر ہوتا ہے لیکن میں نے تب ہی اس دوست کو بتایا کہ میری تحریر میں سچّائی ہوگی تو کسی محدود حلقے میں تو اس کی پذیرائی ہوگی لیکن اگر کسی نام نہاد بڑے ادبی پرچے میں کسی کمزور لکھاری کو یا کسی کلوننگ کردہ کو اہمیت دی جائے تو نہ تو وہ کمزور چور اور جعلی لوگ اہم بن پائیں گے اور نہ ہی ایسے بڑے ادبی پرچے کی ساکھ زیادہ دیر تک قائم رہے گی۔ اس پر میرے دوست نے اصرار کیا کہ ایسے پرچوں کی ساکھ قائم رہتی ہے۔ تب میں نے کہا اگر ہم واقعی چوروں اور جعلی شاعروں اور ادیبوں کے دور میں آ گئے ہیں تو پھر مجھے ویسے بھی اس نوعیت کے بڑے رسائل کا بڑا ادیب نہیں بننا۔ میں چھوٹے رسالوں کا چھوٹا ادیب ہی ٹھیک ہوں میں اوراق اور گلبن میں چھپتا ہوں میرے لئے اتنا ہی بہت ہے۔

گلبن اور سیّد ظفر ہاشمی کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اسی دوران جب میرے اور گلبن کے تعلّق میں رومانس جیسی کیفیت پیدا ہو گئی تھی ایک واقعہ ایسا ہوا کہ اس سے تعلّق میں انقباض جیسی کیفیت پیدا ہوگئی۔ غلط فہمی کی بنیادی وجہ جو بھی تھی اس سے یہ ضرور واضح ہو گیا کہ دونوں طرف اردو محبّت کا جذبہ ہی کارفرما تھا۔ فرق صرف انداز نظر کا تھا۔ پھر شومئ قسمت ایک دو واقعات دونوں طرف سے ایسے ہوتے گئے اور ایسی غلط فہمیاں ہوتی گئیں کہ دونوں ہی دکھی ہو کر رہ گئے۔ اس دکھ میں بھی محبّت جیسی کیفیت تھی۔ وگرنہ فی زمانہ لوگ مطلب کی حد تک ہی مطلب رکھتے ہیں اور مطلب نکل جائے تو اندھی مخالفت سے بھی گریز نہیں کرتے۔ گلبن صرف ادبی رسالہ ہی نہیں اردو کے فروغ کے لئے ایک مشن کا نام ہے۔ دوکاندار قسم کے ادبی رسالوں سے واسطہ پڑتا تو غلط فہمی کے بعد دوستی ہونے میں کچھ اور ہوتا۔ لیکن یہاں تو اردو کا ایک مشن ہاؤس تھا۔ سو اپنے اپنے موقف کے بارے میں تھوڑی سی وضاحت کے ساتھ ہی نہ صرف ساری گرہیں کھل گئیں بلکہ ''گرہوں میں پھونکیں مارنے والے'' بھی چُپ ہو گئے۔

میری دلی خواہش تھی کہ گلبن کی سلور جوبلی تقریب ہو اور میں اس میں شرکت کرنے کے لئے

آؤں ۔ مجھے علم نہیں ہے کہ وہاں کے دوستوں نے کیا پروگرام بنایا ہے اگر ایسا پروگرام بنے اور مجھے بروقت اطلاع کر دی گئی اور ویزا ملنے میں کوئی روک پیدا نہ ہوئی تو میں گلبن کی سلور جوبلی میں شرکت کے لئے انشا اللہ ضرور حاضر ہوں گا۔ اس تقریب میں شرکت کرنا میرے لئے بڑے اعزاز کی بات ہوگی۔

مطبوعہ دوماہی **گلبن** احمد آباد۔ **سلور جوبلی نمبر**۔ جنوری۔ اپریل ۲۰۰۲

مشاعرہ میں ریما کی نظامت اور ندا فاضلی کا احتجاج

۱۲ جولائی ۲۰۱۳ کے ایک قومی اخبار میں تازہ ترین کے سیکشن میں ایک خبر پڑھنے کو ملی۔ اس کے مطابق امریکہ میں پاکستانی ڈاکٹروں کی تنظیم ''اپنا'' کی سالانہ تقریب میں مشاعرہ کے دوسرے سیشن میں پاکستانی فلم سٹار ریما کو نظامت کے لیے بلایا گیا تو ندا فاضلی اس بنا پر احتجاج کرتے ہوئے تقریب سے باہر چلے گئے کہ فلم سٹار سے مشاعرے کی نظامت کرانا شاعری کی بے قدری اور توہین ہے۔ یہ خبر پڑھ کر دلی افسوس ہوا۔ میں نے اس واقعہ کو کئی پہلوؤں سے دیکھا اور ہر بار افسوس ہوا کہ ندا فاضلی جیسے اچھے بھلے شاعر نے بے جا احتجاج کیا۔

پہلی بات یہ ہے کہ ندا فاضلی ادبی شاعر کے ساتھ فلمی شاعر بھی ہیں۔ فلمی دنیا میں بطور شاعر قدم جمانے کے لیے شروع میں انہیں کن مراحل سے گزرنا پڑا، ان سے بہتر کون جانتا ہے۔ فلمی دنیا میں کسی بھی اچھے ہیرو اور ہیروئن کے مقابلہ میں ایک گیت کار کی کیا وقعت ہے؟ ساحر لدھیانوی کے استثنا کے ساتھ ہمارے سارے فلمی شاعر اچھی طرح جانتے ہیں۔ ندا فاضلی بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔ سو کسی فلم سٹار کی میزبانی کا بہانہ کر کے اعتراض کرنا مناسب نہیں لگتا۔ اب ادب کی دنیا کے حوالے سے اور خالص ادبی شاعر کے طور پر ندا فاضلی کے احتجاج کو دیکھا جائے تو اس میں بھی کوئی جان نہیں ہے۔ متعدد ادبی و شعری تقریبات میں فنون لطیفہ کے کسی بھی دوسرے شعبے کے نامور اسٹارز کا آنا اور اس تقریب کی صدارت یا نظامت کرنا کوئی غیر ادبی معاملہ نہیں ہے۔ ایسی متعدد تقریبات کے حوالے دیئے جا سکتے ہیں جن میں شاعر نہ ہوتے ہوئے فن کے کسی دوسرے شعبہ کی شخصیت شاعروں کے سامنے زیادہ نمایاں ہوئی۔ اس سلسلہ میں مجھے ضیا محی الدین کا نام تو بہت ہی نمایاں دکھائی دے رہا ہے۔ اور مجھے یہ لکھتے ہوئے کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہو رہی کہ ضیا محی الدین کی شعر فہمی مشاعروں کے کئی شاعروں کی شعر فہمی سے کہیں بہتر دکھائی دیتی ہے۔ پاکستان کے نامور

فنکاروں مصطفیٰ قریشی اور نعیم بخاری کا ادبی ذوق بھی بہت نکھرا ہوا ہے۔

اب ایک اور پہلو سے دیکھیے۔ صرف نظامت کسی شاعر کے حوالے کر کے مشاعرہ میں یا تو بے وزن شعراء کو کلام پڑھنے دیا جائے یا ایسے شاعروں اور شاعرات سے کلام پڑھوایا جائے جو دوسروں سے پورے مجموعے لکھوا کر شاعر بنے بیٹھے ہوں تو کیا یہ مستحسن بات ہو گی؟۔ افسوس ندا فاضلی نے بیرون ملک جو مشاعرے پڑھے ہیں ان میں سے کئی مشاعروں میں یہ سب کچھ ہوتا رہا ہے۔ ایسی ریڈی میڈ شاعرات کا پورا طائفہ ہندوستان سے دنیا بھر میں مشاعرے پڑھنے جاتا رہا ہے۔ اور مشاعرے میں ایسی حرکات وسکنات کا مظاہرہ کرتا رہا ہے کہ بعض سنجیدہ ادیبوں کو ایسے مشاعروں کو مشاعرہ کی بجائے مجرا کے انداز میں مجرائیہ لکھنا پڑا۔ یہ سب کچھ آن ریکارڈ ہے۔ ندا فاضلی ایسے مشاعروں میں شریک ہوتے رہے ہیں۔ کسی معقول شاعر کی نظامت ہونے کے باوجود مشاعرے میں لوگ بے وزن شعر سنا رہے ہوں تو اس کا کیا کیا جائے؟۔ کوئی اور نہیں خود ندا فاضلی ایک ملک میں مشاعرہ کی نظامت کر رہے تھے اور وہاں کے تین شاعروں کو مشاعرہ میں شرکت کا موقعہ دیا گیا تھا۔ ان تین میں سے دو بے وزن کلام سنا رہے تھے اور ندا فاضلی نے ان کے کلام سنانے کے بعد بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ بلکہ میزبان ہونے کی وجہ سے ان کی تعریف کرتے رہے۔ (ثبوت مطلوب ہوا تو سند کے ساتھ پیش کر دوں گا)۔

انڈیا سے اگر دلیپ کمار سے لے کر شبانہ اعظمی تک کوئی فلم سٹار کسی مشاعرے یا ادبی تقریب کی صدارت یا نظامت کرے تو مجھے نہ صرف کوئی اعتراض نہیں ہوگا بلکہ خوشی ہوگی۔ فنون لطیفہ کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے نامور افراد کے درمیان روابط خود فن وادب کے لیے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ مشاعرہ کی نظامت کے لیے ریما کا کئی جہات سے حق بنتا ہے۔ ریما پاکستان کی معروف وممتاز فلم سٹار ہونے کے ساتھ میزبان تنظیم ''اپنا'' سے تعلق رکھنے والے ایک معزز ڈاکٹر کی اہلیہ بھی ہیں۔ یوں وہ خود میزبان ہیں۔ ایک عرصہ سے ریما ایک پاکستانی اخبار میں کالم نگاری کرتی رہی ہیں۔ اس لحاظ سے صحافت سے ان کا تعلق بنتا ہے۔ اور ادب وصحافت کا تعلق تو شروع سے ساتھ ساتھ چلتا آرہا ہے۔ ایسی صورت میں ہمارے ادبی وفلمی شاعر ندا فاضلی کا

احتجاج نہ صرف بے جا ہے بلکہ اپنے میزبانوں کی توہین اور ایک لحاظ سے ہند پاک تعلق میں خرابی کی صورت پیدا کرنے کے مترادف ہے۔ ہند پاک تعلقات آج جس موڑ پر کھڑے ہیں ایسے مرحلہ پر دونوں طرف کے فن کاروں کو زیادہ بڑے دل کا اور اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرنا چاہیے تا کہ دونوں ملکوں کے تعلقات کی راہ میں حائل مشکلات کم ہوسکیں۔ ندا فاضلی اس معاملہ میں کوتاہی اور زیادتی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ ادب کی دنیا سے تعلق رکھنے کے باعث مجھے ان کے طرزِ عمل سے دلی افسوس ہوا ہے۔

مطبوعہ **ادب نامہ** روزنامہ **صبح** ایبٹ آباد۔ ۱۸؍جولائی ۲۰۱۳ء
ادب سرائے روزنامہ **آج** پشاور۔ ۱۸؍جولائی ۲۰۱۳ء
روزنامہ **دنیا** لاہور۔ ۱۹؍جولائی ۲۰۱۳ء

بڑے اداروں میں چھوٹے ذہن کے لوگ

میرا مختصر سا تاثراتی مضمون ''مشاعرہ میں ریما کی نظامت اور ندا فاضلی کا احتجاج'' روزنامہ صبح ایبٹ آباد، روزنامہ ''آج'' پشاور اور روزنامہ دنیا لاہور میں شائع ہو چکا ہے۔ ۱۹؍جولائی ۲۰۱۳ء کو روزنامہ دنیا میں اس کی اشاعت کے معاً بعد مجھے ندا فاضلی صاحب کی ای میل ملی۔ پہلے تو وضاحت کے طور پر ان کی ای میل یہاں درج کر رہا ہوں۔

''**حیدر صاحب**! آداب

مجھے افسوس ہے کہ آپ نے صرف ایک جھوٹی خبر پر یقین کیا اور آرٹیکل لکھ دیا۔ Orlando میں ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میں مشاعرے میں آخر تک بیٹھا رہا۔ اور تقریباً ساڑھے چار بجے کلام بھی سنایا۔ اور اپنا لٹریری ایوارڈ ۲۰۱۳ء بھی حاصل کیا۔ ظاہر ہے ایوارڈ مشاعرے کے ختم ہونے کے بعد ہی دیا جاتا ہے۔ **ندا فاضلی**''

آج ۱۹ جولائی ہی کو میرے استفسار پر اپنی دوسری ای میل میں ندا فاضلی نے یہ وضاحت کی ہے کہ وہ اسٹیج پر بیٹھے تھے۔ کافی دیر سے واش روم جانے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ جب وہ اس غرض کے لیے جانے لگے تو عین اسی وقت ریما کی انٹری ہوئی۔ جبکہ ندا فاضلی واش روم سے ہو کر پھر اسٹیج پر آ کر بیٹھ گئے اور آخر دم تک بیٹھے رہے۔ یہ مشاعرہ صبح ساڑھے چار بجے کے بعد تک جاری رہا۔

مجھے خوشی ہے کہ ندا فاضلی نے کافی وضاحت کر دی۔ میرا مضمون ملک کے سب سے بڑے اخبار میں چھپنے والی خبر کی بنیاد پر لکھا گیا تھا۔ اصلاً تو اتنے بڑے قومی اخبار کی اس نوعیت کی خبروں میں کسی جھوٹ کا گمان ہی نہیں ہوتا اور ہونا بھی نہیں چاہیے۔ غلط خبر چھپ گئی تھی تو ندا فاضلی یا

مشاعرہ کے منتظمین فوری طور پر تردید کر دیتے تب بھی صورتِ حال از خود واضح ہو جاتی۔ ۱۲ جولائی کو یہ خبر شائع ہوئی اور ۱۵ جولائی تک جب کسی طرف سے کوئی تردید نہ آئی تو تب میں نے اپنے تاثرات لکھنا ضروری سمجھا۔ اگر ندا فاضلی صاحب کی وضاحت کے مطابق ایسا کچھ نہیں ہوا تھا تو پھر بہت افسوس کی بات ہے کہ پاکستان کا سب سے بڑا قومی اخبار کہلانے والا ادارہ ایک غلط خبر چھاپنے کا مرتکب ہوا۔ جس نمائندہ نے یہ خبر بھیجی، اس سے لازمی طور پر جواب طلبی ہونا چاہیے کہ کیوں جھوٹی خبر بھیجی۔

موقعہ ملا ہے اور بات چلی ہے تو اسی اخبار کے لندن آفس سے متعلق ایک تازہ اور ذاتی نوعیت کی خبر بھی لگے ہاتھوں بیان کیے دیتا ہوں۔ حالیہ دنوں میں مجھے میری ادبی زندگی کی ایک ایسی خبر ملی ہے جو میرے نزدیک اب تک کی میری ادبی زندگی کی سب سے بڑی خبر اور کامیابی ہے۔ (خبر یہاں نہیں بتا رہا)۔ وہ اعزاز جیسا بھی ہے اس کی ایک اہمیت یہ ہے کہ ابھی تک یورپ میں بلکہ شاید امریکہ و کینیڈا میں مقیم اردو شاعروں اور ادیبوں میں سے کسی کو نہیں ملا۔ سب سے پہلے یہ عزت میرے حصہ میں آئی ہے۔ برمنگھم سے ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے وہ خبر اپنے طور پر مذکورہ اخبار کے متعلقہ صحافی کو بھیجی۔ خبر شائع نہ ہونے پر مذکورہ صحافی نے ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کو بتایا کہ ادبی صفحہ کے انچارج کا کہنا ہے کہ اس (حیدر قریشی) شاعر اور ادیب کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور اس قسم کے اعزاز ہر کسی کو ملتے رہتے ہیں۔ اس پر ڈاکٹر رضیہ اسماعیل خاصی برہم تھیں اور اخبار مذکور کے ادبی صفحہ کے انچارج (۱) کے بارے میں اخبار کے پاکستان میں مالک کو شدید شکایت کرنا چاہ رہی تھیں۔ تب میں نے ان سے کہا کہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے بہت سارے بڑے اداروں میں بہت ہی چھوٹے ذہن کے لوگ مسلط ہو گئے ہیں۔ سو کس کس کی شکایت کرتی پھریں گی کہ یہ تو اب ہمارا قومی المیہ بن کر رہ گیا ہے۔ چھوڑیں ایسے لوگوں کو ان کے حال میں خوش رہنے دیں۔

اب ندا فاضلی اور ریما والے مشاعرہ کی خبر کی حقیقت سامنے آئی ہے تو مجھے مناسب لگا کہ خود سے متعلق تازہ ترین قصہ بھی ساتھ ہی بیان کر دوں۔ شاید مذکورہ اخبار کے مالک و مختاران ساری باتوں کا کچھ نوٹس لے لیں، ورنہ میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے۔

میں روزنامہ صبح ایبٹ آباد کے ادب نامہ، روزنامہ آج کے ادب سرائے اور سب سے بڑھ کر روزنامہ دنیا کا شکر گزار ہوں جنہوں نے میرے تاثرات شائع کیے اور وہ تاثرات اتنے موثر ہوئے کہ ''دنیا'' میں چھپتے ہی ندا فاضلی کی طرف سے چند گھنٹوں میں وضاحت آ گئی اور مجھے ۱۹ جولائی کو ہی یہ وضاحت نامہ لکھنے کی توفیق مل گئی۔ امید ہے یہ وضاحت چھپنے سے ندا فاضلی بھی مطمئن ہو جائیں گے۔

مطبوعہ روزنامہ **دنیا** لاہور۔ ۲۵/ جولائی ۲۰۱۳ء

''ادب نامہ'' روزنامہ **صبح** ایبٹ آباد۔ ۲۵/ جولائی ۲۰۱۳ء

۱ یہ انچارج موصوف ارشد لطیف نامی لندن کے شاعر ہیں۔ اور معمولی سی خبر یہ تھی کہ انڈیا کی ایک یونیورسٹی سے حیدر قریشی کے ادبی کام پر ہونے والا پی ایچ ڈی کا مقالہ منظور کر لیا گیا ہے۔ (ح۔ق)

نور ظہیر کے افسانے: ایک تعارف

نور ظہیر کے افسانوں کے مجموعہ ''ریت پر خون'' کی ان پیج فائل، جو مجھے نور نے بھیجی تھی، میرے پاس ہے۔ اس مجموعہ میں بیس افسانے شامل ہیں۔ میں نے ان افسانوں کو نور ظہیر کے فکری پس منظر کو ذہن میں رکھ کر پڑھنا شروع کیا۔ جن باتوں کا مجھے اندازہ تھا کہ انہیں کسی نہ کسی رنگ میں بیان کیا جائے گا، وہ باتیں بھی ان کے افسانوں میں ملیں، لیکن اس کے باوجود نور ظہیر کے افسانے روایتی ترقی پسندوں کی بلند بانگ نعرہ زنی سے کافی الگ نکلے۔ سطحی نوعیت کے ترقی پسندوں کے برعکس ان کے افسانوں میں وہ سوجھ بوجھ زیادہ دکھائی دی جو ان کے والدِ گرامی سجاد ظہیر کے افکار و خیالات میں موجود رہی ہے۔ پھر بات صرف والدِ گرامی کے نقشِ قدم پر چلنے کی نہیں رہی، ابتدائی رہنمائی کے بعد نور ظہیر نے آزادانہ ادبی سفر شروع کیا اور اس سلسلہ میں اپنے رستے خود منتخب کیے ہیں۔ ترقی پسندی کے نام پر انہوں نے صرف مادی ضروریات تک خود کو محدود رکھنے کی بجائے روح کے معاملات اور مابعد الطبیعات کی دنیا کو بھی جھانک کر دیکھا ہے اور اس تاکا جھانکی میں ہی بڑے کام کے افسانے نکال لائی ہیں۔

نور ظہیر کے ان بیس افسانوں کو پڑھتے ہوئے میں نے جیسا محسوس کیا، جی چاہا کہ اپنے قارئین کو بھی اس میں شریک کروں۔ تو آیئے ان بیس افسانوں کو ایک نظر مل کر دیکھ لیں۔

پہلا افسانہ ''ایک قبر کی فریاد'' ہی ایسا چونکانے والا افسانہ تھا کہ جو بڑا گڑھ کے قبرستان سے مغلیہ دور میں لے گیا۔ ایک خانقاہی ماحول سے گزارتے ہوئے محبت اور شوخیوں کی ایک داستان جو ایک المیہ پر ختم ہوئی۔ کہانی مکمل ہوئی تو یوں لگا جیسے بندہ عالمِ ارواح کی سیر کر کے لوٹا

ہو۔اس افسانے کے دو مختصر اقتباس دیکھیں۔

☆''اگر نجات کا راستہ، گناہ سے ہو کر گزرتا ہے تو اے بندے، تو سوال کرنے والا کون ہوتا ہے۔ میرا نام لے اور منزل کی طرف بڑھ۔''

☆''مزار پر پہنچے تو زرینہ نے نظر بھر ٹھہرے ہوئے آسمان کو دیکھا۔ میں نے سوچا شاید وہ دُعا کے لیے ہاتھ اٹھائے لیکن اس نے خاموشی سے اپنی جوتیاں اتاریں اور مجھے تھمائیں۔''

افسانہ ''گھر کا پتہ'' میں یوپی کے دیہاتی ماحول کی عکاسی کرتے ہوئے دیہاتی اپنائیت اور بڑے شہروں کی بیگانگیت کو ہلکا سا اجاگر کیا گیا ہے۔ یوپی کی دیہاتی بولی کو نور ظہیر نے عمدگی سے اردو کا حصہ بنا دیا ہے۔

☆''ہمرے اُدھر تو کڑوا تیل کہتے ہیں، ہیاں جانے سروں کا تیل کا، مونگ پھلی کا، پھلانے کا، ڈھما کے کا۔ ارے آدمی اور تیل دو ہی ہوت ہیں۔ کڑوا اور میٹھا۔''

''سب سے بڑا گناہ'' قتل کرنے کے الزام میں عمر قید کی سزا یافتہ عورتوں میں سے ایک عورت کی کہانی ہے۔ سرکاری طور پر اعتراف گناہ کی صورت تھراپی کی گئی۔ اس میں فرزانہ کی داستان زیادہ کھل کر سامنے آتی ہے۔ یہ صرف کسی ایک فرزانہ کی کہانی نہیں بلکہ حقیقتاً ہندوستان میں عام مسلمان خواتین کی گھریلو حالتِ زار اور مظلومیت کی ہولناک داستان ہے۔ ایک عورت جو برقعہ اور گھر کی چار دیواری میں خود کو محفوظ سمجھتی تھی وہ گھر کی چار دیواری میں ہی برباد کر دی گئی۔ اس کا سسر اس کے ساتھ زبردستی جنسی زیادتی کرتا ہے۔ مولوی فتویٰ دیتا ہے کہ اس کا سسر اب اس کا شوہر ہو گیا ہے اور اس کا خاوند اب اس کا بیٹا ہے۔ اس افسانے کے چند اقتباس سے اس کے اندر موجود تلخ سچائی کی جھلکیاں بخوبی دیکھی جا سکتی ہیں۔

☆''برقعہ پہنے بغیر آنگن کے باہر جھانک بھی لیتی تو ایسا لگتا جیسے ننگی باہر آ گئی۔ یہ ڈر بھی دل میں بیٹھ گیا کہ اگر کہیں برقعے کے بنا نکلی تو نہ جانے کیا ہو جائے۔''

☆''امام صاحب نے میری بات تو کم سنی، ہاں اپنے سوال بہت پوچھے — پیچھے سے پکڑا تھا؟ کہاں سے، کمر سے یا چھاتی سے؟ چھاتیاں پکڑی تھیں یا مسلی تھیں؟ چوما تھا، کہاں کہاں؟ کپڑے

کون سے پھاڑے؟ قمیض یا سلوار، پہلے اوپر والا یا نیچے والا، سلوار کے نیچے کچھ پہنے تھی یا نہیں؟ کچھا پہنے تھیں کیسی، گھٹنوں تک والی یا تکونی والی؟۔

اس کے بعد انھوں نے مجھے گھر جانے کو کہا اور محمود اور میرے سسر کو بلایا۔ تینوں میں کیا بات ہوئی وہ تو پتہ نہیں مگر اگلے دن میرے نام پر فتویٰ جاری ہو گیا۔ مجھے سسر کے ساتھ نکاح کرنا ہوگا اور اپنے شوہر کو بیٹا ماننا ہوگا۔''

☆''آپ میری بات بالکل نہیں سمجھیں۔ میں نے یقین کیا کہ گھر میں عورت محفوظ ہوتی ہے، یقین کیا کہ جو عورت برقعہ پہنتی ہے اسے سب عزت کی نظروں سے دیکھتے ہیں، زمانہ اس کا ساتھ دیتا ہے، خود اس کا نگہبان ہوتا ہے۔ اس جھوٹ پر بغیر سوچے سمجھے، بنا جانچے پرکھے یقین کیا، یہی میرا سب سے بڑا گناہ ہے۔''

''ایک بے وقوف عورت'' ایک پڑھی لکھی خاتون تہمینہ کی کہانی ہے۔۔ جو مائکرو بائیولوجی میں صرف پی ایچ ڈی نہیں، ڈی ایس سی لندن ہیں۔ لیکن اپنے سے کم تعلیم یافتہ شوہر کی دل جوئی کی خاطر ہمیشہ شوہر کی تعریف کرتی رہتی ہیں۔ کہانی کار رئیسہ نے تہمینہ کی داستان کو ایک ملاقات کے ذریعے عمدگی سے بیان کیا ہے۔

''ریت پر خون'' اس مجموعہ کا مرکزی افسانہ ہے۔ مجموعہ کا نام اس افسانے کے نام پر رکھا گیا ہے۔ اس کہانی میں ایک طرف آدی واسیوں کی تحریک کی ایک جھلک دکھاتے ہوئے ہندوستانی پولیس کے کردار کا منفی رُخ نمایاں کیا گیا ہے، دوسری طرف ایک ایسے راجستھانی کی کہانی بیان کی گئی ہے، جس کی زمین گاؤں میں نہر جاری کرنے کے لیے لے لی گئی۔ بدلے میں جو زمین دی گئی، اس کے لیے نہر کا پانی دینے کا وعدہ کیا گیا لیکن یہ وعدہ پورا نہیں کیا گیا۔ احتجاج کرنے پر راجستھانی کسان کو گولیوں سے بھون دیا گیا۔ اوپر سے پنڈت نے کہہ دیا کہ اس مرنے والے کی مکتی چاہتے ہو تو گیا میں پنڈ دان کراؤ۔ بیٹا باپ کی مکتی کی خاطر گیا کا سفر کرتا ہے اور رستے میں آدیواسیوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے اور اب اسے یقین ہو جاتا ہے کہ پولیس والوں کو مارنے سے ہی اس کے باپ کی مکتی ہوگی۔ پانی کی نہر کو کربلا کی نہر سے جوڑ کر نور ظہیر نے کہانی کو ایک علامتی

پیرایہ دے دیا ہے۔

''شروعات'' ہندوستان میں طبقاتی اونچ نیچ کی کہانی جو اکیسویں صدی میں بھی ختم نہیں ہوئی۔ اچھوتوں کو جانور سے بھی کم تر سمجھنے کا رویہ ابھی تک موجود ہے۔

☆''پردھان جی، جانور اور شیڈیول کاسٹ برابر ہیں؟''

''نہیں۔'' وہ جوس کا گھونٹ بھرتے ہوئے بولے — ''جانوروں میں کئی ان سے اونچے ہیں۔ گائے اور اس کی بچھیا اوپر آسکتے ہیں۔''

اور آخر میں کہانی کا مرکزی کردار سا حرا یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ:

☆''جہاں پر ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو انسان ماننے سے ہی انکار کر دے، انھیں جانوروں سے بھی نیچا سمجھے، ایسی جگہ میں انسان کو انسان کا درجہ دلانے کے لیے کون سی قدروں کا سہارا لیا جائے؟ لڑائی کی شروعات کہاں سے، کتنے نیچے سے کی جائے؟''

''خود کی پہچان'' گھر کا کام کرنے میں بیوی کا ہاتھ نہ بٹانے والے ایک شوہر کے ظلم وستم کی کہانی ہے جس میں سماج پوری طرح شامل ہوتا ہے۔ ایک ایسی خاتون کی داستان جو ایک کہانی پڑھ کر اس کے مطابق عمل کر کے اپنے گھریلو مسائل کا حل نکالنے چلی تھی۔ جب نتیجہ کہانی کے برعکس ظاہر ہوا تو اسے آخر میں یہ کہنا پڑا۔

☆''جب یہ مرد خود کو پہچانتے نہیں تو کہانی کیوں لکھتے ہیں؟''۔۔۔۔

ایک سماجی المیہ اپنی نفسی واردات کے ساتھ اس کہانی میں سامنے آتا ہے۔

☆''وہ سب کچھ سہہ کر اپنے من کے کیلنڈر میں ایک اور دن پر کراس لگا دیتی۔''

☆''اس نے روز میری کا ہاتھ اپنے کندھے پر رکھا اور اس کی راستہ ٹٹولنے والی چھڑی سیدھی کر کے دوسرے ہاتھ میں دی، پھر دھیرے دھیرے ہاسٹل کی طرف بڑھنے لگی۔ اسے اپنی راہ چاہے نہ ملی ہو، وہ دوسروں کو راہ ڈھونڈنے میں مدد تو کر ہی سکتی تھی۔''

''پریم چند مرتے کیوں نہیں؟'' اردو، ہندی افسانہ نگار پریم چند کے حوالے سے شروع ہونے والی کہانی ہے۔ گٹر کی صفائی کرنے والا ایک لڑکا جو اپنے ساتھی کے لیے پانی کی بوتل بھرنے

کے لیے نکلا۔ پانی مانگنے والا ایک غریب لڑکا اور بڑے شہروں کے امیر گھروں کے رویے۔۔۔ نارائنی کے روپ میں نورظہیر نے ایک اداس کرنے والی کہانی لکھی ہے۔ اختتام تک لگتا ہے کہ پریم چند کے زمانے سے اب تک کچھ نہیں بدلا، جیسے سارے سماجی فرق اور ظلم ویسے کے ویسے ہی ہیں۔

''اڑان'' بچوں کی پرورش، انگلی سے پکڑ کر چلنا سکھانے سے لے کر ان کی خود اعتمادی تک کے دور کی کہانی ہے۔ بچے جو ماں باپ سے سیکھتے ہیں، ایک دن انگلی پکڑے بغیر چلنا سیکھ لیتے ہیں۔۔۔ ایسے ہی جذبوں کی متضاد کیفیات کی حامل ایک ماں بیٹی کی کہانی۔

☆''یہیں تک کی ڈور تھی۔ اب تتلی کو اپنی اڑان اڑنی ہے۔''

''اور تم! تمہارا کیا ہوگا؟'' دل نے پوچھا۔

''میں یہ سوچ کر خوش ہولوں گی کہ آج اُڑان اس کی اپنی سہی، اڑنا تو میں نے ہی اسے سکھایا ہے!''

''سوبھاوِک تھا'' بائیں بازو کے ایک فراڈ دانشور کی کہانی ہے۔ وہ سرے سے دانشور تھا ہی نہیں۔۔ جو دوسروں کے اگلے ہوئے جملوں پر اپنی دانش کی بنیاد رکھے ہوئے تھا اور بالآخر ایک دن سب پر ظاہر ہو گیا کہ وہ صرف اور صرف ایک فراڈ ہے۔

☆''ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ ایسے لوگ بڑے اسکالر نہیں ہوتے، بڑے اسکالر ہونے کا ناٹک کرتے ہیں۔ اس ناٹک کو وہ کامیابی سے کھیل پاتے ہیں، یہی ان کی قابلیت ہے اور ہم لوگوں کا نکارا پن۔ دوش صرف آپ کا نہیں، ہم سب کا ہے کہ ہم ان کے جھانسے میں آجاتے ہیں۔''

''بے نام'' ایک پارسی خاندان کی قائم کردہ لائبریری کو نئے سرے سے مستحکم کرنے والی ایک خاتون کی کہانی جسے ایک اور خاتون مفید مشورے دے کر لائبریری کے استحکام کا موجب بنتی ہے لیکن آخر میں پتہ چلتا ہے کہ وہ مدد کرنے والی خاتون تو ایک روح تھی۔ محبت کے دکھ اٹھا کر مرجانے والی خاتون۔ ''ایک قبر کی فریاد'' کی طرح یہ کہانی بھی محبت کرنے والی ایک روح کی کہانی ہے۔

''دفن'' دو ہندو دوست لڑکیوں کی کہانی ہے۔ ہوری ایم ایس سی زواوجی کر کے بے روزگار تھی۔ اسے مسلم گرلس جونیئر کالج میں جاب ملتی ہے تو ساتھ شرط لگا دی جاتی ہے کہ طالبات اور ٹیچرز کے لیے ڈریس کوڈ کی پابندی لازم ہے۔ اور برقعہ ڈریس کوڈ میں شامل ہوتا ہے۔ ہندو ہوتے ہوئے جاب کی خاطر ہوری کو برقعہ خریدنا پڑ گیا۔

☆''وہ ہمیشہ کہتی— ''عورت کو عورت ہونے پر ہی اگر شرم آنے لگے تو بھلا اور کیا بات کی جائے۔ تب تو وہ مردوں کے سماج کو ظلم کرنے کی چھوٹ دے رہی ہے۔''

ہوری سے اس کی دوستی کی کئی وجوہات میں سے سب سے بڑی شاید یہی تھی کہ نہ وہ، نہ ہی اس کی ماں اور بھابھیاں پردہ کرتی تھیں۔''

☆ایک بار دامنی نے کہا تھا،'' کیسا لگتا ہوگا اپنے چاروں طرف اندھیرا لپیٹے ہوئے چلنا۔ جیسے اپنی قبر ساتھ لیے چل رہے ہوں۔ بل لے کر ہوری نے دکاندار کو پیسے پکڑائے۔ پیکٹ لیتے ہوئے اسے لگا جیسے اپنے کسی بہت قریبی کے لیے کفن خریدا ہو۔

''پردہ فاش'' پکی عمر میں جا کر ٹین ایج کی محبت کے ذکر سے بھری ہوئی کہانی ہے۔۔سگندھا اور جیا کی دوستی میں سب کچھ ایک دوسرے پر ظاہر تھا بس ٹین ایج کی پہلی محبت پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ مدت کے بعد ملنے پر سگندھا اپنی پہلی محبت جیو کا ذکر کرتی ہے تو جیا اس کے بارے میں اَن جان بن جاتی ہے۔ یاد دلانے پر بھی زیادہ اہمیت نہیں دیتی۔ لیکن آخر میں پردہ فاش ہوتا ہے کہ جیا کو جیو سے اتنی محبت تھی کہ اس نے اپنے خاوند کو پیار سے پکارنے کے لیے جیو نام دے رکھا ہے۔

☆''جب صحافت چھوڑی اور ادب کی ڈگر پکڑی تب یہ سمجھتے دیر نہیں لگی کہ صرف دوسرے کے جھوٹ کا پردہ فاش کرنے سے کام نہیں بنتا ہے۔ اپنے سچ کا سامنا کرنا بھی اتنا ہی ضروری ہے''

''اکیچ بات ہے'' محنت کر کے کمانے والی لورا کی دکھ بھری کہانی ہے۔ لورا کا پہلا شوہر جوزف بھی نشہ کرتا تھا اور نشہ بازوں والی ہر قسم کی خرابی اس میں تھی، اس کی موت کے بعد لورا ایک اچھے انسان ایڈورڈ سے شادی کرتی ہے۔ لیکن جو بندہ شادی سے پہلے اچھا خاصا بھلا مانس تھا، وہ

بھی جوزف جیسا ہی ہو گیا۔

''پرگتی'' آدی واسیوں کے مسائل کو ہلکے سے اشارے سے واضح کرتی ہوئی کہانی ہے۔ اس میں استحصالی طبقوں کا طریقِ استحصال بھی کسی حد تک سامنے آتا ہے۔

''ان کا کیا مقابلہ'' پختہ عمر کی ایک لیڈی دیپیکا کی پکی عمر کی ایک لنگورنی کے ساتھ ہونے والی دوستی کی انوکھی کہانی ہے۔ اس افسانے میں بڑی عمر کی عورت اور بڑی عمر کی لنگورنی دونوں کی نفسیات کو بڑے ہی انوکھے انداز سے اجاگر کیا گیا ہے بلکہ ان میں انوکھی ہم آہنگی بھی ظاہر کی گئی ہے۔ ہندوستانی معاشرہ جہاں عام طور پر بیٹی ہونے والی ہو تو حمل ضائع کرا دیا جاتا ہے اور لنگوروں کا رواج کہ اگر لنگور پیدا ہو تو اس کا باپ اسے مار ڈالتا ہے۔ انسان ہوں یا لنگور دونوں جگہ موت کا فیصلہ کرنے کا حق مرد کو ہی حاصل ہے۔ یہ مختلف کیفیات سے گزرتی ہوئی آخر میں اداس کر دینے والی کہانی ہے۔

''ڈھکا چہرہ'' علی گڑھ یونیورسٹی کے ماحول سے جنم لینے والی کہانی ہے۔، نوجوان لڑکے طالب علمی کے دور میں یونیورسٹی کی برقعہ پوش طالبات کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ طالب علمی کے اسی ماحول میں ایک نوجوان کسی طالبہ کا بوسہ لینے کی شرط لگا کر مہم پر نکلتا ہے۔ اسی یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم اس کی بہن اپنی دو سہیلیوں کے ساتھ جا رہی ہوتی ہے، وہ درختوں کے جھنڈ میں بہن کا برقعہ پہچان کر ایک سہیلی کو دبوچ لیتا ہے، لیکن وہی لڑکی اس کی بہن نکلتی ہے۔ جو بعد میں خودکشی کر لیتی ہے۔ تب سے وہ بندہ برقعہ کے خلاف ہو جاتا ہے۔ یہ اپنے ڈھب کی الگ سی کہانی ہے۔

''ٹرانجٹ کی زندگی'' ایک ایسی لیڈی کی کہانی ہے جو مسلمان ہو کر ہندو آبادی والے علاقہ میں رہنا چاہتی ہے۔ جس نے مذہبی امتیاز کے بغیر کشمیری پنڈتوں کے حق میں بھی بہت کچھ لکھا ہے، لیکن اکثریتی آبادی میں اسے نفرت انگیز ماحول کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی ہندو سہیلی بھی ایک حد سے زیادہ اس کا ساتھ نہ دے سکی۔ بنیادی طور پر یہ ہندوستانی معاشرے میں مسلمانوں کی حالتِ زار کی کہانی ہے لیکن درحقیقت ہر مذہبی اکثریت کے نفرت انگیز رویوں کی کہانی ہے۔

''کڑوی مصری'' ایک تنگ نظر مسلمان گھرانے کی ایک لڑکی کی کہانی ہے۔ نیلوفر کو اپنے خاندانی ماحول میں سخت پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا، شادی کے بعد اس نے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لیے رستے نکالے، کامیابی حاصل کی، ایک مصنفہ بن گئی۔ لیکن ایک خاص قیمت ادا کر کے اسے یہ کامیابیاں مل سکیں۔ ادبی دنیا کی بعض تلخ سچائیاں اس کہانی میں ظاہر ہوتی ہیں۔

☆''نو دن بعد اس کا نکاح کر دیا گیا تھا۔ یہاں، جہاں عورتوں کو قرآن شریف اور دوسری مذہبی کتابوں کے علاوہ کوئی کتاب پڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہاں، جہاں مرد اور عورتیں، الگ الگ کمروں میں، الگ الگ دسترخوانوں پر بیٹھتے اور کھاتے تھے۔ جہاں عورتوں کو ہنسنا، بات کرنا بھی گلا دبا کر کرنا پڑتا تھا، کیونکہ اس گھر میں آواز کا بھی پردہ تھا۔''

لیکن نیلوفر نے ایک دن سارے پردے چاک کر دیئے۔

''زخم'' ہندوستان کے اندر کی ایک ایسی کہانی ہے جو ہمارے لیے تصویر کا دوسرا رُخ بھی کہی جا سکتی ہے۔ بھارتی کشمیر میں ہندوؤں کو اپنے گھروں کو چھوڑنا پڑا، در بدر ہونا پڑا۔ ایسے ہی ایک خاندان سے دہلی میں مسلمان خاتون کی ملاقات ہوتی ہے۔ یہ خاتون ہندو خاندان کو درپیش مسائل کے حل کے لیے بھاگ دوڑ کرتی ہے۔ اس کہانی میں دہشت گردی کے خلاف کسی سیاسی حوالے کے بغیر ایک انسانی مسئلہ کو پیش کیا ہے۔ اور اسے اپنے سینے کے زخم کی علامت کے ساتھ عمدگی سے بیان کیا ہے۔

یہ نور ظہیر کی بیس کہانیوں کی ہلکی سی جھلک تھی۔ ان کہانیوں میں نور ظہیر کہیں دیہاتوں میں تعلیم کو فروغ دینے کے لیے تو کہیں آدی واسیوں کو اوپر اُٹھانے کے لیے، کہیں نکسلیوں پر ہونے والے مظالم دکھانے کے لیے اور کہیں کسی اور رنگ میں تعلیم کو عام کرنے کی لگن لیے ادھر سے اُدھر پھر رہی ہیں۔ ٹیچر کے کردار کے علاوہ سماج کی اصلاح کا پہلو بھی ان کے مدِ نظر ہے۔ یہاں خاص طور پر عورت کے مسائل کی طرف انہوں نے توجہ کی ہے۔ پردہ سے لے کر شادی اور طلاق کے مسائل تک مروج طریقِ کار کو انہوں نے شدید تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور جس تناظر میں انہوں ان معاملات کو اُٹھایا ہے اس میں بڑی حد تک وہ حق بجانب ہیں۔ اکثریت اور اقلیت

کے مسائل کا انہیں نہ صرف ادراک ہے بلکہ وہ خود ان مسائل کا سامنا کر رہی ہیں لیکن وہ مایوس نہیں ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ اچھے اور برے لوگ ہر طبقے میں ہوتے ہیں اور وہ اچھائی کے برائی پر غالب آجانے کا خواب دیکھ بھی رہی ہیں، اور اپنے قارئین کو یہ خواب دکھا بھی رہی ہیں۔ اور اس نتیجہ، اس تعبیر کے حصول کے لیے اپنا کردار بھی بخوبی ادا کر رہی ہیں۔ ایک ٹیچر کے روپ میں، ایک صحافی کے رنگ میں، ایک ادیبہ کے کردار میں، ایک سوشل ورکر کے طور پر، وہ اپنی جس کہانی میں بھی جلوہ گر ہوتی ہیں، مزید اچھے کے لیے جدوجہد کرتی دکھائی دیتی ہیں۔

مجھے ''ریت پر خون'' کے افسانے پڑھ کر دلی خوشی ہوئی اور میں خوشی کی اسی کیفیت کے ساتھ نور ظہیر کے اس مجموعے کا استقبال کرتا ہوں!

ڈاکٹر پنہاں کی غزلیں

''جدید ادب'' خان پور کے زمانہ میں پنہاں سے رابطہ ہوا تھا۔ چند شماروں میں ان کی شاعری شائع کی تھی۔ انہیں دنوں میں ان کی ایک تصویر دیکھنے کو ملی، مسیحی دنیا میں موجود یسوع مسیح کی تصویر سے ملتی جلتی تصویر۔ شاید یہ ان کے پہلے شعری مجموعہ ''احساسِ ناتمامی'' میں چھپی ہوئی تھی۔ پھر پتہ چلا کہ وہ پی ایچ ڈی کرنے لگی ہیں۔ پھر نہ جدید ادب رہا، نہ خانپور رہا۔۔۔۔۔۔ مدت کے بعد جرمنی پہنچا تو یہاں آ کر پتہ چلا کہ ڈاکٹر پنہاں امریکہ میں ہوتی ہیں۔ ہلکا سا رابطہ ہوا، لیکن اب میرا مسئلہ یہ تھا کہ دوست انٹرنیٹ پر بھی ہو اور ان پیج پروگرام کا حامل بھی ہو۔ ورنہ رابطہ قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصہ کے مزید وقفہ کے بعد اب بالآخر ڈاکٹر پنہاں سے باقاعدہ رابطہ ہو گیا ہے کہ انہوں نے ان پیج پروگرام بھی حاصل کر لیا ہے اور اس میں کام کرنے کی صلاحیت بھی بہتر کر لی ہے۔ اس کے نتیجہ میں مجھے ڈاکٹر پنہاں کی تازہ غزلوں تک رسائی حاصل ہو گئی ہے اور میں ان کی غزلوں کے ذریعے ان سے عدم رابطہ کے دوران گزری ہوئی ان کی زندگی کے نشیب و فراز کی داستان سن رہا ہوں۔

اشک چھلکے، زخم مہکے، داغ دہکے اور اب — پھر نئے کچھ خواب پلکوں پر سجائے زندگی
پیاس کہتی ہے کہ بحرِ بیکراں کو زے میں ہو — شوقِ لامحدود اور یہ تنگ نائے زندگی

دل جو کہتا ہے کیا جائے تو کیا ہوتا ہے — آگ سے کھیل لیا جائے تو کیا ہوتا ہے

آسماں چومے زمیں کو جھک کر — وقت کو سکتۂ حیرت ہو جائے
درد کچھ اور بنامِ درماں — دل کی کچھ اور مرمت ہو جائے

انگارے برسائے دل پر — سرد نظر، لہجہ برفانی

زندگی ہم کو اگر ایسی ملی — زندگی کو ہم بھی تو ایسے ملے

ڈاکٹر پنہاں زندگی کو بھوگتے ہوئے ''غزل سہیلی'' سے اپنے دکھ سکھ بانٹتی رہیں۔ ابتدائی غزلوں سے اب آج کی غزلوں تک ڈاکٹر پنہاں کا اپنا اندازِ نظر، اپنا طریقِ اظہار ارتقائی عمل سے تو گزرا ہے لیکن اپنی بنیادی شناخت کو اس نے قائم رکھا ہے۔ غزل نے بھی ڈاکٹر پنہاں کی اچھی سہیلی ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ دکھ سکھ میں پوری طرح ان کا ساتھ دیا ہے۔

نہ جانے کون مجھ میں جی رہا ہے — اِدھر سارے اُدھر کے مسئلے ہیں
جہانِ مرد و زن میں زن کو خود بھی — زمیں کے اور زر کے مسئلے ہیں

اس ادا پر مرا دل کیا، مری جاں بھی حاضر — آپ یوں کھنچ کے جو تلوار ہوئے بیٹھے ہیں

مشتمل میری ذات ذروں پر — ایک ترتیبِ ماہرانہ ہوں
اُس کا اثبات اور نفی اپنی — یعنی ایمانِ کافرانہ ہوں

ترے دل پر کروں اب کیا حکومت — مرا دل بھی نہیں جاگیر میری
بہت اچھا تھا سب کچھ زندگی میں — بری تھی صرف اک تقدیر میری

سب یقیں سارے شکوک — عقل و دل کی بھول، چُوک

دل کو دنیا سا بنا دے یارب! — یا مرے دل سی یہ دنیا کر دے

جنت بھی نہیں منزلِ انساں مرے آگے　　محدود نہ کر عالمِ امکاں مرے آگے
اس کو بھی تعاقب کا مرے شوق بہت تھا　　چکرائی بہت گردشِ دوراں مرے آگے

عشق اپنی ذات میں خود حسن ہے
آئنہ ہونے کا مٹی میں ہے گُن

جدید ادب خان پور کے شمارہ مارچ ۱۹۸۳ء میں شائع شدہ ڈاکٹر پنہاں کی غزل کا ایک شعر تھا:

نہ آئے چائے پہ تم، خیر، تم کو کیا معلوم　　کسی نے کتنی محبت سے اہتمام کیا

چائے اور چاؤ کی یہ باتیں زندگی کے تجربات سے کیسے گزرتی گئیں، اس کی جھلک چند نسبتاً نئے اشعار میں دیکھیں:

تھوڑی باتیں، تھوڑے شکوے، تھوڑے وعدے اور بس
ساتھ اس کے شام کی اچھی سی چائے زندگی

شام کی چائے کا وعدہ وہ اُدھر بھول گئے　　ہم اِدھر صبح سے تیار ہوئے بیٹھے ہیں
بھول جائے گا اس بار بھی صبح تک　　جو بھی وعدے کئے شام کی چائے پر
لوٹ گیا کیوں آنے والا　　کھول رہا ہے چائے کا پانی

ڈاکٹر پنہاں کی غزلوں میں ایسی بے ساختگی کا اپنا ایک الگ مزہ ہے، جہاں غم میں بے فکری نمایاں ہے۔ جیسے غم کا سامنا ہنستے کھیلتے کیے جا رہی ہیں۔

مفت مل جاتے ہیں غم اور آنسو　　مفت میں کھائے، پیئے جاتے ہیں
اب دعائیں نہ بے اثر جائیں　　موسموں سے کہو سُدھر جائیں
چل دلِ بے قرار چلتے ہیں　　چھوڑ دنیا کو یار چلتے ہیں
دردِ دل کی تھی شکایت جس کو　　اس کو سر درد کی گولی دی ہے
مرض ہے عشقِ انساں کا غزل کو　　سند ہے ڈاکٹر پنہاںؔ کی رائے
زہر ان میں ہوتا ہے، موت ان میں پلتی ہے　　زندگی کی خاطر جو ادویات لیتی ہوں

زندگی کے بہت سارے موضوعات پنہاں کی غزلوں میں موجود ہیں۔ انسانیت کی تعظیم، فرقہ پرستی و نسل پرستی کی مذمت، قتل و غارت مقامی نوعیت کا ہو یا عالمی نوعیت کا ہر دو سے بیزاری، اور انسانیت کی طرفداری۔

جنگ میں جیت ہو کسی کی بھی
ہار انسانیت کی ہوتی ہے

مختلف موضوعات کو نبھانے کے باوجود پنہاں کی غزل کا اہم ترین موضوع محبت ہے۔ وہ محبت کے سرور اور اس محبت سے ملنے والے زخموں میں چُور، سرشاری کے عالم میں محبت کا ورد کیے جا رہی ہیں۔ اس دوران اللہ تعالیٰ سے بھی بے تکلف ہو جاتی ہیں۔ اس محبت میں ان کا نسوانی روپ تو حُسن کی صورت میں نمایاں ہے لیکن کئی مقامات پر وہ حُسن کی بجائے عشق کا روپ اختیار کر لیتی ہیں۔ چاہے جانے سے زیادہ چاہنے کا مقام آ جاتا ہے، محبوبیت کی بجائے محبّ دکھائی دینے لگتی ہیں۔ شاید یہ رانجھا رانجھا کر دی نی میں آپے رانجھا ہوئی سے ملتا جلتا کوئی تجربہ ہے جو پنہاں کی غزلوں میں ایک الگ انداز سے دکھائی دیتا ہے۔ لیکن یہ ایسا موضوع ہے کہ پنہاں کی ساری غزلوں کے مطالعہ کے بعد اسی حوالے سے ایک الگ مضمون کے لکھے جانے کا تقاضا کرتا ہے۔ دیکھتے ہیں ادب کا کوئی اور قاری یہ کام کرتا ہے یا مجھے ہی کسی روز یہ فرض بھی نبھانا ہوگا۔ آخر میں ڈاکٹر پنہاں کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے ایک شعر میں میرا بھی ذکر رکھا ہے۔

سراہیں گے تری غزلوں کو پنہاں
خردمندوں میں کچھ پاگل بھی ہوں گے

میری دعا ہے کہ پنہاں اپنا شعری سفر اسی طرح جاری و ساری رکھیں اور اس نفرت بھری اندھیر نگری میں اپنی محبت آمیز شاعری کے ذریعے اپنے حصے کی شمع کو اسی طرح روشن کئے رہیں!

''ادب نامہ'' کے پچاس شمارے

روزنامہ صبح ایبٹ آباد کے ادبی ایڈیشن ''ادب نامہ'' میں میری شمولیت تو تقریباً شروع سے ہی ہوگئی تھی۔ جب برادرم احمد حسین مجاہد نے ''ادب نامہ'' کی کمانڈ سنبھالی تو ابتدائی شماروں میں ہی میرا تعاون ان کے ساتھ رہا۔لیکن غالباً شمارہ نمبر ۸ یا ۹ سے جب عامر سہیل نے یہ صفحہ ترتیب دینا شروع کیا تو میری شرکت زیادہ گھنی ہوتی گئی۔اور اب ۲۷ جون ۲۰۱۳ء کو ''ادب نامہ'' کا پچاسواں شمارہ شائع ہونے کے ساتھ اس کی ایک چھوٹی سی گولڈن جوبلی ہوگئی ہے۔سونا جتنا مہنگا ہو چکا ہے اس کی مناسبت سے چھوٹی سی گولڈن جوبلی ہی مناسب ہے۔اس مناسبت سے میرا جی چاہا کہ عامر سہیل کی اس ساری محنت کا ایک سرسری سا جائزہ لیا جائے۔تاہم بدقسمتی سے میرے پاس ''ادب نامہ'' کے پچاس شماروں کی مکمل فائل موجود نہیں ہے۔مکمل فائل ہوتی تو اسم شماری میں کوتاہی کی گنجائش نہ رہتی۔

سب سے پہلے ادب نامہ میں شائع ہونے والے شعرائے کرام کا ذکر کروں گا۔مغربی دنیا، بلاد عربیہ سے بلاد شرقیہ تک کئی ممالک کے اردو شعرائے کرام کی شعری تخلیقات ''ادب نامہ'' میں شائع ہوتی رہی ہیں۔امریکہ سے صادق باجوہ، خالد عرفان، خالد خواجہ، کینیڈا سے عبداللہ جاوید، پروین شیر، آسٹریلیا سے ڈاکٹر ریاض اکبر، نوشی گیلانی، سعید خان، ملائیشیا سے عاطر عثمانی، جرمنی سے حنیف تمنا، خالد ملک ساحل، انگلینڈ سے ڈاکٹر رضیہ اسماعیل، منصور آفاق، بلاد عربیہ سے شوکت علی ناز۔ دوحہ، قطر، شہزاد میر۔متحدہ عرب امارات، بشارت گیلانی سعودی عرب، اور انڈیا سے ڈاکٹر شہناز نبی۔کلکتہ، ترنم ریاض۔ دہلی، فہیم انور۔کولکاتا، ندا فاضلی۔بمبئی، کی تخلیقات قارئین روزنامہ صبح کے ادبی ذوق کی آبیاری کرتی رہیں۔تاہم عامر سہیل نے صرف بیرون ملک کے شعراء کو ہی اہمیت نہیں دی بلکہ اپنے علاقہ کے شعرائے کرام کو بھی بڑے پیمانے پر شائع کیا

۔اس سلسلہ میں ہزارہ کے شعرائے کرام کی ایک پوری کہکشاں جگمگاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ہزارہ کے شعراء میں ڈاکٹر محمد سفیان صفی، ارشاد شاکر اعوان، واحد سراج، صوفی عبدالرشید، سعداللہ سورج، سلطان سکون، سید علی سلمان، عنایت اللہ وسیم، اویس سویمبر، جمیل انور، کاشف بٹ، آصف ثاقب، افسر منہاس، حسن علی شاہ بخاری، محمد حنیف، پرویز ساحر، شفیق عطاری، نسیم عباسی، امتیاز الحق امتیاز، سید عبداللہ شاہ مظہر، شہزاد نیر، ڈاکٹر عاکف گمریانی، جعفر اقبال، سقراط بن عامر، جان عالم، رستم نامی، تاج الدین تاج، عبدالوحید بسمل، فیاض ترین، احمد عطاء اللہ، ضیاالرشید، اویس خالد، جمیل انور، وقتاً فوقتاً ''ادب نامہ'' میں شائع ہوتے رہے۔ہزارہ کے ان مقامی شعراء میں سے کئی شعراء پہلے ہی اپنی اہمیت سے پوری اردو دنیا کو متوجہ کر چکے ہیں، اور بعد میں آنے والے شعراء میں سے بھی کئی ایک کے ہاں وسیع امکانات صاف دکھائی دیتے ہیں۔یوں ہزارہ کی مقامیت بذاتِ خود ایک بین الاقوامیت کا اظہار کر رہی ہے۔پاکستان کے دوسرے شہروں سے بھی متعدد شعرائے کرام ''ادب نامہ'' میں چھپ کر خوشی محسوس کرتے ہیں۔اس حوالے سے یہ چند نام سامنے دکھائی دیتے ہیں۔ حسام حر۔پشاور، ڈاکٹر نذر عابد۔اٹک، کامران قمر۔کوئٹہ، نوید حیدر ہاشمی۔کوئٹہ، سید ماجد شاہ۔اسلام آباد، محمد اظہار الحق۔اسلام آباد، سیما غزل، ناصر علی سید۔پشاور، ایوب خاور۔لاہور، فرحت نواز۔رحیم یار خان، اکبر حمیدی۔اسلام آباد، واصف علی واصف، سعید شباب۔خانپور، تاجدار عادل۔کراچی، ارشد خالد۔اسلام آباد، حنا نور۔پشاور، سجاد بابر۔پشاور، اور عزیز اعجاز۔پشاور۔

۲۷ ستمبر ۲۰۱۲ء کو ''ادب نامہ'' کا نعت نمبر شائع کیا گیا۔اس نمبر میں عامر سہیل کا مضمون ''ہزارہ میں نعت کی روایت'' کلیدی مقالہ کا درجہ رکھتا ہے۔نعت گو حضرات میں ہزارہ سے عبدالوحید بسمل، امان اللہ خان امان، تاج الدین تاج، صوفی عبدالرشید، بشیر احمد سوز، کی نعتیں اور اٹک سے ڈاکٹر نذر عابد کی نعت کے ساتھ نیویارک سے تنویر پھول اور جرمنی سے میری نعتیں اس نمبر میں شائع کی گئیں۔جو یقیناً ہم سب کے لیے سعادت اور اعزاز ہے۔

کسی بھی اخبار کے ادبی ایڈیشن میں تازہ ادبی تقریبات کی اشاعت بہت اہمیت رکھتی

ہے۔''ادب نامہ''میں ہزارہ کی ادبی تنظیموں کی تقریبات کی روداد کے ساتھ ملک کے دوسرے شہروں اور دوسرے ممالک کی تقریبات کی رپورٹس شائع ہوتی رہی ہیں۔اس سلسلہ میں صرف ان تنظیموں کے نام گنوا دینا کافی ہے جن کی تقریبات کی روداد شائع ہوتی رہی ہیں۔ بزمِ علم وفن ایبٹ آباد ہزارہ،حلقہ یارانِ ادب بفہ، انجمن ترقی پسند مصنفین ہری پور، ہزارہ کانونٹ سکول مانسہرہ، نیا اسلوب ایبٹ آباد،انحراف اور اکادمی ادبیات کے اشتراک سے احمد حسین مجاہد کے اعزاز میں تقریب، عالمی فروغ اردو ادب، دوحہ،قلم کارواں حویلیاں، ادبی تنظیم مالا امریکہ، ادارہ فروغ ہندکو، پشاور، پاک بزمِ ادب قطر، معارف خان پور، آگہی انگلینڈ، سوچ۔رحیم یار خان، پنجابی ادبی بیٹھک۔رحیم یار خان، خیبر لٹریری کلب پشاور، حلقہ ارباب ذوق پشاور،، پشتو نخواہ سٹڈی سنٹر چارسدہ،۔۔۔۔۔۔۔ان ساری خبروں اور رپورٹوں سے مجلسی سطح پر اردو دنیا میں ہونے والی گہما گہمی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔انعامات واعزازات کی خبروں کے حوالے سے ہزارہ کے دانشور بشیر احمد سوز کے لیے اکادمی ادبیات اسلام آباد کے انعام سے لے کر کولکا تا ۲۴ پرگنہ کے خورشید اقبال کے لیے بہار اردو اکیڈمی کے ایوارڈ تک ساری خبریں پڑھنے کو ملتی رہیں۔ایسی خبروں کے دوش بدوش نئی کتابوں کی اشاعت اور رسائل کے نئے شماروں کی اشاعت کی خبریں بھی ادب نامہ میں آتی رہیں۔سہ ماہی شعر وسخن مانسہرہ، ماہنامہ سبق اردو، بھدوہی، انڈیا، عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد، نایاب خانپور، جدید ادب جرمنی، سہ ماہی عطاء، ڈیرہ اسماعیل خان، دستاویز دوحہ، رسائل کے ناموں اور چھپنے کے مقامات سے ان کے پھیلاؤ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

عامر سہیل کا کتابوں اور رسالوں کے ساتھ ادبی شخصیات کے تعارف پر مبنی کالم''ادب دوست''اہتمام کے ساتھ لکھا جاتا رہا اور شائع ہوتا رہا۔اس کالم کے علاوہ مختلف ومتنوع ادبی موضوعات پر اور ادبی شخصیات کے کسی ادبی زاویے پر مختلف مضامین''ادب نامہ'' میں شائع ہوتے رہے۔ان مضامین کے لکھنے والوں میں سے چند اہم نام یہاں درج کر رہا ہوں۔زاہد منیر عامر(لاہور)،محمد حنیف خان (لکھنو)، ڈاکٹر محمد سفیان صفی (ایبٹ آباد)، حیدر قریشی (جرمنی)، احمد حسین مجاہد(ایبٹ آباد)، ڈاکٹر الطاف یوسف زئی (ایبٹ آباد)، مریم آفتاب (ایبٹ آباد)،

عامر سہیل (ایبٹ آباد)، عادل سعید قریشی، سید ضمیر جعفری، ترنم ریاض (دہلی)، رشید امجد (اسلام آباد)، منشا یاد (اسلام آباد)، اختر حسین جعفری، بی بی حلیمہ بشریٰ (پشاور)، پروفیسر دل نواز عارف، مونا عامر (ایبٹ آباد)، ڈاکٹر صبیحہ خورشید (مہاراشٹر)، اور زاہد مسعود (لاہور)۔ادبی مضامین کے ساتھ ساتھ متعدد کتابوں پر مختصر تبصرے بھی تسلسل کے ساتھ شائع کیے جاتے رہے۔ البتہ مضامین اور دوسری اصناف کے مقابلہ میں افسانے اور انشائیے بہت کم شائع کیے گئے۔تاہم جو افسانے شائع کیے گئے ان میں پرانے اور نئے لکھنے والوں میں ایک توازن کو ملحوظ رکھا گیا۔ ''ادب نامہ''میں ان افسانہ نگاروں کے افسانے میری نظر سے گزرے۔ جوگندر پال (دہلی)، شموئل احمد (انڈیا)،کلیم خارجی (ایبٹ آباد)،مریم آفتاب (ایبٹ آباد)۔بی بی حلیمہ بشریٰ (پشاور)،۔انشائیوں کی شرح افسانوں سے بھی کم رہی۔اکبر حمیدی اور حیدر قریشی کا ایک ایک انشائیہ شائع ہوا۔

ادبی شخصیات یا ان کی کتاب/رسالے کے حوالے سے خصوصی تعارف میں صادق باجوہ، انور خواجہ، عبداللہ جاوید، معید رشیدی، خورشید اقبال، محمد اظہار الحق، اکبر حمیدی، ناصر عباس نیر، احمد حسین مجاہد، منشا یاد، مختار مسعود اور ارشد خالد کے نام لیے جاسکتے ہیں، جنہیں خصوصی اہمیت دی گئی۔ان ناموں کے علاوہ علامہ اقبال، میرا جی، خلیل جبران، رابندر ناتھ ٹیگور، ہرمن ہیسے، وزیر آغا، ساحر لدھیانوی، مولانا ظفر علی خان اور فیض احمد فیض جیسی اہم اور عہد ساز ادبی شخصیات کو بھی کسی نہ کسی رنگ میں عام ڈگر سے ہٹ کر''ادب نامہ''میں یاد کیا گیا۔

ادب نامہ میں شائع کیا جانے والا ایک شذرہ''ظفر اقبال غالب یا مغلوب''ایسا ہنگامہ خیز ثابت ہوا کہ اس کی بازگشت پوری اردو دنیا میں سنی گئی۔جبکہ''فیض احمد فیض اور امریکی مفادات''کے زیر عنوان تحریر ایک انکشاف کرنے کے بعد مزید انکشافات کو سامنے لانے کا امکان رکھتی ہے۔بعض سنجیدہ ترقی پسند لکھنے والوں نے اس طرف توجہ کی ہے لیکن پھر کسی انجانے خوف سے یا پھر کسی احتیاط کے باعث خاموشی اختیار کر لی ہے۔تاہم انکشاف کے امکانات پھر بھی اپنی جگہ موجود ہیں۔

مجموعی طور پر روزنامہ صبح ایبٹ آباد کے ادبی صفحہ ''ادب نامہ'' کے پچاس شمارے عامر سہیل کی محنت، لگن اور ادب سے محبت کا نتیجہ ہیں۔ عامر سہیل کے ساتھ ''ادب نامہ'' کی تزئین وترتیب میں ہمیشہ گہری دلچسپی لینے والے اسٹاف کو بھی یہ کریڈٹ جاتا ہے کہ انہوں نے ''ادب نامہ'' کو اتنا دیدہ زیب بنا دیا ہے کہ ملک کے کسی بھی بڑے اخبار کے ادبی ایڈیشن کے مقابلہ میں پورے اعتماد کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ انٹرنیٹ کی دنیا نے اور ادبی گروپس کی سہولت نے اب ''ادب نامہ'' کو بھی ایک وسیع حلقۂ قرات دے دیا ہے، چنانچہ دنیا بھر کے اردو ادیب گھر بیٹھے کمپیوٹر کے ذریعے ہر ہفتہ ''ادب نامہ'' حاصل کرتے ہیں اور اسے پڑھنے کے بعد اپنے مشوروں سے بھی نوازتے ہیں۔ مجھے ذاتی طور پر کئی دوستوں نے ادب نامہ میں چھپنے والی تحریروں کے حوالے سے اپنی آراء سے نوازا ہے، نوازتے رہتے ہیں۔ ایسے دوستوں، کرم فرماؤں کی ایک لمبی فہرست موجود ہے۔ ''ادب نامہ'' کے پچاس شماروں کی اشاعت مکمل ہونے پر میں اس کی ابتدا کرنے والے دوست احمد حسین مجاہد کو، اسے پوری لگن کے ساتھ پچاس ہفتوں کی تکمیل تک پہنچانے والے عامر سہیل کو، ''ادب نامہ'' کے تزئین کاروں کو اور ادارہ روزنامہ صبح ایبٹ آباد کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ میری دعا ہے کہ ''ادب نامہ'' کا یہ سلسلہ پچاس ہفتوں سے پچاس مہینوں اور پھر پچاس برسوں تک کا سفر طے کرتا چلا جائے۔ آمین۔

''ادب نامہ'' روزنامہ صبح ایبٹ آباد۔ ۴ جولائی ۲۰۱۳ء

ارشد خالد کا ''عکاس انٹرنیشنل'' اسلام آباد

اکتوبر ۱۹۷۸ء میں جدید ادب خان پور کا پہلا شمارہ شائع ہوا تھا۔ پھر جنوری ۱۹۷۹ء میں اس کا دوسرا شمارہ منظرِ عام پر آیا۔ اور سال ۱۹۷۹ء میں اس کے چھ شمارے شائع ہوئے۔ پھر یہ ادبی کتابی سلسلہ اپنے معمول کے مطابق شائع ہوتا رہا۔ جدید ادب کے اجرا کے وقت میں نے بہت سارے مقامی ادبی دوستوں کو ساتھ لے کر چلنا چاہا تھا۔ چنانچہ ابتدائی شماروں کی ادارتی ٹیم میں اُن دوستوں کے نام دیکھے جا سکتے ہیں۔ میں جن دوستوں کو محض دوستی کی خاطر ساتھ لے کر چل رہا تھا، ان میں سے بیشتر ''فی سبیل اللہ شریک مدیر'' دوستوں نے ''جدید ادب'' میں اپنی شرکت کو مجھ پر احسان شمار کیا۔ چنانچہ جب ایسے دوستوں سے علیحدگی ہوئی تو انہوں نے، سارے ''شریکا گروپ'' نے مل جل کر ایک رسالہ نکال کر اپنی اہمیت جتانا چاہی۔ لیکن دو شماروں کے ساتھ ہی وہ دوست اپنے رسالے سمیت اپنے انجام کو پہنچ گئے۔

مجھ میں ایک خرابی ہے کہ بار بار کے تلخ تجربات کے باوجود میں دوستوں کے وقتی طور پر ساتھ ہونے پر بھی انہیں مستقل دوست سمجھ لیتا ہوں۔ اس کا نقصان اپنی جگہ لیکن اپنے اس کسی حد تک مثبت اندازِ نظر کے باعث مجھے بعض اچھے دوست بھی نصیب ہوئے۔ ''جدید ادب'' کے اجرا کے تجربات کے دوران دو دوستوں کے ذریعے نئے ادبی کتابی سلسلوں کو شروع کرایا۔ ایک اسلوب بہاولپور۔ اس کے مدیر اظہر ادیب تھے اور معاون افتخار قیصر۔ دوسرا کتابی سلسلہ ''عکاس'' تھا جسے ارشد خالد نے رحیم یار خان کے ایک قصبہ کوٹ سمابہ سے شروع کیا۔ رسالہ پر خانپور کا نام دیا گیا لیکن کوٹ سمابہ کا حوالہ بھی شامل رہا۔ اسلوب بہاول پور کے مدیر اظہر ادیب معقول شاعر

ہونے کے باوجود ایک مستقل نوعیت کے مدیر نہ بن سکے اور افتخار قیصر اپنی ابتدا میں ہی ادبی سے زیادہ صحافیانہ مزاج اور میدان کے آدمی تھے۔ پھر اظہر ادیب اور افتخار قیصر میں نبھ بھی نہ سکی۔ سو یہ دونوں دوست اسلوب کو نہ سنبھال سکے، نہ جاری رکھ سکے۔ ان دونوں کے برعکس ارشد خالد نے ''عکاس'' کو جاری کیا تو اپنی شخصی سادگی کی طرح پوری سادہ مزاجی کے ساتھ اسے جاری کیے رکھا۔ کوٹ سمابہ سے وہاڑی اور وہاڑی سے اسلام آباد تک مقامات کی تبدیلی کے باوجود ارشد خالد نے ''عکاس'' سے اپنی محبت کو نبھائے رکھا۔

اسلام آباد آنے کے بعد ادبی کتابی سلسلہ ہونے کے باعث ایک مشکل پیدا ہوگئی۔ اسلام آباد سے کوئی اور صاحب بھی ''عکاس'' کے نام سے ادبی کتابی سلسلہ شائع کر رہے تھے۔ اس مشکل سے نمٹنے کے لیے ارشد خالد نے ''عکاس'' کو ''عکاس انٹرنیشنل'' کر دیا۔ میری طرح ارشد خالد بھی اردو کی کسی بین الاقوامیت کا پرچار کرنے سے زیادہ اردو ادب کی مقامیت کو اہمیت دیتے ہیں اس کے باوجود ''عکاس'' میں ''انٹرنیشنل'' کا اضافہ ہونے تک وہ ایک لحاظ سے انٹرنیشنل اردو رسالہ بن چکا ہے۔ ابھی تک اس کے مختلف شماروں میں پاکستان اور انڈیا کے ادیبوں کی نگارشات کے علاوہ امریکہ، کینیڈا، برطانیہ، جرمنی، فرانس، اٹلی، آسٹریلیا، سعودی عرب، عرب امارات، اور ملائیشیا میں قیام پذیر اردو شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات شائع ہو چکی ہیں۔ شائع ہوتی رہتی ہیں۔ انٹرنیٹ کی سہولت اور سوشل میڈیا میں شرکت کے باعث ارشد خالد کے لیے دور دراز کے احباب سے رابطہ کرنا پاکستانی احباب کے ساتھ رابطہ کرنے جیسا ہو گیا ہے۔ جیسے گھر بیٹھے ادبی تحریریں مہیا کر لیجئے اور پھر اطمینان سے ان میں سے اپنی پسند کی منتخب کر لیجئے۔

ارشد خالد اور ان کے ''عکاس'' کا مزید ذکر کرنے سے پہلے مجھے ایک دکھ اور ایک خوشی کا ایک ساتھ ذکر کرنا ہے۔ میں جن دوستوں کو ان کی حیثیت سے بڑھ کر ''جدید ادب'' میں اہمیت دیتا تھا اور اس کے باوجود ان کا جھگڑا اس بات پر رہتا تھا کہ مجلس ادارت میں میرا نام فلاں نام کے بعد کیوں آیا ہے؟ جب ان دوستوں نے اپنا رسالہ شروع کیا تو اس میں میری ایک غزل چھاپنا بھی گوارا نہ کیا۔ مجھے اس کا کوئی نقصان نہیں ہوا لیکن ایک دکھ ضرور رہا کہ میں نے جن لوگوں کو اتنی

اہمیت دی وہ اتنی دنیاداری دکھانے کی توفیق بھی نہ پا سکے کہ خانپور کے شاعر کے طور پر مجھے بھی اپنے رسالے میں شامل رکھتے۔ اس کی تلافی ارشد خالد نے کی اور مسلسل کیئے رکھی۔ ''عکاس'' کے پہلے شمارے سے لے کر اب تک ہر شمارے میں مجھے میری حیثیت سے زیادہ اہمیت دی گئی۔

عکاس کے پہلے شمارہ کا کچھ تفصیل سے یہاں ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ شمارہ دسمبر ۱۹۸۱ء میں منظرِ عام پر آیا۔ کتابی سائز کے کل ۸۰ صفحات تھے۔ مدیران میں ارشد خالد کے ساتھ کے ایچ درانی کا نام شامل ہے۔ مضامین کے تحت ''تلامذہ مصحفی'' (شمیم احمد)، ''انشائیہ کیا ہے'' (ڈاکٹر انور سدید)، ''ماجد الباقری کی غزلیں'' (رشید امجد)، ''آنندی'' کا تنقیدی جائزہ (شائستہ جمال)، ''نسیم سحر کی شاعری'' (محمد اکرم باجوہ) شامل کیے گئے ہیں۔ غزلوں کے پہلے حصہ میں شیر افضل جعفری۔ راسخ عرفانی، رفعت سلطان، مظفر رزمی، قیس فریدی، کرم چوہدری، پروین عزیز، اکرم باجوہ، فیاض قادری، صائم صفی، اکرام الحق سرشار، انعام بھٹنڈوی، کی تخلیقات شامل کی گئی ہیں۔ افسانوں کے حصہ میں ''میں انتظار کرتا ہوں'' (حیدر قریشی)، ''ہنستا دکھ'' (شائستہ جمال) شامل ہیں۔ نظموں میں ''کال کوٹھا'' (شیر افضل جعفری)، ''رومیو اور جیولٹ کا شکوہ'' (سحر انصاری)، ''مرے بارے میں مورخ کی چند سطریں'' (سحر انصاری) اور ''سنگِ میل'' (ارشد خالد) شامل ہیں۔ غزلوں کے دوسرے حصے میں ایوب خاور، اکبر حمیدی، زہیر کنجاہی، شہباز نقوی، غزالہ طلعت، رفعت زہرہ زیدی، حکیم شیر محمد خیال، شفیق آرزو، اسلم پرویز، ناصر حسین ناصر، خالد ندیم، مقبول شارب، حیدر قریشی اور سیما احمد کو شامل کیا گیا ہے۔ دسمبر ۱۹۸۱ء میں چھپنے والے 'عکاس' کے پہلے شمارے کے ان اردو مندرجات سے اس کی اُٹھان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی شمارے میں ''سرائیکی نامہ'' کے تحت ''فلسفہ وجودیت تے ادب'' (محمد اسماعیل احمدانی)، ''بحث ونظر'' (خورشید حسین درانی)، ''سرائیکی ادبی صورتحال'' (مظہر مسعود)، ''ہک ضروری وضاحت'' (فرحت نواز)، ''سرائیکی ادبی صورتحال'' (ارشد خالد) مضامین شائع کیے گئے۔ سرائیکی شعری حصہ میں صادق جنید ہوت کی نظم ''مندریل چندر'' جبکہ نقوی احمد پوری، قیس فریدی، فرحت نواز، ممتاز عاصم، ثاقب قریشی، کی سرائیکی غزلیں شائع

کی گئیں۔

۱۹۸۱ء میں چھپنے والے عکاس کے پہلے شمارے کے مندرجات سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ارشد خالد کس انداز اور مزاج کا پرچہ نکالنا چاہ رہے ہیں، شاعروں، ادیبوں کی عمومی شرکت کے ساتھ ان کے پرچہ کے مزاج کا حصہ بننے والے احباب پہلے شمارے سے ہی ان کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ ان احباب میں سے شیر افضل جعفری، راسخ عرفانی، اکبر حمیدی، نقوی احمد پوری، مظہر مسعود جب تک زندہ رہے ''عکاس'' میں شامل ہوتے رہے۔۔ ایوب خاور، رشید امجد، انور سدید، فرحت نواز، آج بھی ''عکاس'' میں شامل رہتے ہیں۔ بعد میں شمولیت کرنے والے ادیبوں میں ڈاکٹر وزیر آغا، صبا اکبر آبادی، منشا یاد، امین خیال، ڈاکٹر شہناز نبی، ناصر عباس نیر، ترنم ریاض، احمد ہمیش، عبداللہ جاوید، شہناز خانم عابدی، سہیل احمد صدیقی، ڈاکٹر شبیہ الحسن، محمد شفیع بلوچ، خورشید اقبال، سلیم آغا قزلباش، صادق باجوہ، حمید سہروردی، عبدالرب استاد، مظفر حنفی، تاجدار عادل، ندا فاضلی، حامد سراج، احمد حسین مجاہد، عامر سہیل، جان عالم، انور زاہدی، خالد فتح محمد، ہدایت کاشف، امین بابر، انجلا ہمیش، یاسمین طاہر سردار، جیسے ملے جلے اہم ادباء اور نئے ادبا بھی ''عکاس'' میں حلقۂ احباب کی طرح شریک ہونے لگے اور یوں ''عکاس'' کے وقار میں اضافہ کا موجب بنے۔ گاہے بگاہے ''عکاس'' میں چھپنے والوں میں بیرون برصغیر سے ڈاکٹر رضیہ اسماعیل، حمیدہ معین رضوی، ناصر نظامی، طاہر عدیم، خالد ملک ساحل، سید افتخار حیدر، پرویز مظفر، بلند اقبال، ڈاکٹر ریاض اکبر، پروین شیر، نوشی گیلانی، نیر جہاں، نصر ملک، راجہ محمد یوسف، ستیہ پال آنند، مبشر سعید، عاطر عثمانی، اور متعدد دیگر شامل ہیں۔ اردو اور پنجابی کے معروف شاعر اور ادیب امین خیال مسلسل ''عکاس انٹرنیشنل'' کے شریک مدیر ہیں، ارشد خالد کے ساتھ ان کا تعاون رسالہ کو مزید بہتر بنانے میں مفید ہوتا رہتا ہے۔ اکرام الحق سرشار بھی وقتاً فوقتاً ادارتی تعاون کر لیتے ہیں۔ یوں ان دوستوں نے مل جل کر عکاس انٹرنیشنل کو خوب سے خوب تر بنانے کا عمل جاری رکھا ہوا ہے۔ ارشد خالد نے اول روز سے اچھا لکھنے والے نئے شاعروں، ادیبوں کو اہمیت دینے کے ساتھ، معروف و ممتاز اچھے شاعروں اور ادیبوں کا قلمی تعاون حاصل کرنے کے

لیے جو طریق، کار اختیار کیا تھا، اسے مسلسل مستحکم کیا ہے۔

ارشد خالد نے ابھی تک عکاس کے تین خاص نمبر شائع کیے ہیں۔ ڈاکٹر گوپی چند نمبر، حیدر قریشی نمبر اور محرم الحرام نمبر۔ عکاس نے گوشے شائع کرنے کا سلسلہ بھی شروع کیا اور اس میں کاروباری گوشوں کے برعکس طرزِ عمل اختیار کیا۔ شمارہ نمبر ۵ (سال ۲۰۰۷) میں محرم الحرام کے حوالے سے گوشہ دیا گیا۔ شمارہ نمبر ۷ میں طاہر عدیم کا گوشہ دیا گیا۔ شمارہ نمبر ۱۰ میں ایوب خاور کا گوشہ شائع کیا گیا۔ شمارہ نمبر ۱۱ میں محمد شفیع بلوچ کا گوشہ دینے کے ساتھ رفیق خاور جسکانی کو بھی خصوصی طور پر یاد کیا گیا۔ شمارہ نمبر ۱۲ میں محمد شفیع مرحوم کا ایک اور گوشہ شائع کیا گیا اور بعد از وفات ان کی ادبی خدمات کی طرف متوجہ کیا گیا۔ شمارہ نمبر ۱۲ میں ہی ڈاکٹر بلند اقبال کے لیے ایک گوشہ مختص کیا گیا اور فرحت نواز کا خصوصی مطالعہ پیش کیا گیا۔ شمارہ نمبر ۱۳ میں یومِ عاشور کی مناسبت سے ایک گوشہ ترتیب دیا گیا۔ اس کے دوش بدوش ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ایوب خاور کے خصوصی مطالعات پیش کیے گئے۔ ''عکاس'' کے شمارہ نمبر ۱۴ میں وفیات کے زیرِ عنوان ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، ڈاکٹر صابر آفاقی، ڈاکٹر رؤف امیر اور ڈاکٹر افتخار نسیم کا خصوصی ذکرِ خیر شائع کیا گیا۔ اسی شمارہ میں میرا جی کا مطالعۂ خاص پیش کیا گیا۔ شمارہ نمبر ۱۵ میں منشا یاد، اکبر حمیدی اور ڈاکٹر شبیہہ الحسن کی وفات پر ان تینوں کے تعزیتی گوشے پیش کیے گئے۔ شمارہ نمبر ۱۷ میں ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کا بھرپور قسم کا گوشہ شائع کیا گیا۔ شمارہ نمبر ۱۸ میں ''افسانچے کا سفر'' کے عنوان سے ایک گوشہ ترتیب دیا گیا۔ اس میں پوپ کہانی کے نام سے اردو میں ایجاد کا دعویٰ کرنے والوں کا علمی اور ادبی سطح پر مدلل رد کرتے ہوئے شیخ سعدی اور خلیل جبران کی منی کہانیوں سے لے کر منٹو اور جوگندر پال کے افسانچوں تک اردو افسانچے کے سفر کو واضح کیا گیا ہے۔ اور اردو میں پوپ کہانی کی ایجاد کے مضحکہ خیز دعویٰ کی حقیقت کھول کر رکھ دی ہے۔

عکاس نے گوشوں کے علاوہ بعض شاعروں کی کافی ساری غزلیں، نظمیں ایک ساتھ شائع کرنے کا اہتمام بھی کیا ہے۔ ۱۹۸۱ء کے شمارہ میں میری ۶ غزلیں اور سیما احمد کی چار غزلیں شائع کی گئیں۔ بعد ازاں گوشوں میں شامل ڈھیر ساری شاعری کے علاوہ ان شاعروں کی کافی ساری

غزلیں/نظمیں ایک ساتھ شائع کی گئیں۔میرا جی،وزیر آغا،ایوب خاور،عبداللہ جاوید،حیدر قریشی،احمد حسین مجاہد،شہناز نبی،ترنم ریاض،صادق باجوہ،افضال نوید،حفیظ طاہر،کبیر اطہر،اظہر ادیب،منصور آفاق،فرحت نواز،راجہ یوسف خان،شبانہ یوسف،احمد اصغر راجہ،اکرام الحق سرشار، ذوالفقار علی اسد،جاوید احمد،آصف پرویز،بقا بلوچ،نجمہ شاہین،ارشد خالد۔

عکاس کے سب سے پہلے شمارہ میں ارشد خالد نے سرورق کی بیک سائڈ پر میری ایک تصویر شائع کی تھی۔اب انہوں نے ادیبوں کی تصویروں کو سرورق پر سجانا شروع کر دیا ہے۔بعض خاص تقریبات کی تصاویر کو بھی سرورق پر دیا ہے تو متعدد ادیبوں کی تصاویر بھی کسی موضوع کی مناسبت سے سرورق پر دی ہیں۔کتاب کے بیک ٹائٹل پر زیادہ تر کسی خاص حوالے سے بعض ادبی کتابوں کے ٹائٹلز دے دیئے جاتے ہیں۔یوں ادیب اور ادب دونوں کو ایک جیسی اہمیت دی جاتی ہے۔اور ''عکاس انٹرنیشنل'' بھی کسی حد تک خوش رنگ دکھائی دیتا ہے۔

ارشد خالد کی اس خوبی کا اعتراف کرنا چاہیے کہ انہوں نے ایک طرف متنازعہ مباحث کی اشاعت سے گریز نہیں کیا،دوسری طرف جب کسی تصحیح کی نوبت آئی تو نہ صرف تصحیح کی بلکہ اصلاحِ احوال کے لیے مناسب طور پر کاوش بھی کی۔کسی مدیر کا یہ طرزِ عمل ادب میں اختلافی زاویے کو ابھارنے کے ساتھ تصویر کے دوسرے رُخ کو بھی سامنے لانے کا صحت مند رویہ ہے۔اردو ماہیا کے فروغ میں بھی عکاس نے بہت مناسب کردار ادا کیا ہے۔ان کے طرزِ عمل سے اردو ماہیا کو تقویت ملی ہے۔اب ان کا ارادہ ہے کہ ماہیا کا ایک بھرپور گوشہ یا پھر ماہیا نمبر شائع کیا جائے۔ میری دعا ہے کہ وہ اس سلسلہ میں جو کچھ بھی کرنا چاہتے ہیں،اس میں کامیاب ہوں۔ آمین۔۱۹۸۱ء سے عکاس انٹرنیشنل کے ذریعے ادب کی خدمت کرنے کے باوجود ارشد خالد نے نہ کسی طرف سے رسالے پر کسی خاص تبصرے کا انتظار کیا ہے،نہ کسی سے تبصرے کے لیے اصرار کیا ہے۔نہ کبھی ادب کی خدمت کرنے کا دعویٰ کیا ہے،نہ کبھی مُڑ کر دیکھا ہے کہ کوئی داد دے رہا ہے یا نہیں۔بس ''عکاس'' کو ترتیب دیئے جا رہے ہیں اور اسی لگن میں مگن ہیں۔آج کی نسل کے رسائل کے مدیران میں سے کتنے ہیں جو ایسے درویشانہ مزاج کے ساتھ ادبی رسالہ نکالتے ہوں!۔

۱۹۸۱ء سے شروع کیے گئے ادبی کتابی سلسلہ عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد کے درویش صفت مدیر اور اپنے عزیز دوست ارشد خالد کو بتیس سال کے ادبی سفر کے اس موڑ پر سلام پیش کرتا ہوں!

اور آخر میں ادبی دنیا کو یہ خبر دینا چاہتا ہوں کہ عکاس انٹرنیشنل کتابی صورت میں چھپنے کے ساتھ انٹرنیٹ پر بھی فراہم کیا جاتا ہے۔ان دو لنکس پر عکاس کے شمارے دیکھے جا سکتے ہیں۔

http://akkas-international.blogspot.de/

http://issuu.com/akkas

عکاس انٹرنیشنل کی انٹرنیٹ پر پیش کش کے ساتھ ارشد خالد نے اب ایک انٹرنیٹ میگزین ''ادبی منظر'' کا اجراء بھی کر دیا ہے۔رنگین تصاویر سے مزین اس ادبی رسالہ نے اپنے پہلے دو شماروں سے ہی ادبی دنیا میں دھوم مچا دی ہے۔اس پر زیادہ رائے نہیں دے رہا صرف اس کا لنک پیش کر رہا ہوں۔

http://issuu.com/adabi-manzar

مطبوعہ ویب سائٹ **ہم عصر اردو**۔ڈنمارک

http://www.urduhamasr.dk/dannews/index.php?mod=article&cat=Literature&article=1258

روزنامہ **پیغام** دہلی۔۲۵/اپریل ۲۰۱۴ء

افضل چوہان کی غزلیں

افضل چوہان کے ماہیوں کا مجموعہ ''خاموش نہ ہو ماہیا'' تھوڑا عرصہ قبل شائع ہو کر ماہیا کی دنیا میں مقبول ہوا تھا۔ اب ان کی غزلوں کا مجموعہ شائع ہونے جا رہا ہے۔ ہر چند اس مجموعہ میں اکا دکا نظمیں، گیت اور ہائیکو بھی شامل کیے گئے ہیں، تاہم اس میں غزلیں اتنی زیادہ تعداد میں ہیں کہ اسے غزلوں کا مجموعہ ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ ان غزلوں کا مطالعہ کرتے ہوئے اردو غزل کی موجودہ اور عمومی صورت کا منظر واضح ہوتا ہے۔ تاہم اس عموم میں افضل چوہان کی اپنی پہچان کسی نہ کسی انداز میں سر اٹھا اٹھا کر اپنی چھب دکھلاتی ہے۔ ایک ہی غزل کے یہ اشعار دیکھیں جو غزل کے عمومی ماحول میں اپنی پہچان بناتے دکھائی دیتے ہیں۔

انتار ویا جا سکتا ہے
دامن دھویا جا سکتا ہے
لمحوں کی ترتیب بنا کر
وقت پرویا جا سکتا ہے
دھرتی ٹھنڈی پڑ جائے تو
سورج بویا جا سکتا ہے
عشق کی شدت بڑھ جانے پر
آگ پہ سویا جا سکتا ہے

چند اور غزلوں کے اشعار سے بھی اس پہچان کو ابھرتے ہوئے دیکھا جا سکتا۔

مرے اندر چھپی ہیں خانقاہیں
مرے اندر قلندر ناچتے ہیں

دھڑا دھڑ آنسوؤں کی لہر افضل
کہ خشکی پر سمندر ناچتے ہیں

پھر کھلونوں میں دل نہیں لگتا
چاند جب کھیلنے کو مل جائے

تعاقب میں کسی کی بد دعا ہے
مرے آنگن میں پتھر ناچتے ہیں

کاجل سُرما اور سیندور
اور لشکارے درپن کے
میٹھی گوند لسوڑے کی
داغ نہ اُترے جامن کے

افضل چوہان نے میرا جی کی غزلوں کی زمین میں چند غزلیں کہی ہیں اور بڑی فراخدلی کے ساتھ انہیں میرا جی کی نذر کیا ہے۔ اس عہدِ کم سواد میں ایسے لوگ بھی میرا جی کے خلاف ہرزہ سرائی کرنے پر تل جاتے ہیں جن کی اصل شعری شناخت کا ڈی این اے سیدھا میرا جی کے چند اشعار سے جا ملتا ہے۔ اور جو باقی بچتا ہے وہ محض مزاحیہ شاعری کہلاتا ہے اور مزاحیہ مشاعروں میں شرکت کا جواز فراہم کرتا ہے۔ کم ظرفی کی انتہا ہے کہ شعری ڈی این اے کی رپورٹ کا جیتا جاگتا ثبوت سامنے موجود ہوتا ہے اور اسے یکسر نظر انداز کر کے میرا جی کے خلاف زہر اگلا جاتا ہے۔ افضل چوہان نے براہِ راست میرا جی کے کسی رنگ سے فیض نہیں اُٹھایا۔ لیکن جب ان کی غزلوں کی زمین میں غزلیں کہیں تو برملا اس کا اعتراف کیا۔ یہ رویہ اردو شاعروں میں مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ افضل چوہان اس معاملہ میں ایماندار نکلے۔

میرا جی کی زمین میں کہی گئی غزلوں سے قطع نظر افضل چوہان کی غزل میں محبت کے قرینے، خوابوں کی دنیا، دنیا داری کے دکھ، ایسے وسیع تر موضوعات اپنے مختلف رنگ ڈھنگ اور انداز کے ساتھ ملتے ہیں۔ چند اشعار سے ان کی نوعیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

وہ جو ٹوٹا تو میں بھی ٹوٹ گیا
میری مرضی تھی اس کی مرضی میں
کاش ہم بھی اپیل کر لیتے
زندگی تھی بس ایک عرضی میں

کیسے کیسے جوان ٹوٹتے ہیں
سر پہ جب آسمان ٹوٹتے ہیں

خواب کو خواب تک ہی رہنے دے
اپنے سر پر اسے سوار نہ کر
یہ بھرم ہے تو پھر بھرم رکھ لے
خشک دریا ہے اس کو پار نہ کر

زمانہ جو بھی ہے اپنی بلا سے
جو ڈرنا تھا ہمیں وہ ڈر چکے ہم

کاش منظور ہو گئے ہوتے
ابنِ منصور ہو گئے ہوتے

مجھ کو میرے ہی در پہ رہنے دے
میری پگ میرے سر پہ رہنے دے

کیا ضروری ہے آنکھ میں رکھنا
اب یہ دریا بہا دیا جائے

دیئے اور طوفان کا رشتہ اردو شاعری میں ایک عرصہ سے قائم ہے۔ اچھے اچھے شاعروں نے اس ایک مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کا سماں دکھایا ہے۔ افضل چوہان نے بھی اپنے عصر کے کرب کو شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہوئے اسی بات کو اس انداز میں بیان کیا ہے۔

یہ زمانہ تو آندھیوں کا ہے
اب دیوں کو بجھا دیا جائے

جس تناظر میں افضل چوہان کا شعر سامنے آیا ہے اس کی وجہ سے یہ شعر اس مضمون کی عمومیت سے اوپر اُٹھ گیا ہے۔ تاہم مجھے اس حوالے سے اکبر حمیدی کا ایک شعر ہمیشہ زیادہ معاملہ فہم اور حقیقت افروز لگتا رہا ہے۔

ہماری جنگ اندھیروں سے ہے، ہوا سے نہیں
دیا جلا کے نہ یوں سامنے ہوا کے رکھ

افضل چوہان کی غزل میں کہیں کہیں ایسی شوخ سی بات بھی مل جاتی ہے، جو محض مزاحیہ شعر نہیں ہوتی لیکن قاری کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ضرور آ جاتی ہے۔

آج بھی سیدھے ہو نہ پائے
اپنا تھا کچھ بچپن ٹیڑھا

اسی طرح ان کی غزل میں سیدھے سادے انداز میں بھی معنی آفرینی کے جلوے دیکھے جا سکتے ہیں۔

کچھ گزری دہقانی میں
حرف کی گلہ بانی میں
بجھ کر آخر ڈوب گیا
شام کا سورج پانی میں

یہ زمانہ عظیم الشان سائنسی ترقیات کا زمانہ ہے۔ وہ سب کچھ جو ہمارے بچپن میں صرف قصے کہانیوں میں سنایا جاتا تھا، اب ایک حقیقت اور زیادہ شاندار حقیقت بن کر سامنے آتا جا رہا ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے کرۂ ارض بہت چھوٹا سا گاؤں بن کر رہ گیا ہے اور انسان تمنا کا دوسرا قدم رکھنے کے لیے سپیس ایج میں بہت آگے تک جانے والا ہے۔ لیکن تمام تر ترقیات کے باوجود یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ دنیا اس وقت ایٹمی بارود کے ڈھیر پر بیٹھی ہوئی ہے۔ خودکار نظام کی کوئی معمولی سی غلطی بھی اس ساری دنیا کو بھک سے اڑا سکتی ہے۔ افضل چوہان نے اس خطرے کا ادراک کرتے ہوئے ایٹم کی خطرناکی کی طرف متوجہ کیا ہے۔

ذرہ ہے پر ذرہ بھی تو
ایک قیامت ڈھا سکتا ہے

افضل چوہان خوابوں اور حقیقتوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے اپنی زندگی کے تجربات، مشاہدات، اپنی داخلی واردات، ان سب کو آمیز کرتے ہوئے اپنی غزل کہہ رہے ہیں۔ میں ان کی شعری کامیابیوں کے لیے دعا گو ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ان کا تخلیقی سفر زندگی بھر جاری رہے گا۔ ''شام کا سورج'' ان کا تخلیقی پڑاؤ ہے۔ اس کی اشاعت پر انہیں مبارکباد دیتے ہوئے میں ان کے اگلے سفر کی طرف پیش قدمی کا منتظر ہوں اور اگلے سفر میں ان کا کھلے بازوؤں سے استقبال کرتا ہوں!

طاہرہ شمیم حسین کا ناول
جہنم کے اس پار

طاہرہ شمیم حسین کا ناول ''جہنم کے اس پار'' برادرم نصر ملک کے توسط سے ملا تو میں کچھ دیر کے لیے الجھن میں پڑ گیا۔ کسی خاتون کا لکھا ہوا ناول ہے اور خواتین کے مقبول ناولوں کے انداز میں ہی لکھا گیا ہوگا۔ اسی تاثر کے ساتھ میں نے اس کا مطالعہ شروع کیا۔ اور ہر آن میرے اس تاثر کی توثیق ہوتی گئی۔ خواتین کے مقبول رسائل میں چھپنے والے خواتین کے افسانوں اور ناولوں والے اندازِ بیان کو اختیار کرتے ہوئے طاہرہ شمیم حسین نے شمونہ کی دکھ بھری اور جذباتی داستان بیان کرنا شروع کی۔ مشرقی مرد کی سفاک بالا دستی اور عورت کی مظلومیت کی داستان کو طاہرہ شمیم حسین نے اپنے آنسوؤں سے گوندھ کر لکھا ہے۔ کہیں کہیں جب آنسوؤں کا پانی زیادہ ہو جاتا ہے تو کہانی کوئی واضح نقش و نگار ظاہر کرنے کی بجائے اصلاحی مضمون کا انداز اختیار کر لیتی ہے۔ لیکن پھر اسی مضمون نگاری میں سے زندگی کی کرب ناک داستان نمودار ہوتی ہے اور زندگی آگے کی طرف بڑھنے لگتی ہے۔

ڈنمارک جیسے مغربی دنیا کے ترقی یافتہ ملک میں آ کر بھی جو لوگ اپنی روایات اور ثقافت کے نام پر گھریلو تشدد پر قائم رہنا چاہتے ہیں، ان کے کردار اور شخصیت پر افسوس ہوتا ہے۔ شمونہ ایسی لڑکی ہے جو لگ بھگ بیس برس کی عمر میں بیاہ دی گئی۔ پھر قسمت نے یاوری کی اور اپنے شوہر کے ساتھ ڈنمارک آ گئی۔ خدا نے ان کو دو بیٹوں اور ایک بیٹی سے نوازا۔ شوہر عام دنیا کے لیے بہت مہذب اور شائستہ انسان تھا۔ اس کی سماجی سرگرمیاں بھی لائقِ تحسین تھیں لیکن بیوی کے معاملہ میں وہ اول روز سے ہی ایک ظالم شوہر رہا۔ بات بات پر بیوی کی اہانت کرنا، گالی گلوچ سے

لے کر مار پیٹ تک، ہر زیادتی کر گزرنا۔شمونہ یہ سب کچھ سہتی رہی اور زندگی سے نباہ کرتی رہی۔خاوند کی طرف سے جاہل ہونے کی گالی کا اس نے یہ جواب دیا کہ ڈنمارک جیسے ملک میں اسکول ٹیچر کی جاب حاصل کر کے دکھا دی۔اپنے بچوں کی ایسی تربیت کی کہ گھر کے تکلیف دہ ماحول کے باوجود بچوں کی زندگیوں میں ایک توازن قائم کر دیا۔سب کی تعلیم بھی مکمل کرائی اور انہیں اپنے پیروں پر بھی کھڑا کر دیا۔جس گھر سے شمونہ کو نکلنا پڑا تھا،اسے بھی قانونی اور باوقار طریقے سے حاصل کر دکھایا۔

لیکن شمونہ کی کہانی اتنی مختصر اور اتنی سادہ نہیں ہے۔ازدواجی زندگی کے تیس برسوں میں اور ڈنمارک جیسے ملک میں رہتے ہوئے شمونہ نے شوہر کے ظلم وستم اور تشدد کو نہایت صبر واستقلال کے ساتھ برداشت کیا۔ڈنمارک جیسے ملک میں جہاں پولیس کو ایک کال کرنے سے ایسے شوہر کو حوالات کی سیر کرانا بے حد آسان ہے،شمونہ کا مسلسل صبر اور قوت برداشت حیران کن ہے۔اس دوران مختلف اوقات میں جب شوہر کی طرف سے زیادتی میں ناقابلِ برداشت اضافہ ہو جاتا شمونہ نے تین بار ناراض ہو کر گھر چھوڑا لیکن ہر بار بچوں کی خاطر واپس چلی آئی۔لیکن آخری بار گھر چھوڑنے کا فیصلہ حتمی بن گیا۔شمونہ نے سرکاری تحفظ گاہ ''عورت گھر'' میں قیام اختیار کیا۔تینوں بچے جو اَب بالغ ہو چکے تھے،پوری طرح اپنی والدہ کے ساتھ تھے۔بچے روزانہ اپنی والدہ سے ملنے کے لیے ''عورت گھر'' جاتے۔یہ ایک جملہ شمونہ اور اس کے نوجوان بچوں کی نفسی کیفیات کا احاطہ نہیں کر سکتا۔اس مقام تک آتے آتے طاہرہ شمیم حسین کے قلم میں سچ مچ دردانگیز جادو پیدا ہو گیا ہے۔شمونہ نے ''عورت گھر'' میں پہلی رات کیسے گزاری؟ اور پھر پورا سال کیسے گزرا؟ بچوں کی نفسی کیفیات کیا تھیں؟ ماں کا ساتھ دینے کے باوجود ماں کا گھر ٹوٹنے اور ماں کی حالت پر پریشان اور سراسیمہ بچوں کی نفسیات ہر طرح کے قاری کو اداس اور بے چین کر دیتی ہے۔میں خود اس حصہ سے اختتام تک اتنا محو ہو کر رہ گیا کہ شمونہ اور اس کے سارے بچوں کا کرب جیسے میرے اپنے اندر درد بھر گیا۔پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ رات کو نیند آجانے سے پہلے تک میں اپنی بیوی کے ساتھ اس ناول کو اور بالخصوص شمونہ کے ''عورت گھر'' میں قیام کے دورانیہ والے احساسات

اور بچوں کی نفسی کیفیات کو ڈسکس کرتا رہا۔اس کرب انگیز حصہ میں ایک دو بار تو مجھے اپنا دَم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ اس حصہ میں طاہرہ شمیم حسین واقعتاً ایک عمدہ اور شاندار ادیبہ دکھائی دینے لگتی ہیں۔

یہاں ناول کے مختلف مقامات سے چند اقتباس اس لیے پیش کر دیتا ہوں کہ ان کے ذریعے طاہرہ شمیم حسین کے طرزِ نگارش اور ناول کی عمومی فضا کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

''وہ رات اس پر بہت ہی بھاری تھی۔اس کا بیٹا اپنے بستر پر نہیں سویا تھا۔اس رات وہ ایک دفعہ پھر مر گئی۔اپنی شادی شدہ زندگی میں نہ جانے وہ کتنی دفعہ مری تھی اور اب نجانے یہ کونسی باری تھی۔'' **(صفحہ نمبر ۱۱)**

''اب شمونہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔اُسے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کے سامنے اُس کی ڈاکٹر کے بجائے اماں جی بیٹھی ہیں اُس کی ماں جو شمونہ کو پانی کا لوٹا اٹھائے ہوئے بھی دیکھتیں تو سوچتیں کہ کیا یہ بوجھ شمونہ اٹھا سکے گی۔یہ تو اس سے کیسے اٹھے گا۔وہ اسے کیسے اٹھائے گی۔اُس نے اپنی بیٹی کو اتنے لاڈوں سے پالا تھا۔'' **(صفحہ نمبر ۱۶۹)**

اور یہ ''عورت گھر'' میں پہلی بار ماں، بیٹے کے پہنچنے کا منظر ہے۔

''ابھی شمونہ بیڈ پر بیٹھنے ہی لگی تھی کہ فہد نے بے اختیار ماں کو گلے سے لگا کر بے اختیار رونا شروع کر دیا اور اپنی ماں کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں لیتے ہوئے کہنے لگا ''امی میں آپ کو زیادہ دیر یہاں رہنے نہیں دوں گا.....امی.....آپ یہاں..... یہاں اس اتنے چھوٹے سے ویران کمرے میں.....اکیلی.....نہیں امی.....میرے ایک دوست کے پاس بڑا گھر ہے.....میں کل ہی اُس سے بات کروں گا۔میں کل ہی آپ کو یہاں سے لے جاؤں گا.....میری ماں.....میری پیاری ماں.....یہ جگہ آپ کے رہنے کے قابل نہیں ہے۔''.....اُس نے ماں کے ہاتھوں کو بے اختیار چومنا شروع کر دیا.....شمونہ بھی اب اپنی دھاڑوں پر قابو نہ پا سکی۔ہزار کوشش کے باوجود وہ اپنے سینے میں گھٹی ہوئی چیخوں کو نہ روک سکی۔'' **(صفحہ نمبر ۱۷۵)**

اور پھر ''عورت گھر'' سے بیٹے کے چلے جانے کے بعد شمونہ کی پہلی رات کی حالت دیکھیں:

''شمونہ کو ایسے لگا جیسے یک لخت کسی نے اُس کے پاؤں تلے کی زمین کھینچ لی ہو اور وہ نیچے

ہی نیچے گہری اندھی کھائی میں گرتی چلی جارہی ہو۔ایسی کھائی جس کا کوئی پیندانہیں۔ایک ایسی اندھی غار جس کی تہہ ہی نہیں۔وہ نیچےاور نیچےلڑکھڑائی چلی جارہی ہے۔اُسے اپناوجود ہوامیں معلق گہرائی کی طرف گرتا ہوامحسوس ہورہا تھا اور وہ ہوامیں ہاتھ پاؤں مارتی جارہی تھی۔اب بھی وہ ہوا میں ہاتھ پاؤں مارتی جارہی تھی۔ وہ اپنے آپ کو ہر حال میں نیچے گرنے سے بچانے کی جدوجہد میں تھی۔۔۔'' **(صفحہ نمبر ۱۷۷)**

تیس سالہ تکلیف دہ زندگی گزارنے کے بعد میاں بیوی میں علیحدگی کی یہ داستان ایسے شوہروں کے لیے عبرت کا باعث بن سکتی ہے، جو اپنی نام نہاد مشرقی روایات اور ثقافت کی آڑ لے کر بیویوں پر ظلم، زیادتی اور تشدد کرتے ہیں۔ بہت سے مرد حضرات شمونہ کے شوہر کے انجام سے سبق سیکھ سکتے ہیں۔اسی طرح بہت سی خواتین اپنی ازدواجی زندگی کے تیس سال ضائع کیے بغیر شمونہ کی زندگی کی کہانی کو مشعلِ راہ بنا سکتی ہیں۔

یہ ناول قلم برداشتہ لکھا گیا ہے اور عجلت میں شائع کیا گیا ہے۔اس لیے اس میں کمپوزنگ کی بہت ساری اغلاط راہ پا گئی ہیں۔ان اغلاط کو ٹھیک کرلیا جائے،اسی طرح شروع کے حصہ میں اگر کچھ ایڈیٹنگ کر لی جائے اور اس ناول کا نیا ایڈیشن شائع کیا جائے تو یہ محض خواتین کے لیے لکھنے والے رسالوں کا ناول نہیں رہے گا بلکہ ایک عمدہ ادبی فن پارہ بھی بن جائے گا۔فی الحال بھی نصر ملک کی اس بات میں کوئی شک نہیں کہ یہ ڈنمارک سے کسی خاتون کا اردو کا پہلا ناول ہے۔طاہرہ شمیم حسین نے اسکنڈے نیویا کی اردو دنیا میں اردو فکشن کی خواتین پر، ناول نگاری کے حوالے سے پہلے ہلے میں ہی اپنی بالا دستی قائم کر لی ہے۔یورپ بھر میں خواتین کے اردو کے جو گنتی کے چند ناول آئے ہیں،ان میں بھی یہ ناول اپنے موضوع کے اعتبار سے دوسرے ناولوں پر فوقیت رکھتا ہے۔یہ کوئی معمولی اعزاز نہیں ہے۔

طاہرہ شمیم حسین اس کے لیے مبارک باد کی مستحق ہیں۔

میرے ادبی کام پر ہونے والے

جامعات کے کام پر ایک نظر

بعض ادیبوں پر یونیورسٹی سطح کا کام ہوتا ہے تو وہ اس کے معاملہ میں اپنی دکھاوے کی عدم دلچسپی اور بے نیازی کا تاثر ظاہر کرتے ہیں۔حالانکہ ایسے ''بے نیاز'' ادیبوں میں سے اکثر نے پورے جوڑ توڑ سے کام لے کر اور اپنی پبلک ریلیشننگ سے پوری طرح کام لے کر خود پر کام کرانے کے پروجیکٹ منظور کرائے ہوتے ہیں۔ادلے بدلے کی تحقیق بھی رواج پا چکی ہے۔اعلیٰ تعلیمی درسگاہوں سے وابستہ بیشتر ادیبوں نے ایک جامعہ میں اپنے بارے میں تحقیقی کام کرانے کے بدلے میں دوسرے ادیب کے بارے میں اپنی نگرانی میں تحقیقی پراجیکٹ شروع کرادیا۔اس حقیقت کو ظاہر کرنے کے ساتھ یہ اعتراف کرنا بھی ضروری ہے کہ ادلے بدلے کے ایسے تحقیقی کاموں میں اختیار و اقتدار کے کھیل کے باوجود بعض کام واقعتاً اپنا علمی اور ادبی استحقاق رکھتے ہیں۔علم اور تحقیق کے نام پر یہ سلسلہ پاکستان اور ہندوستان میں یکساں طور پر چل رہا ہے۔ جامعات میں منفی علمی اور تحقیقی ماحول کے ساتھ متعدد ایسے علمی اور تحقیقی پروجیکٹس بھی ہیں جو کسی قسم کے جوڑ توڑ کے بغیر خالصتاً علمی اور ادبی بنیادوں پر شروع اور مکمل کیے گئے۔گویا ہماری جامعات میں منفی اور مثبت دونوں طرح کے کام چل رہے ہیں۔

میرے ادبی کام پر ہونیوالے تحقیقی کام میں تین پروجیکٹس میرے لیے بہت ہی خاص ہیں اور ان تینوں کی اپنی اپنی الگ روداد ہے۔سال ۲۰۰۰ میں جب لندن کے ادبی مافیا نے ڈاکٹر پرویز پروازی اور جمیل الرحمٰن جیسے کرم فرماؤں کے اشتراک سے میرے خلاف گم نام مراسلہ بازی

کی غلیظ مہم چلائی تو ان سب کے نام ظاہر کرنے کے بعد میں وقتی طور پر ادبی دنیا سے ہی کنارا کر چکا تھا۔عزت و وقار کی علامت باور کرائے جانے والے مذکورہ بالا دونوں کرم فرماؤں کو اخلاقیات اور تہذیب کے حوالے سے ذلت اور ضلالت کے جس گڑھے میں گرا ہوا دیکھ لیا تھا،اس کے بعد وقتی طور پر ادب سے ہی دل اچاٹ ہو گیا۔

میں اپنی ذہنی اذیت میں مبتلا ادبی دنیا سے الگ تھلگ پڑا ہوا تھا جب اچانک خبر ملی کہ اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور سے ایک طالبہ منزہ یاسمین میرے ادبی کام پر ایم اے اردو کا مقالہ لکھنے جا رہی ہیں۔ایسے لگا جیسے خدا نے یار لوگوں کی ناجائز زیادتی کو سہہ جانے کے اجر کے طور پر یہ خوشی کی خبر عطا کی ہے۔یہ مقالہ بروقت مکمل کر لیا گیا اور اسے کتابی صورت میں بھی شائع کر دیا گیا۔میں منزہ یاسمین،ان کے نگران پروفیسر ڈاکٹر شفیق احمد،منزہ کے والد ڈاکٹر انور صابر اور اپنے پرانے دوست ڈاکٹر نذر خلیق سب کا شکر گزار ہوں کہ ان سب کی علمی و ادبی محبت کے نتیجہ میں جامعات کی سطح پر میرے ادبی کام کا پہلا تحقیقی مطالعہ مکمل کیا گیا۔اس تحقیقی کام کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ میں ادبی طور پر پھر سے متحرک ہو گیا۔اس کے تھوڑا عرصہ بعد میں نہ صرف تخلیقی طور پر فعال ہوا بلکہ مجھے 'جدید ادب' کے تیسرے اور سب سے کامیاب دور کا آغاز کرنے کی توفیق بھی ملی۔تب میں نے ایک مضمون لکھا تھا،''منزہ یاسمین کا مقالہ:چند وضاحتیں''اس میں کتابت کی بعض اغلاط کی طرف توجہ دلائی تھی جن کے باعث تحقیقی امور میں خرابی کا اندیشہ ہو سکتا تھا۔میں نے اسی مضمون میں یہ اقرار کیا:

''میرے ادبی کام کے بارے میں عزیزی منزہ یاسمین نے اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور سے سال 2000 تا 2002ء کے سیشن میں ایم اے کا تحقیقی مقالہ لکھا تھا۔میرے لیے یہ مقالہ کئی لحاظ سے خوشی اور اہمیت کا موجب ہے۔ایک یہ کہ میرے بارے میں یونیورسٹی لیول کا یہ پہلا کام ہوا ہے۔ایک اور یہ کہ اس کا تحقیقی اور علمی معیار اتنا عمدہ ہے کہ میرے دیکھے ہوئے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے کئی مقالات سے بہتر ہے۔''

(بحوالہ کتاب ''تاثرات''ص ۱۲۱۔کتاب ہذا ص ۳۴۱)

اس دوران ہندوستان کی ریاست کرناٹک کے شہر گلبرگہ سے عبدالرب استاد نے رابطہ قائم کیا۔وہ مغربی دنیا میں اردو افسانے کے موضوع پر پی ایچ ڈی کرنے جا رہے تھے اور اس سلسلہ میں مجھ سے امدادی مواد کے متمنی تھے۔میرے پاس جتنا میٹر موجود تھا،میں نے انہیں فراہم کر دیا۔کوئی سال بھر کے وقفہ کے بعد پھر ان کی طرف سے اطلاع ملی کہ وہ پہلے موضوع کو چھوڑ کر کسی اور موضوع پر کام کرنا چاہ رہے ہیں۔تب مجھے یہ بات معلوم نہ تھی لیکن اب معلوم ہوئی ہے کہ چونکہ عبدالرب استاد میری طرح متعدد دیگر افسانہ نگاروں سے بھی رابطہ میں تھے۔سوجرمنی کے منیرالدین احمد سے بھی ان کی مراسلت تھی۔منیرالدین احمد،ڈاکٹر پرویز پروازی کے پھوپی زاد بھائی ہیں۔منیرالدین احمد نے عبدالرب استاد کو مشورہ دیا کہ مغربی دنیا میں اردو افسانے کا کام بہت بکھرا ہوا ہے،اسے سمیٹنے میں بہت وقت لگ جائے گا۔یہاں تک ان کا مشورہ بڑی حد تک مناسب تھا۔اس کے بعد انہوں نے مزید مشورہ دیا کہ مغربی دنیا سے کسی ایک افسانہ نگار کو منتخب کر کے اس کے پورے کام پر پی ایچ ڈی کریں۔اس مزید مشورہ میں انہوں نے یہ اضافہ بھی کیا کہ اپنا اسمِ گرامی خود انہیں تجویز کر دیا کہ منیرالدین احمد کے ادبی کام کو موضوع بنا سکتے ہیں۔

عبدالرب استاد نے جو تب گلبرگہ یونیورسٹی میں اردو کے لیکچرر تھے،اس مشورے کی روح کو گرہ سے باندھ لیا،البتہ ان کے تحقیقی کام کے لیے کون سا ادیب بہتر ہے؟اس پر انہوں نے از خود غور شروع کیا۔متعدد ناموں کی لسٹ کو مختصر کرتے کرتے قرعۂ فال میرے نام نکل آیا۔حمید سہروردی ان کے نگران مقرر ہوئے۔''حیدر قریشی شخصیت اور ادبی جہات''موضوع طے پایا اور یونیورسٹی کی جانب سے باضابطہ طور پر منظور ہو گیا۔مجھے جب اس خبر سے آگاہ کیا گیا،میں اپنی عادت کے مطابق حیران بھی ہوا اور بہت زیادہ خوش بھی ہوا۔اللہ کا شکر بھی ادا کیا کہ وہ جب دینا چاہے تو کیسے کیسے مشکل یا ناممکن قسم کے رستوں سے بھی عطا کر دیتا ہے۔اپنی ساری کتابیں فراہم کرنا میرے لیے مشکل نہ تھا،سو اپنی کتابیں انہیں فراہم کر دیں۔خود پر ہونے والے کام کا مواد بھی فراہم کر دیا۔۲۰۰۸ء میں یہ کام مکمل ہو جانے کی امید تھی۔لیکن اسی سال کے وسط میں یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی کسی داخلی سیاست کے نتیجہ میں عبدالرب استاد کے تحقیقی پروجیکٹ کے خلاف مہم

شروع کر دی گئی۔اس سیاسی مقصد کے حصول کا سب سے آسان ہدف یہ بن گیا کہ عبدالرب استاد اور حیدر قریشی دونوں ہم مسلک ہیں اور یہ اپنے مسلک کی تبلیغ کے لیے پی ایچ ڈی کی جا رہی ہے۔اس مہم میں اس حد تک اشتعال انگیزی سے کام لیا گیا کہ یونیورسٹی میں باقاعدہ جلوس نکالا گیا اور سیکولر بھارت کی ایک یونیورسٹی میں ایک تحقیقی پروجیکٹ کو محض اس اشتعال انگیزی کی بنیاد پر روک لیا گیا کہ ریسرچ اسکالر اور ریسرچ کا موضوع بننے والا دونوں افراد ہم مسلک ہیں۔اس طرزِ عمل سے پھر یہ اصول وضع ہوتا ہے کہ کسی بھی مذہب اور مسلک کا کوئی فرد اپنے ہم مسلک کسی فرد پر کوئی تحقیقی کام نہیں کرسکتا، چاہے وہ علمی اور ادبی طور پر کتنا ہی حق کیوں نہ رکھتا ہو۔

اس سلسلہ میں یہاں اپنے مسلک اور اپنی جماعت کے تعلق سے دو تین وضاحتیں کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔پہلی یہ کہ جب عبدالرب استاد سے میرا ابتدائی رابطہ ہوا، تب دونوں کو ہی ایک دوسرے کے معتقدات کا کوئی علم نہ تھا۔رابطہ کی نوعیت خالصتاً علمی و ادبی تھی۔کافی بعد میں جا کر یہ بات سامنے آئی کہ اتفاق سے ہم دونوں ایک ہی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔

دوسری وضاحت جو نہ اپنی جماعت سے کسی نوعیت کا شکوہ ہے اور نہ ہی عامتہ المسلمین سے کسی ہمدردی کے حصول کی غرض ہے، لیکن اس کا اظہار اس پورے واقعاتی تناظر میں کر دیا جانا اب ضروری لگتا ہے۔باسٹھ سال کی مجموعی عمر میں اور لگ بھگ چالیس سال کی ادبی عمر میں میری جماعت کے کسی قومی یا بین الاقوامی مشاعرے یا ادبی پروگرام میں مجھے کبھی مدعو نہیں کیا گیا اور نہ ہی مجھے کبھی جماعت کے ٹی وی کے کسی فنکشن یا پروگرام میں بلایا گیا ہے۔اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ میری ادبی کارکردگی کی میری اپنی جماعت میں کیا حیثیت ہے۔اس لحاظ سے میرے ادبی کام کو محض ایک مسلک کے حوالے سے دیکھنا کتنا بامعنی رہ جاتا ہے؟ یہ الزام تراشی کرنے والے اور جلوس نکالنے اور نکلوانے حضرات کے لیے غور طلب ہے۔

تیسری وضاحت یہ کہ جماعت سے تعلق رکھنے والے ادبی دنیا سے جڑے ہوئے بیشتر شاعر اور ادیب اکثر مجھ سے بالکل لاتعلق ہیں۔،عبیداللہ علیم، رشید قیصرانی، صابر ظفر، مضطر عارفی، طاہر عارف، داؤد طاہر، ڈاکٹر پرویز پروازی، جمیل الرحمٰن، ۔۔۔نہ صرف یہ لوگ مجھ سے لاتعلق ہیں

بلکہ ان میں سے بعض میرے خلاف زہریلے پروپیگنڈہ کی مہم میں شریک رہے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ جب میرے ادبی کام پر پی ایچ ڈی کا پروجیکٹ مکمل ہو کر منظور ہوا تو ان میں سے جو زندہ موجود ہیں، ان سب کو سانپ سونگھ گیا۔جماعت کی سو سال کی تاریخ میں جماعت سے تعلق رکھنے والے کسی بھی زندہ شاعر اور ادیب پر یہ پہلا پی ایچ ڈی کا پروجیکٹ تھا جو مکمل ہوا تھا لیکن اس پر ان میں سے زندہ موجود ادیبوں میں سے کسی کو رسمی مبارک باد کہنے کی توفیق بھی نہ ملی۔

گلبرگہ یونیورسٹی میں ہنگامہ ۲۰۰۸ء کے وسط میں کرایا گیا جبکہ میں نے ۲۰۰۶ء کے اواخر میں اپنی یادوں کے ایک باب میں مذہبی انتہا پسندوں کے بارے میں احتیاط کے ساتھ اپنی عمومی رائے کا اظہار کیا تھا جو جنوری ۲۰۰۷ء کے جدید ادب میں شائع کر دیا تھا۔اس رائے کو یہاں دہرا دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

''اس وقت دنیا کو مذہبی انتہا پسندی سے شدید خطرات لاحق ہیں۔کسی ایک مذہب یا مسلک کو قصوروار کہے بغیر میرے نزدیک ہر مسلک اور مذہب کے انتہا پسند انسانیت کے لئے شدید خطرہ ہیں۔میرے ذاتی خیال کے مطابق ہر مسلک اور مذہب کے پاس کچھ ایسی بنیادیں ہوتی ہیں جن پر وہ باقاعدہ قائم اور استوار ہوتا ہے۔اسی لئے اس کے پیروکاروں کے لئے اس پر کاربند رہنے کا کچھ جواز بنتا ہے۔اسی طرح ہر مذہب اور مسلک میں کچھ ایسے کمزور پہلو بھی ہوتے ہیں جن کی بنیاد پر ان پر مدلل اعتراض وارد ہوتے ہیں۔بس جہاں ایسے اعتراضات میں شدت آتی ہے وہیں دوسرے مذاہب کے لوگوں کو بھی اپنے مخالف کے کمزور پہلوؤں پر حملہ کرنے کا موقعہ مل جاتا ہے۔یوں مذہبی نفرتیں بڑھتی ہیں۔عمومی طور پر ہمارے تہذیبی اور ثقافتی میلان کے ساتھ ہمارا نفسیاتی میلان ہمیں کسی مسلک پر کاربند رکھتا ہے۔یا پھر بھیڑ چال کا نسل در نسل رویہ بھی ہمیں ہانکتا ہے۔یوں کوئی انتہائی جذباتی اور مشتعل قسم کا سچا مومن اگر کسی مسیحی، یہودی، ہندو یا سکھ گھرانے میں پیدا ہوتا تو وہاں بھی وہ اتنا ہی مخلص، سچا، کھرا، جذباتی اور مشتعل قسم کا مسیحی، یہودی، ہندو یا سکھ ہوتا۔میں ہر مذہب کے اس قسم کے مومنین کا احترام بھی کرتا ہوں اور ان سے ڈرتا بھی ہوں اور ہر سال اکبر حمیدی کے الفاظ میں دعا کرتا ہوں:

یارب العالمین! ترے لطف سے رہیں
محفوظ ''مومنین'' سے ''کفار'' اس برس

(**کھٹی میٹھی یادیں** کے باب: **رہے نام اللہ کا!**' سے اقتباس۔
بحوالہ **جدید ادب جرمنی**۔شمارہ: جنوری تا جون ۲۰۰۷ء)

ادبی طور پر میں کسی مسلک، مذہب یا نظریے کا پروپیگنڈہ کرنے کو کبھی بھی مستحسن نہیں سمجھتا۔یہی میرا ادبی مسلک ہے۔کاش جماعت کے حوالے سے مجھ پر حملہ کرنے والوں اور حملہ کرانے والوں نے مجھے پڑھ کر میرے خلاف کوئی فیصلہ لیا ہوتا۔بہرحال یہ معاملہ پانچ سال تک معلق رہا اور بالآخر پانچ سال کی تاخیر کے بعد جون ۲۰۱۳ء میں عبدالرب استاد کے تحقیقی کام پر انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری دے دی گئی۔

سال ۲۰۱۳ء جہاں پی ایچ ڈی کے پروجیکٹ کی تکمیل کا سال ثابت ہوا وہیں اسی سال حیران کن حد تک یونیورسٹی سطح کے چار نئے پروجیکٹ سامنے آئے۔یہ چاروں پاکستان اور انڈیا کی یونیورسٹیوں سے ایم فل کے نئے پروجیکٹ ہیں۔ان میں سے کلکتہ یونیورسٹی سے انجم آراء کو ۲۹ نومبر ۲۰۱۳ء کو ایم فل کی ڈگری دی گئی۔ان کے مقالہ کا موضوع تھا: ''حیدر قریشی: حیات اور ادبی خدمات''۔پروفیسر شہناز نبی کی نگرانی میں یہ مقالہ مکمل کیا گیا۔ایک لحاظ سے اس کام نے اُس داغ کو دھونے کی کاوش کی جو گلبرگہ میں ڈاکٹر عبدالرب استاد کی ذاتی مخالفت میں بعض نادانوں نے ہند کی علمی و ادبی ساکھ پر لگا دیا تھا۔انجم آراء کے ایم فل کے مقالہ سے یقیناً اُس زیادتی کی بالواسطہ طور پر تلافی ہوئی ہے۔

دوسری طرف پاکستان میں ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ، سے ایبٹ آباد کے معروف نقاد اور شاعر عامر سہیل نے ۲۰۱۴ء میں ''حیدر قریشی کی ادبی خدمات'' کے موضوع پر ایم فل کر لیا ہے۔ڈاکٹر الطاف یوسفزئی ان کے نگران تھے۔عامر سہیل نے یہ مقالہ بڑی محنت اور عرق ریزی کے ساتھ مکمل کیا ہے۔عامر سہیل کا ایم فل کا مقالہ علمی، ادبی، تحقیقی و تنقیدی ہر زاویے سے ایک بھرپور مقالہ ہے۔عامر سہیل نے اپنی ساری ادبی عمر کا تجربہ اور ریاضت بروئے کار لا کر ایم فل کے اپنے

مقالہ کو روایتی کام نہیں رہنے دیا۔یہ اس نوعیت کا کام ہوا ہے کہ اگر کسی کو بعد میں میرے ادبی کام پر کسی اور زاویے سے تحقیقی کام کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو عامر سہیل کا مقالہ اس تحقیق میں شاید سب سے زیادہ معاون اور مددگار ثابت ہوگا۔تاہم یہاں مجھے ایک خوشی اور ایک تاسف کا اظہار کرنا ہے۔منزہ یاسمین کا ایم اے کا مقالہ اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور سے مکمل کیا گیا۔خانپور اور رحیم یار خان کی علاقائی نسبت سے بھاولپور میرا آبائی علاقہ ہے۔یہاں سے ایسا کام ہونا میرے لیے خوشی کا موجب ہے۔اسی طرح پاکستان کو چھوڑنے سے پہلے میرا آخری پڑاؤ ایبٹ آباد میں تھا۔میں یہیں ایک تعلیمی ادارہ میں اردو پڑھا رہا تھا، اس مناسبت سے اب ایبٹ آباد کے ایک ادیب عامر سہیل کا ہزارہ یونیورسٹی سے میرے کام پر ایم فل کرنا بھی میرے لیے از حد خوشی کا موجب ہے۔یہ خوشی اس لحاظ سے بہت زیادہ ہو جاتی ہے کہ جنوبی پنجاب میں بھاولپور کا پورا علاقہ میرے مسلک کے لوگوں کے لیے خاصا مشکل علاقہ ہے، جبکہ اسامہ بن لادن کے حوالے سے ایبٹ آباد کی عالمی شہرت اس کی پہچان بن چکی ہے۔بظاہر ایسے سنگلاخ علاقوں کی یونیورسٹیوں سے میرے ادبی کام پر تحقیقی کام کیے گئے اور کسی کونے سے کوئی اعتراض نہ کیا گیا کہ یہ کام کس مسلک کے ادیب پر ہونے جا رہا ہے؟۔حالانکہ دونوں علاقوں میں میری مسلکی شناخت بڑی واضح تھی۔اس سے فرقہ پرستی میں اَٹے ہوئے وطنِ عزیز پاکستان کی تشویشناک حالت کے باوجود یہاں کی بعض اعلیٰ درسگاہوں میں پائی جانے والی غیر جانبداری اور رواداری کا تھوڑا بہت اندازہ کیا جا سکتا ہے۔اس کے برعکس انڈیا جیسے سیکولر ملک کی گلبرگہ یونیورسٹی میں میرے ادبی کام پر ہونے والے تحقیقی کام پر محض مسلک کا اعتراض لگا کر اسے رکوا دینا اور اس مقصد کے حصول کے لیے ناقابلِ یقین انداز کا ہنگامہ کرانا، وہاں کے عمومی سیکولر اور علمی و ادبی مزاج کے بالکل برعکس ہو جاتا ہے۔یہ محض یونیورسٹی کے متعلقہ شعبہ کے ان شریر عناصر کی وجہ سے ہوا جو صرف ذاتی عناد کی وجہ سے اور مقامی سیاست کی وجہ سے عبدالرب استاد کو زک پہنچانا چاہتے تھے لیکن درحقیقت اپنی نادانی میں اپنے ہی وطن کی علمی بدنامی کا موجب بن رہے تھے۔خوشی کی بات یہ ہے کہ وہاں خیر کی قوتیں آخر کار شر کی قوتوں پر غالب آئیں۔ہند کے عمومی سیکولر مزاج کا پاس کیا گیا اور فرقہ پرست

عناصر کو اپنے مقصد میں ناکام ہونا پڑا۔ ہر چند اس کام میں پانچ سال کا وقت ضائع ہوا۔

۲۰۱۳ء میں ہی جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی سے ہردئے بھانو پرتاپ نے میری شاعری پر اور رضینہ خان نے میرے افسانوں پر ایم فل کے مقالہ کی رجسٹریشن کرائی۔ یہ میرے لیے نہ صرف بے حد حیران کر دینے والی خوشی تھی بلکہ اس کے نتیجہ میں گلبرگہ کے بعض نادانوں کی طرف سے کی جانے والی ساری زیادتی کی بھی پوری تلافی ہوگئی۔ ان دونوں مقالات کے نگران پروفیسر ڈاکٹر مظہر مہدی ہیں۔ اور یہ دونوں مقالات اسی برس مکمل ہوگئے ہیں۔ رضینہ خان کا مقالہ مجھے دیکھنے کا موقعہ ملا ہے۔ انہوں نے ''حیدر قریشی کی افسانہ نگاری کا مطالعہ'' موضوع کو اپنی صلاحیت کے مطابق عمدگی سے نبھایا ہے تاہم انہوں نے میری دوسری ادبی جہات پر بھی اختصار کے ساتھ مطالعاتی جائزہ پیش کیا ہے۔ پھر میری افسانہ نگاری پر بات کرنے کے ساتھ فن افسانہ نگاری پر بھی سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

ہردئے بھانو پرتاپ ذاکر حسین دہلی کالج میں اردو کے استاد ہیں۔ ان کا شعبہ اردو میں ہونا بجائے خود خوش کن خبر ہے۔ اسی لیے ان کا میری شاعری پر ایم فل کرنا میری لیے دہری خوشی کا باعث ہے۔

مذکورہ بالا سارے ریسرچ اسکالرز نے اپنی اپنی ہمت اور لگن کے مطابق اچھا کام کیا ہے۔ اور میرے نزدیک ہر ایک کی اپنی اپنی جگہ ایک اہمیت ہے، تاہم جب سارے اچھے کام میں سے زیادہ اچھے کام کا انتخاب کرنا ہو تو مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ عامر سہیل کا مقالہ اپنی علمی، ادبی، تحقیقی اور وسعت کی بنیاد پر دوسرے مقالات سے آگے دکھائی دے رہا ہے۔ جیسے پہلے منزہ یاسمین کا مقالہ بعد میں آنے والوں کے لیے حوالے کی کتاب ثابت ہوا، ویسے ہی عامر سہیل کا مقالہ ایک نئی بنیاد اور نیا حوالہ بن کر سامنے آیا ہے۔ اگر کسی اور ریسرچ اسکالر کو میرے کام پر مزید کام کرنے کا خیال آیا تو منزہ یاسمین، ڈاکٹر عبدالرب استاد، انجم آراء، رضینہ خان اور ہردئے بھانو پرتاپ کے مقالات سے استفادہ کرنے کے ساتھ، اس کے لیے عامر سہیل کا مقالہ نئی تحقیقی راہوں کی نشان دہی کرتا دکھائی دے گا۔ اتنی توجہ اور محنت و محبت کے ساتھ مقالہ لکھنے پر میں عامر سہیل کا

شکر گزار ہوں، ان کے نگران ڈاکٹر الطاف یوسف زئی کا ممنون ہوں اور مانسہرہ یونیورسٹی کے اربابِ اختیار کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

گلبرگہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر عبدالرب استاد اور ان کے نگران ڈاکٹر حمید سہروردی کا بہت زیادہ شکریہ ادا کرنا واجب ہے کہ پانچ سال تک میرے نام کی وجہ سے مشکلات کا سامنا کرنے کے باوجود اور اپنے کیریئر کے داؤ پر لگ جانے کے باوجود انہوں نے اپنے پی ایچ ڈی کے پراجیکٹ سے دستبردار ہونا گوارا نہیں کیا اور ساری صورتِ حال کا دانشمندانہ طریق سے سامنا کیا۔ بالآخر اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے جو اُن کے یونیورسٹی کیریئر میں شاندار کامیابی کے ساتھ خود میرے لیے علمی و ادبی عزت کا موجب ہوا۔ سو پروفیسر ڈاکٹر عبدالرب استاد اور ڈاکٹر حمید سہروردی دونوں دوستوں کا تہہ دل سے شکریہ۔

کلکتہ یونیورسٹی کی پروفیسر ڈاکٹر شہناز نبی کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنی ایک ذہین شاگرد انجم آراء کے ذریعے میرے ادبی کام پر ایم فل کا پراجیکٹ مکمل کرایا۔

جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی کے پروفیسر ڈاکٹر مظہر مہدی کا شکر گزار ہوں کی ان کی ادبی محبت اور خلوص کے نتیجہ میں ان کے دو اچھے ریسرچ اسکالرز ہردئے بھانو پرتاپ اور رضینہ خان نے علی الترتیب میری شاعری اور میرے افسانوں کو اپنے ایم فل کا موضوع بنایا اور مجھے عزت بخشی۔

اس سارے کام کو خدا کا خاص فضل شمار کرتے ہوئے سب سے زیادہ اس کا شکر گزار ہوں کہ اسی نے مجھ جیسے بے سروسامان بندے کے لیے انڈو پاک کی اعلیٰ علمی درسگاہوں میں ادبی عزت و توقیر کے اتنے سامان پیدا کر دیئے۔ سو دل کی گہرائی سے اپنے پیارے خدا کا اعلانیہ شکریہ بھی ادا کرتا ہوں۔

اپنی اڑانیں، ساری شانیں، تیرے دَم سے یار
تیرے ہاتھ ہوائیں ساری تیرے ہاتھ میں ڈور

پسِ دیوارِ گریہ (نظمیں)

شہناز نبی کی اولین ادبی شناخت ایک خوبصورت شاعرہ کی ہے۔اگر چہ بعد میں انہوں نے تحقیق وتنقید کے بعض خاص میدانوں میں بھی جھنڈے گاڑے اور اردو افسانے کی پیش رفت میں بھی اپنا حصہ ڈالا، تاہم یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ان کی پہلی پہچان ان کی شاعری تھی۔۱۹۹۰ء میں ان کی غزلوں کا مجموعہ ''بھیگی رُتوں کی کتھا'' شائع ہوا تھا۔۲۰۰۱ء میں ان کی نظموں کا مجموعہ ''اگلے پڑاؤ سے پہلے'' شائع ہوا اور ۲۰۰۸ء میں ان کی نظموں کا دوسرا مجموعہ ''پسِ دیوارِ گریہ'' منظرِ عام پر آیا۔

''پسِ دیوارِ گریہ'' میں ۷۱ نظمیں شامل ہیں۔ان میں موضوعات کا تنوع ہے۔اپنی نجی زندگی کے معاملات سے لے کر اپنے اردگرد کی زندگی، اپنے ماحول، اپنے معاشرے اور پھر اپنی گلوبل دنیا کے حالات تک کے موضوعات شہناز نبی کی نظموں میں کسی نہ کسی رنگ میں در آتے ہیں۔شروع کی چند نظموں کے عناوین سے ہی اس تنوع کا کسی حد تک اندازہ کیا جاسکتا ہے۔''اے عنایت کی نظر، کچھ ایسی راتیں، میں کیوں مانوں، منتظم، مرے دوست مجھ سے خفا ہوگئے ہیں، حسین تمی کو تھائے، ٹوٹ رہی ہیں سب دیواریں، مجھے مت اس طرح دیکھو، تاریخ کے مردہ خانے سے، امن، اوندھے منہ گرنے سے پہلے، میں کیا دیکھنا چاہتی ہوں، کٹھ پتلی''

نظموں کے عمومی انداز کی نشان دہی کے طور پر یہاں شہناز نبی کی آخری نظم فرہنگ کا آخری حصہ پیش کر رہا ہوں۔

یا پھر اس کی فرہنگ رکسی ایسی نمائش میں سجے رجہاں مری ہوئی زبانوں کے نمونے رکھے جاتے ہیں راور ماہرینِ لسانیات سے مطالبہ کیا جاتا ہے رکہ وہ معنی دریافت کئے جائیں رجو لفظوں میں نہیں ہیں رلیکن تب تک دیر ہو چکے گی!

موضوعاتی تنوع کے باوجود ذاتی زندگی سے لے کر گلوبل زندگی تک ''مسلسل سفر'' شہناز نبی کی نظموں میں جیسے خاص معنی کے ساتھ موجود رہتا ہے۔مسلسل سفر کے دوران کئی پڑاؤ آتے ہیں، لیکن ایسے پڑاؤ بھی اگلے سفر کا استعارہ ہوتے ہیں۔''پسِ دیوارِ گریہ'' کی نظمیں اس مسلسل

سفر کی روداد ہیں۔اور شہناز نبی کے شعری سفر کا ایک اہم سنگِ میل۔ایسا سنگِ میل جو اگلے اسفار کی طرف اشارا بھی کر رہا ہے۔

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

دل چھونے والا منظر

(ہائیک)

وضاحت نسیم اردو کی اچھی شاعرہ ہیں۔زیرِ نظر مجموعہ ان کے ہائیکو پر مشتمل ہے۔مجموعہ میں دو طرح کے ہائیکو شامل کئے گئے ہیں۔طبع زاد اردو ہوئیکو اور جاپانی ہائیکو سے براہ راست ترجمہ۔یہاں اس براہِ راست ترجمہ کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ ہمارے بیشتر جاپانی ہائیکو کے ترجمہ نگاروں نے انگریزی میں ترجمہ شدہ ہائیکو کو پھر اردو میں ترجمہ کیا، یوں ترجمہ در ترجمہ کرنے کے باوجود انہوں نے حقیقت کا اظہار کرنے سے گریز کیا۔اور عام قارئین کے لیے جاپانی زبان کے ماہر بنے رہے۔وضاحت نسیم نے پورے تیقن کے ساتھ براہ راست تراجم کا دعویٰ کیا ہے جو اس لیے خوشکن بات ہے کہ ہمیں ترجمہ در ترجمہ سے نہیں گزرنا ہوگا۔پروفیسر ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نے کتاب کے شروع میں ''اختصار میں ایجاز'' کے عنوان سے وضاحت نسیم کی شاعری اور ہائیکو پر اظہار خیال کیا ہے۔''روایت کے ساتھ جدیدیت'' عنوان کے تحت وضاحت نسیم نے ہائیکو کے حوالے سے کچھ وضاحتِ احوال کی ہے۔سہیل احمد صدیقی، جو ہائیکو کے حوالے سے ایک مستند نام بن چکے ہیں، انہوں نے انگریزی میں ان کا تعارف کرایا ہے۔اردو ہائیکو میں اس مجموعہ کو ایک خوشگوار اضافہ کہا جاسکتا ہے۔کراچی سے ماہیے اور ہائیکو کے حوالے سے ایک محدود حلقہ کوئی سنجیدہ اور بامعنی کاوش کرنے کی بجائے سطحی نام آوری کو ہی ادب کی معراج سمجھے ہوئے ہے، ایسے لوگوں کے برعکس سہیل احمد صدیقی اور ان کے وضاحت نسیم جیسے سنجیدہ ادبی احباب کی کاوشیں قابلِ تعریف ہیں۔

(جدید ادب شمارہ نمبر ۸)

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

من کی آنکھیں کھول (دوہے)

امین خیال پنجابی کے معروف وممتاز شاعروادیب ہیں۔پنجابی زبان میں ان کی ادبی خدمات کاایک مستقل سلسلہ رہا ہے۔ادھرانہوں نے اردوزبان وادب کوبھی اپنی تخلیقات سے نوازا ہے۔اردو ماہیا میں ان کی گراں قدر علمی وتخلیقی خدمات ہیں۔اردو ماہیا کی طرف ان کی توجہ سے اردو ماہیا کی تحریک کو بڑی تقویت ملی تھی۔علمی مباحث کے حوالے سے بھی اور تخلیقی اجافے کے حوالے سے بھی۔اردو ماہیا کے ساتھ امین خیال نے اردو میں ہندی لہجے کواپناتے ہوئے دوہے بھی کہے ہیں۔

''من کی آنکھیں کھول''امین خیال کے دوہوں کا مجموعہ ہے۔دوہے کی ماتراؤں کے شمار کے حساب سے اخلاق حیدرآبادی نے کتاب میں شامل اپنے تنقیدی جائزہ میں بتایا ہے کہ''امین خیال نے چھیالیس حرفی سے لے کرچھپن حرفی تک دوہے لکھے ہیں''۔یوں دوہا بھی رباعی کی طرح کثیرالاوزان دکھائی دیتا ہے۔تاہم میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ جن ماتراؤں کا تعین کیا گیا ہے،ان کے شمار کے ساتھ دوہا میں بسرام کا ہونا ضروری ہے۔بسرام سے عاری دومصرعوں کو''دوہانما'' کہا جاسکتا ہے،دوہانہیں۔چاہے ایسے دوہانما کو دوہا کے نام پر کسی بھی عالی نسب نے کیوں نہ پیش کیا ہو،وہ دوہانمارہیں گے،دوہانہیں۔امین خیال کے دوہوں میں سے چنددوہے یہاں پیش ہیں

رہ جاوے اس جگ میں جگمگ کرتا تورانام — کہت خیالؔ سنو بھائی سادھوکیجوایسا کام

رے جوگی کی جوگنی، ایسی پیت لگا — میں اورتو کے بیچ میں فرق رہے نہ کا

بھری کٹوری موت کی ہرکوئی لے گا پی — آخر یہ جگ چھوڑنا،سال ہزاروں جی

پاکستان میں اردودوہے کے حوالے سے امین خیال کا مجموعہ''من کی آنکھیں کھول'' بھی موضوعِ گفتگورہے گا۔

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

کرچیاں

(شاعری،مصوری)

پروین شیر کے فن کی کئی جہات ہیں۔ان میں نمایاں موسیقی،مصوری اور شاعری ہیں۔موسیقی میں ان کی خاص دلچسپی ستار جیسے قدیم ساز میں ہے،مصوری میں انہوں نے تصویراور منظرکشی کو تجریدیت کے ساتھ ایسے ہم آہنگ کیا ہے کہ تجرید سے اکتاہٹ پیدانہیں ہوتی بلکہ ناظرین اس کے مفہوم کی پرتیں الٹنے لگتے ہیں۔شاعری میں انہوں نے غزلیں بھی کہیں ہیں تاہم آزادنظم کو زیادہ مرغوب رکھا ہے۔اس میں انہوں نے نظم کا ابلاغ کہیں بھی الجھاؤ کا شکارنہیں ہونے دیا۔بہت زیادہ دانشوری بگھارنے کی کوشش بھی نہیں کی۔اپنے سیدھے اور سچے جذبات اور خیالات کوسادگی کے حسن کے ساتھ پیش کردیا ہے۔''کرچیاں'' میں ان کی شاعری کے ساتھ ان کی مصوری کے فن پارے بھی شامل ہیں۔شاعری اور پینٹنگز کے ساتھ ان کا انگریزی ترجمہ بھی دیا گیا ہے۔یہ تراجم کرنے والوں نے ترجمہ کا حق ادا کردیا ہے۔یوں یہ ایک نادراور منفرد مجموعہ بن گیا ہے۔پروین شیر کی شاعری کا مفہوم ان کی پینٹنگز اور تصاویر میں اپنے معانی کی توسیع کرتا ہے۔یہ ان کا کمال ہے۔کافی ٹیبل سائز کی کتاب کے لحاظ سے بھی شاید اردو میں یہ پہلا مجموعہ چھپا ہے۔شاعری کے ہرفن پارے کے ساتھ اس کا انگریزی ترجمہ اور پروین شیر کی اس سے متعلق مصوری،نے اس کتاب کوسہ آتشہ بنادیا ہے،یوں اسے متنوع مزاج قارئین کا حلقہ دستیاب ہوسکتا ہے۔

(جدیدادب شمارہ نمبر۹)

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

لاشعور (شاعری)

غلام مرتضیٰ راہی انڈیا میں اردو کے معروف وممتاز شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔اب تک ان کے تین شعری مجموعے چھپ چکے ہیں۔لامکاں، لاریب اور لاکلام۔۔۔(پہلے دومجموعے بعد میں ایک جلد میں حرفِ مکرر کے نام سے بھی شائع کیے گئے)۔اور اب غلام مرتضیٰ راہی کا چوتھا شعری مجموعہ لاشعور منظرِ عام پر آچکا ہے۔

چاروں مجموعوں کا **لا** سے شروع ہونا ایک خاص معنویت کا حامل ہے۔یہ اُس اثباتِ حق کا حوالہ بھی ہے جو نفی سے شروع ہوکر اثبات تک پہنچتا ہے۔اور ن۔م۔راشد کے 'لا=انسان' سے ملتی جلتی کوئی کہانی بھی بنتی ہے۔راہی کی غزل اپنی ایک خاص پہچان رکھتی ہے اور ان کے ایسے اشعار میں اس پہچان کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

دریا کی خوشامد نہ کروں پیاس کے ہوتے — ہونٹوں پہ زباں پھیر کے نم کرتا چلا جاؤں
نکالا کانٹے سے کانٹا کبھی کبھی ہم نے — چبھے تو دونوں، مگر ایک مہرباں ٹھہرا
ہم ہو چکے تھے ریڈیو سن کے ہوشیار — وہ ٹی۔وی دیکھ دیکھ کے چالاک ہوگئے
سب اپنے اپنے عدم اعتماد سے مجبور — سب ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہوئے
آدمی چاہتا ہے اب جو خلا میں رہنا — دیکھیں بنیادِ عمارت کی کہاں رکھتا ہے
یوں ہم نے زندگی کا پورا کیا ہے چکر — آغاز سامنے تھا جب اختتام آیا
جب اس کا وعظ توجہ طلب نہیں ہوتا — ہم اُس کے منبر ومحراب دیکھ لیتے ہیں
مجھ کو اب اپنی اک نئی پہچان چاہیے — ٹوٹا میں جس طرح، مجھے ویسے نہ جوڑیئے

امید ہے ادبی دنیا میں غلام مرتضیٰ راہی کے پہلے شعری مجموعوں کی طرح لاشعور کی بھی پذیرائی ہو گی۔

(جدید ادب جرمنی شمارہ نمبر۱۱)

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

خیال موسم

(غزلیں)

جاوید ندیم ہندوستان میں اردو کے ایک عمدہ شاعر ہیں۔'خیال موسم' ان کی شاعری کا تیسرا مجموعہ ہے جو صرف غزلوں پر مشتمل ہے۔کتاب کے شروع میں نشتر خانقاہی نے جو ابتدائیہ لکھا ہے اس میں غزل کے حوالے سے جو گفتگو کی گئی ہے وہ غزل کے اچھے تخلیق کاروں کے لیے بھی دلچسپی کا باعث بنے گی۔انہوں نے بلاشبہ بعض نہایت عمدہ نکات ابھارے ہیں۔جاوید ندیم کی غزل کے حوالے سے بھی انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ بڑی حد تک بجا ہے۔ان کے چند اشعار سے ان کی غزل کے تیور دیکھے جاسکتے ہیں۔

ہو رہے ہیں زندگی کے نت نئے اظہارِ غم
منچ سے ہو جائیں گے کل سب کے سب کردارِ غم
گزرا ہے وقت گر تو گزر کر کدھر گیا
ساکن اگر رہا تو کہاں پر سفر گیا؟
ہر ربط، ضرورت کی ہے ڈوری سے بندھا اب
تھا دل سے کبھی دل کو جو رشتہ وہ کہاں ہے
صرف ایقان ہی ایمان رہا ہے اپنا
ہم نے پہلے بھی خدا کو بھلا دیکھا کب تھا
کاغذ سیاہ تم نے عبث ہی کیے ندیمؔ
حل شاعری سے کوئی بھی کیا مسئلہ ہوا؟

اردو غزل کے سنجیدہ قارئین کے لیے جاوید ندیم کا یہ شعری مجموعہ ایک اچھا تحفہ ہے۔

(جدید ادب جرمنی۔شمارہ نمبر۱۲)

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

پچیس

(افسانے)

جدید اردو فکشن میں جوگندر پال کا اتنا بڑا حصہ ہے کہ انہیں بلاخوف وتر دد اردو فکشن کا ممتاز ومعتبر ترین تخلیق کار کہا جاسکتا ہے۔افسانچہ،افسانہ،ناولٹ،ناول تک ان کی تخلیقی خدمات کا وسیع تر سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔اردو اکادمی دہلی نے جوگندر پال کے افسانوں کا ایک انتخاب ''پچیس '' کے نام سے شائع کیا ہے۔اس انتخاب میں جوگندر پال کی ۲۳ کہانیاں،''نہیں رحمٰن بابو'' سلسلہ کے چند افسانچے اور'' پرندے'' سلسلہ کے چند افسانچے شامل کیے گئے ہیں۔بے گور،گرین ہاؤس،ہیر رانجھا،کرن کرن،اٹھارہ ادھیائے،پناہ گاہ،سانس سمندر،جیتے جی،مقامات،جاگیردار ،مہاجر،مارکیٹ اکانومی،بھوک پریت،سٹرپ ٹیز،باشندے،بیک لین، بادشاہ، ہرامبے، معجزہ،نازائیدہ،بجھتے سورج کا سمے،مہابھارت اور تمنا کا دوسرا قدم جیسے افسانے بلاشبہ جوگندر پال کے نمائندہ افسانوں میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔

مرغوب حیدر سید نے''حرفِ آغاز''اور ڈاکٹر قمر رئیس نے''جوگندر پال کا فنّی اسلوب''کے زیرعنوان اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔انتخاب کے آخر میں جوگندر پال کا تحریر کردہ''خودوفاتیہ'' شامل ہے۔جوگندر پال کے اب تک جتنے افسانوی انتخاب شائع ہو چکے ہیں،ہر ایک کی اہمیت ہے۔یہ انتخاب بعض جہات سے پہلے انتخاب شدہ مجموعوں سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔

(جدید ادب جرمنی شمارہ نمبر۱۴)

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

اقبال اور ترک

ڈاکٹر خلیل طوق اُرتر کی میں اردو کا چراغ روشن کئے ہوئے ہیں۔''اقبال اور ترک'' اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک منفرد کتاب ہے۔پہلے حصہ میں علامہ اقبال کی نظر میں ترک قوم کا ذکر ہے۔سلطنتِ عثمانیہ کے زوال اور خاتمہ کا دکھ اور عربوں کی بے حسی بلکہ بے وفائی کو اقبال نے شدت کے ساتھ محسوس کیا تھا۔اس باب میں اقبال کی شاعری کے حوالے دیتے ہوئے ماضی کی تاریخ کے کئی اہم گوشے سامنے لائے گئے ہیں۔حصہ دوم میں ترکوں کی نگاہ میں علامہ اقبال کا مقام ومرتبہ بیان کیا گیا ہے۔اس حصہ میں ایسے ترک دانشور بھی ہیں جو انقلابی ذہن رکھتے تھے اور مذہبی انتہا پسندی سے متنفر تھے،انہوں نے اقبال کو اپنے زاویے سے دیکھا اور پسند کیا ہے۔جبکہ ایسے مذہبی لوگ بھی ہیں جنہوں نے فکر وفلسفہ کی کسی جہت کی بجائے صرف مذہبی عقیدت کے ساتھ اقبال کو چاہا ہے اور اس لگن میں انہیں جنت کی بشارت بھی عطا کر دی ہے۔بہر حال یہ کتاب اقبال اور ترکوں کے حوالے سے بڑی عمدہ معلومات کی حامل کتاب ہے۔اسے خلیل طوق اُرنے صرف مرتب نہیں کیا بلکہ بڑی عرق ریزی کے ساتھ تحقیق بھی کی ہے۔آخر میں علامہ اقبال پر ترکی کی یونیورسٹیوں میں ہونے والے تحقیقی کام کی ایک طویل فہرست دی گئی ہے جو بلاشبہ قابلِ رشک ہے۔

(جدید ادب جرمنی شمارہ نمبر۹)

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

پہلا پتھر

(تاریخ وحالات حاضرہ)

کیپٹن نذیرالدین خان نے ہندوستان کی مسلم تاریخ کے بہت سارے منفی مطالعہ کو درست تناظر میں پیش کرنے لیے ''پہلا پتھر'' تحریر کی ہے۔اس میں کئی نام نہاد ہیروز کی اصلیت اوران کے کرداروں کی ہولنا کی کو اجاگر کیا گیا ہے۔کئی تاریخی مغالطّوں کی نہ صرف نشاندہی کی گئی ہے بلکہ اصل حقائق بھی قوم کے سامنے رکھے گئے ہیں۔وہ لوگ جونام نہاد تاریخی ناولوں کے مطالعہ سے اپنے رومانوی ماضی کے نشہ میں گم ہیں،انہیں اس طرح سے جھنجھوڑا گیا ہے کہ سارا نشہ ہرن ہوجائے۔خوشی کی بات ہے کہ طویل عرصہ سے یک طرفہ تاریخ کے نام پر دی جانے والی افیون کا اثر زائل کرنے کے لیے حالیہ چند برسوں میں مبارک علی،حسن جعفرزیدی اورنذیرالدین خان جیسے لوگوں نے اپنے اپنے طور پر قابلِ ذکراور بڑا ہی اہم کام شروع کیا ہے۔

''پہلا پتھر'' ٹھہرے ہوئے پانی میں پھینکا گیا پتھر ہے جو نہ صرف اس میں ارتعاش پیدا کرسکتا ہے بلکہ اس کا تعفن دور کرکے اسے روانی بھی عطا کرسکتا ہے۔اس کی امید کی جانی چاہیے۔

(جدیدادب جرمنی شمارہ نمبر۱۴)

.....

اُس گلی میں

(افسانے)

سیدعلی محسن نوجوان افسانہ نگار ہیں۔''اُس گلی میں'' ان کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے،جس میں گیارہ افسانے شامل ہیں۔ان افسانوں میں زندگی کے نشیب وفراز کئی صورتیں

بدلتے ہوئے قاری پر منکشف ہوتے ہیں۔سیدعلی محسن کوایک کامیاب داستان گو کی طرح اپنی بات جاری رکھنے اور قاری کی دلچسپی کو قائم رکھنے کا ہنر آتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جہاں انہوں نے غیر ضروری طور پر علامتی کہانی (اُس پار) بُننے کی کوشش کی،کامیاب نہیں ہوئے لیکن جہاں انہوں نے اپنے فطری بہاؤ میں کہانیاں پیش کیں وہاں سیدھے بیانیہ میں بھی ایک مجموعی علامتی تاثر نمایاں ہوتا چلا گیا۔اس مجموعے کی بیشتر کہانیاں سیدعلی محسن کے اسی فطری بہاؤ کی کہانیاں ہیں۔''بند مٹھی میں خواب'' جنوبی ایشیا سے مغربی دنیا میں پیسہ کمانے کے لیے آنے والوں کی کمال کی کہانی ہے۔کہانی میں متضاد سیاسی رنگوں کو ابھارے بغیر محبت بھرے انسانی رشتوں اور ان رشتوں سے منسلک جذبات ونفسیات کی جو کہانی سیدعلی محسن نے بیان کی ہے،مجھے مغربی دنیا میں اقامت پذیر اردو کے افسانہ نگاروں میں اس موضوع سے متعلق اس معیار کی کہانی کہیں دکھائی نہیں دے رہی۔''اُس گلی میں'' سیدمحسن علی کی بحیثیت افسانہ نگار ایک شناخت قائم کرتا ہے اور ان کے آئندہ امکانات کی طرف واضح اشارہ بھی کرتا ہے۔

(جدیدادب شمارہ نمبر۱۵)

.....

میرے ڈرامے لندن میں

شمس الدین آغا ۱۹۶۴ء میں بمبئی سے انگلستان آئے۔بمبئی کی فلم انڈسٹری کی علمی وادبی شخصیات سے ان کے مراسم تھے،خود بھی ڈرامہ کا شوق رکھتے تھے۔سو انگلستان آکر انہوں نے اپنے شوق کو اس رنگ میں پورا کیا کہ خود انگلستان میں اردو تہذیب وثقافت کی ترجمانی کرنے کے لیے ڈرامہ نگاری بھی شروع کی اور ان ڈراموں کو انگلستان میں اسٹیج پر پیش کرنے کا سلسلہ بھی شروع کیا۔تب سے اب تک ٹی وی کی آمد کے بعد پاک و ہند کے باشندوں کے مزاج میں بھی فرق آگیا ہے تاہم شمس الدین آغا نے ایسی فضا میں بھی انگلستان میں اردو اسٹیج ڈرامہ کے فن کو زندہ

رکھا ہوا ہے۔اس کتاب میں ان کے آٹھ ڈرامے شامل ہیں جو اسٹیج کی اہمیت کے ساتھ اپنی ادبی قدر و قیمت کا بھی احساس دلاتے ہیں۔۳۴۴صفحات کے تحریری مواد کے ساتھ ۲۰صفحات پر ان ڈراموں کی بعض یادگار تصاویر شامل کی گئی ہیں۔انگلستان میں اسٹیج ڈرامہ اور اردو میں ادبی ڈرامہ کے حوالے سے اس کتاب کی خاص اہمیت بنتی ہے اور متعلقہ حلقوں میں یقیناً اس کتاب کی پذیرائی کی جائے گی۔

(جدید ادب شمارہ نمبر ۱۶)

.....

داستاں در داستاں

(ناولٹ)

''داستاں در داستاں'' لندن میں مقیم ادیبہ حمیدہ معین رضوی کی تازہ تصنیف ہے۔اس میں اسی نام کا ایک ناولٹ شامل ہے۔ناولٹ کے علاوہ کتاب میں آٹھ افسانے بھی شامل ہیں۔آخر میں ایک فکاہیہ بعنوان ''جوتا'' شامل کیا گیا ہے۔اس کتاب میں حمیدہ معین رضوی کا قلم اپنے معمول کے مطابق رواں دواں ہے۔اپنے اردگرد کے اور اپنی زندگی کے بعض موضوعات سے گزرتے ہوئے وہ اپنی کہانی کا تانا بانا تیار کرتی ہیں۔ان کے ہاں مجموعی طور پر نصیحت اور بغاوت کی ایک عجیب سی کھینچا تانی ملتی ہے۔اصلاً وہ نصیحت کو اہم سمجھتی ہیں لیکن ڈنڈے کے زور سے کی جانے والی نصیحت کے خلاف بغاوت ضرور کرتی ہیں۔یہ رویہ ان کے ہاں ایک کشمکش سی پیدا کرتا ہے جو ان کے اندر ایک تخلیقی تحرک پیدا کرتا ہے، دوسری طرف یہ رویہ بجائے خود ان کے ہاں ایک اعتدال کو قائم کرتا ہے۔ فکاہیہ ''جوتا'' سے ان کے مزاج کی شگفتگی اور علمی دلچسپی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ڈاکٹر شاداب احسانی نے پیش لفظ میں کتاب کے جملہ مندرجات کے حوالے سے مناسب باتیں کر دی ہیں۔حمیدہ معین رضوی نے ''عرضداشت'' کے زیرعنوان اپنے ادبی نظریے کی وضاحت کی ہے۔مجموعی طور پر یہ ایک دلچسپ اور قابلِ مطالعہ کتاب ہے۔بس

عناوین قائم کرتے ہوئے انہیں مناسب طور پر نمایاں نہیں کیا جا سکا۔یہ ایک خامی نہ ہوتی تو کتاب دیدہ زیب بھی کہلاتی۔

(جدید ادب شمارہ نمبر ۱۶)

.....

فرشتے کے آنسو

(افسانے)

ڈاکٹر بلند اقبال کے افسانوں میں ترقی پسند تحریک سے پہلے والے ''انگارے'' کی تپش بھی ہے اور ترقی پسند تحریک کی نظریاتی باغیانہ حدت بھی۔لیکن ان دونوں کے ساتھ وہ جدید تر علوم وانکشافات سے بڑی حد تک باخبر ہیں۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنے موضوعات کے انتخاب میں صرف جلاؤ گھیراؤ کی باغیانہ روش نہیں اپناتے بلکہ اپنے موضوعات کو جدید تر علوم وانکشافات کے آئنے سے گزرنے دیتے ہیں۔وہ انقلابی انداز نہیں اختیار کرتے بلکہ باغیانہ روش سے گزرتے ہوئے اپنے موضوع کو تازہ ترین علمی حوالوں سے تقویت پہنچاتے ہیں۔یہ ایسی توڑ پھوڑ کا عمل ہے جو نئی تعمیر کے لیے ناگزیر ہوتا ہے۔ان کے افسانوں میں اختصار کا وصف بھی ان کی پہچان بنتا جا رہا ہے۔بلند اقبال اپنے مختصر افسانوں کو افسانچہ بھی نہیں بناتے اور غیر ضروری طور پر طویل بھی نہیں ہونے دیتے۔ان کے اختصار کی یہ خاصیت مجھے ان کے اندر چھپے ہوئے ایسے صوفی کا پتہ دیتی ہے جو جزو میں کل کو دیکھنے اور دکھانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔جس دن بلند اقبال اپنے موجودہ باغیانہ موضوعاتی حصار سے تھوڑا سا بھی باہر نکلے مجھے یقین ہے، ان کے اندر کا صوفی سامنے آنے میں دیر نہیں لگے گی۔اس بات کو آسان پیرائے میں یوں بھی کہہ سکتا ہوں کہ ابھی تک بلند اقبال کے افسانوں پر پدری رنگ چھایا ہوا ہے۔جب وہ اس سے تھوڑا باہر کو لپکے تو مادری رنگ میں رنگین ہو جائیں گے اور اسی میں ان کا صوفی رنگ ظاہر ہوگا۔یہ امکانات کی بات ہے۔موجودہ صورتحال

میں جو کچھ موجود ہے وہ بھی بلند اقبال کی طرف سے اردو افسانے میں ایک قابلِ قدر حصہ ہے۔

ڈاکٹر بلند اقبال کے بارے میں یہ بات بہت سے لوگوں کو معلوم نہ ہوگی کہ ادبی دنیا میں انہیں سب سے پہلے ''جدید ادب'' نے متعارف کرایا تھا۔ اس وجہ سے میری ہمیشہ یہ دعا رہتی ہے کہ اردو افسانے کی دنیا میں ڈاکٹر بلند اقبال کا اقبال مزید بلند ہوتا رہے۔ انشاء اللہ ایسا ہی ہو گا۔ ان کے افسانوں کا یہ دوسرا ایڈیشن میری دعا کے قبول ہوتے چلے جانے کا ایک ثبوت ہے۔

(**کتاب میں شامل تاثرات**۔ یہ کتاب اردو، ہندی اور انگریزی میں ایک ہی جلد میں شائع کی گئی ہے، جس سے اسے قارئین کا ایک وسیع حلقہ میسر آ سکے گا)

.....

دل کا آئینہ جو ٹوٹا

(شاعری)

بلوچستان سے اردو ادب کے حوالے سے سامنے آنے والی ہر آواز ہمارے لیے خاص اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ لیکن اُس علاقہ سے کسی شاعرہ کا سامنے آنا بہت ہی خاص بات ہو جاتی ہے۔ بلوچستان کی شاعرہ سیدہ زیب النساء کا شعری مجموعہ ''دل کا آئینہ جو ٹوٹا'' ملا تو میں نے اسے خوشگوار حیرت کے ساتھ دیکھا اور دلی مسرت کے ساتھ مطالعہ کیا۔ اس مجموعہ میں غزلیں، نظمیں اور متفرق اشعار شامل ہیں۔

اک صنم زاد کو پوجا تو خطا میری تھی　　دل کا آئینہ جو ٹوٹا تو خطا میری تھی

میں ان پہاڑوں پہ بے یقینی کے باب جتنے بھی لکھ چکی ہوں
ہوا نے ان میں سے اک بھی پڑھ کر تمہیں سنایا تو رو پڑو گی

مکیں اچھے نہ ہوں جس کے وہ گھر اچھا نہیں لگتا
شجر جیسا بھی ہو تو بے ثمر اچھا نہیں لگتا

انتہا عشق کا تقاضہ ہے　　عشق میں کوئی اعتدال نہیں
میری آنکھوں میں ایک دریا ہے　　تشنگی کا کوئی سوال نہیں

اس نوعیت کے اشعار میں سیدہ زیب النساء کے جو شعری امکانات موجود ہیں، ان کی بنیاد پر ان کے اگلے مجموعوں سے اچھی توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ ادبی دنیا میں اس شعری مجموعہ کی بھی بھر پور حوصلہ افزائی کی جائے گی۔

(جدید ادب شمارہ نمبر ۱۷)

.....

شاہراہِ ریشم کی جان (قزاقستان)

سوویت یونین کی شکست و ریخت کے بعد جو مختلف ریاستیں آزاد ہوئیں ان میں ''قزاقستان'' بھی شامل ہے۔ ڈاکٹر رؤف امیر کو تدریسی حوالے سے وہاں جانے کا موقعہ ملا تو انہوں نے وہاں کی تہذیب و ثقافت کو جاننے کی کوشش کی۔ یہ کتاب ان کی اسی کاوش کا ثمر ہے۔ ۶ ابواب پر مشتمل اس کتاب میں وسط ایشیا کے اس صدر دروازے کی قدیم تاریخ سے اب تک کی صورتحال تک کو سامنے لایا گیا ہے۔ وہاں کی تہذیب و ثقافت، فنونِ لطیفہ، ادبی سرمایہ، شادی بیاہ اور معتقدات و رسومات کو نمایاں کیا گیا ہے۔ قزاقستان میں زندگی کے مختلف رنگ کیسے کیسے ہیں، بدلتی ہوئی دنیا میں قزاقستان کا سیاسی و اقتصادی کردار کیا ہے۔ اردو اور پاکستان کے تعلق سے کیا صورتحال ہے اور اسے کیسے مزید بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ ہندوستانی ثقافت وہاں کس حد تک چھائی ہوئی ہے اس کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ قزاقستان کے بارے میں ہر طرح کی بنیادی معلومات کے لیے اردو میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ آخر میں اردو سے روسی اور روسی سے قزاقی زبان میں ترجمہ کردہ کچھ مواد شامل کیا گیا ہے۔ ۴۰۸ صفحات کی اس کتاب میں ۲۴ صفحات پر وہاں کی خوبصورت تصاویر شامل کی گئی ہیں۔ ''سخن آغاز'' ڈاکٹر رؤف امیر نے اور ''حرفِ محبت'' ان کی

اہلیہ عفت رؤف نے لکھا ہے۔اسے اپنے موضوع کے تعلق سے مستقل حوالے کی کتاب کہا جا سکتا ہے۔الوقار پبلی کیشنز نے یہ دیدہ زیب کتاب بڑی نفاست کے ساتھ شائع کی ہے۔

(جدید ادب شمارہ نمبر ۱۷)

.....

تیری خوشبو

(شاعری)

سلیمان جاذب نے انٹرنیٹ جرنلزم اور ادب کی دنیا میں لگ بھگ ایک ساتھ قدم رکھا ہے اور دونوں میں ان کی کامیابی کے وسیع امکانات موجود ہیں۔ان کا پہلا شعری مجموعہ ''تیری خوشبو'' ابتدائی جوانی کے محبت سے معمور جذبوں کا عمدہ اظہار ہے۔ان جذبوں میں اضطراب و سرشاری کی مختلف کیفیات خوبصورت انداز سے آئی ہیں۔نئی نسل کے قارئین ان سے آئینہ نما گہرا تعلق محسوس کریں گے، جبکہ میری عمر کے اور مجھ سے بڑی عمر کے لوگ بھی اس شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے اپنی جوانی کے زمانوں کا سفر کر لیں گے۔تاہم ابتدائے جوانی کی محبت کے جذبات سے سرشار ہونے کے باوجود سلیمان جاذب کے ہاں فکری پختگی بھی اپنی جھلک دکھانے لگی ہے۔بعض اشعار میں یہ جھلک اتنی نمایاں ہے کہ اس سے سلیمان جاذب کے آئندہ امکانات کا بہتر اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

برصغیر پاک و ہند سے باہر جعلی اور چور شاعروں کے ہجوم میں جہاں بھی کوئی اوریجنل اور جینوئن شاعر دکھائی دیتا ہے مجھے دلی خوشی ہوتی ہے۔ایسے ماحول میں سلیمان جاذب جیسے نئے اور اچھے شاعر کی اردو ادب میں آمد ہوا کے خوشگوار جھونکے جیسی ہے، ایسا خوشگوار جھونکا جس میں اس کے محبوب ہی کی نہیں اس کی اپنی اوریجنلٹی کی خوشبو بھی بھری ہوئی ہے۔میں ''تیری خوشبو'' کی خوشبودار شاعری کے ذریعے اردو ادب میں اپنا پہلا شعری مجموعہ لانے والے سلیمان جاذب کا دلی مسرت

کے ساتھ خیر مقدم کرتا ہوں اور ان کی آئندہ تخلیقی کامرانیوں کے لیے دعا کرتا ہوں!

(کتاب کے فلیپ پر درج تاثرات)

.....

کوہ قاف کے اس پار

(ہزارہ قبائل کی لوک کہانیاں)

بلوچستان کے ممتاز شاعر شرافت عباس ناز نے اپنے لوک ورثہ کو اردو میں منتقل کرنے کے لیے یہ کتاب شائع کی ہے۔ہزارہ قبائل اس وقت ہزارستان، پاکستان، ایران اور افغانستان میں آباد ہیں۔یہ قبائل منگول سرداروں کی برصغیر پر یلغاروں کے زمانے میں یہاں آنے شروع ہوئے۔امیر تیمور، ظہیر الدین بابر اور دوسرے مغل بادشاہوں کے ہاں بھی ان قبائل کا ذکر مل جاتا ہے۔محمد جواد خاوری نے اپنے قبائل کی سولہ کہانیوں کو جمع کر کے فارسی میں شائع کیا۔شرافت عباس ناز نے ہزارہ قبائل کے مختصر تعارف کے ساتھ سولہ میں سے منتخب بارہ لوک کہانیوں کو اردو میں ترجمہ کر کے پیش کیا ہے۔برِصغیر کی دوسری لوک داستانوں کی طرح ان کہانیوں میں بھی ملتے جلتے رنگ ملتے ہیں۔امیری، غریبی، قسمت، مقدر، اخلاقیات، خواہشات،۔۔ایسی داستانیں جو جنگل کے دور اور تہذیب کے درمیانی عرصہ میں ایک کڑی کی طرح دکھائی دیتی ہیں۔

ہر کہانی ایک پورے دور کا منظر سامنے لے آتی ہے۔ابتدائی اور قبائلی دور کے انسان کی نفسیاتی گرہوں کو ہلکا سا کھولتی ہوئی یہ دلچسپ کہانیاں اردو دنیا کے لیے ایک قیمتی سرمایہ ثابت ہوں گی۔اور بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھی جائیں گی۔

(جدید ادب جرمنی شمارہ نمبر ۱۷)

.....

ابھی غزل ہے فروزاں

(شاعری)

شرافت عباس ناز کا پہلا شعری مجموعہ ''ابھی غزل ہے فروزاں'' غزلوں اور نظموں پر مشتمل ہے۔ اس مجموعہ کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں دونوں شعری اصناف میں اظہار پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ غزل کے چند اشعار سے ان کی شعر گوئی کے تیور کو دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔

دریا میں موج، موج میں دھارا ہی اور ہے — اب کے تو ناخدا کا اشارہ ہی اور ہے
بہت دن ہو گئے شیخ و برہمن سے کشاکش میں — مذاقاً ہی سہی اس بار کچھ تعظیم کر دیکھوں
چڑھتا ہے جو دریا وہ اتر جاتا ہے سائیں — اک روز تو دل خود سے بھی بھر جاتا ہے سائیں
سارا دن اس کو بھلانے کی تگ و دو میں کٹا — شام کے سائے ڈھلے تو اس کی یاد آئی بہت
عجب نہیں کہ چلے ہم سراب کی جانب — عجب تو یہ ہے کہ دریا دلی کے ساتھ چلے

شرافت عباس ناز کی نظموں کا انداز بھی ایسے ہی لب و لہجے اور شان کا حامل ہے۔ ہمارے ہاں کوئٹہ کے شاعروں کے لیے عام طور پر پنجابی لہجہ میں ''کوٹے کا شاعر'' کا طنز کر دیا جاتا ہے۔ شرافت عباس ناز کی شاعری نے اس طنز کو ادھیڑ کر رکھ دیا ہے۔ ان کی شاعری اردو کی شاعری ہے اور ان کی ذات کے بھرپور اظہار کے ساتھ بھرپور شاعری ہے۔ میں اس مجموعہ کا کھلے بازوؤں کے ساتھ خیر مقدم کرتا ہوں!

(جدید ادب جرمنی شمارہ نمبر ۱۷)

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

نیند شرط نہیں

(شاعری)

خواجہ جاوید اختر ہندوستان میں جدید غزل کے اچھے شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ''نیند شرط نہیں'' ان کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ ان کی غزل میں جدید لہجہ ابلاغ میں کسی روک کا باعث نہیں بنتا بلکہ ایک تازگی کا احساس دلاتا ہے۔ چند اشعار سے اس مجموعہ کی غزلوں کے عمومی انداز کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

روزِ ازل سے ہے یہ برائی لگی ہوئی — کھلتے کنول کے ساتھ ہے کائی لگی ہوئی
دل کی دنیا ہے مصیبت سے بھری رہتی ہے — پھر بھی ہر شاخ تمنا کی ہری رہتی ہے
سکوں سے کوئی گھر میں بیٹھا ہوا ہے — کوئی خواب میں دوڑتا، بھاگتا ہے
بیکار کے کاموں میں ابھی الجھے ہیں ہم لوگ — فرصت جو ملے گی تو کوئی کام کریں گے
جا کر جو کبھی چین، کبھی رُوس رہے ہیں — وہ بھی تو غریبوں کا لہو چوس رہے ہیں

سنجیدہ ادبی حلقوں میں خواجہ جاوید اختر کی غزلوں کے اولین مجموعہ کی پذیرائی کی جائے گی۔ اور ان کے نئے مجموعہ کا بھی شوق کے ساتھ انتظار کیا جائے گا۔

(جدید ادب جرمنی شمارہ نمبر ۱۷)

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

آسماں پہچانتا ہے

(شاعری)

ڈاکٹر مشتاق انجم مغربی بنگال کے ادیبوں میں خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ان کے افسانوں کے دو مجموعے ''بے گھری'' اور''تلاش''اردو میں جبکہ تیسرا افسانوی مجموعہ''اندھی کھڑکی''ہندی (دیوناگری رسم الخط) میں چھپ چکے ہیں۔ایک ناول''رانگ نمبر''بھی اردو میں شائع ہو چکا ہے۔اب ان کا پہلا شعری مجموعہ''آسماں پہچانتا ہے''
منظرِ عام پر آیا ہے۔ابھی تک ان کی پہچان فکشن رائٹر کی حیثیت سے کی جاتی تھی۔اب شاعر کے طور پر بھی ان کی حیثیت کا تعین کرنے میں آسانی ہوگی۔اس مجموعہ سے چند اشعار نمونۃً پیش ہیں:

راہِ جنوں میں کیا کھویا، اب کیا بولوں ہاتھ آیا کیا سرمایا، اب کیا بولوں
میرا قاتل ہی مسیحائی پہ آمادہ ہے مجھ کو مرنا ہے بہ انداز دگر اس کے بعد
اک مسئلہ ہے اپنے ہی دل کے وقار کا کیا ماجرا سناؤں غمِ قسط وار کا
غزل اے دوست! معیاری نہیں ہے اگر شعروں میں تہہ داری نہیں ہے

غزلوں کے علاوہ اس مجموعہ میں نظمیں، رباعیات اور ماہیے بھی شامل ہیں۔امید ہے ڈاکٹر مشتاق انجم کے افسانوں کی طرح ان کی شاعری کو بھی پسند کیا جائے گا۔

(جدید ادب جرمنی شمارہ نمبر ۱۷)

.....

سرسری تم جہان سے گزرے

(خودنوشت)

اکرام بریلوی کی بنیادی ادبی شناخت صہبا لکھنوی کے رسالہ افکار سے ہوتی ہے جہاں وہ ان کے شریک مدیر تھے۔تاہم ان کی ادبی کارکردگی کئی جہات میں پھیلی ہوئی ہے۔اب حال ہی میں ان کی زندگی کی کہانی''سرسری ہم جہان سے گزرے''کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ان کی یہ خودنوشت سوانح ان کی ذاتی زندگی کی روداد ہونے کے ساتھ ان کے اندازِ تحریر کی بھی غمازی کرتی ہے۔۴۰۴ صفحات کی اس کتاب کو انہوں نے کسی مربوط زمانی ترتیب سے یا ابواب کی کسی درجہ بندی سے پیش نہیں کیا۔بس جیسے جیسے جہاں جو یاد آتا گیا، اسے بیان کر دیا۔اس سے ان کی زندگی کے انداز کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

اکرام بریلوی کی زندگی کا وہ حصہ زیادہ جاندار ہے جہاں انہوں نے حقائق و واقعات کو بیان کرتے ہوئے کسی وقتی مصلحت کو مدِ نظر نہیں رکھا۔تاہم جب وہ اپنے موجودہ زمانے کے احباب کے ذکر کی طرف آتے ہیں تو وہاں ایک احتیاط، مصلحت پسندی اور پبلک ریلشن شپ کے تقاضوں کے اثرات بھی دکھائی دیتے ہیں۔تاہم یہ معمولی انسانی کمزوریاں ہیں جو تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ہم سب میں موجود ہیں۔مجموعی طور پر یہ ایک ایسی کتاب ہے جسے پڑھ کر قارئین اکرام بریلوی سے ایک عمدہ ملاقات کر سکیں گے۔

(جدید ادب شمارہ نمبر ۱۸)

.....

اردو افسانہ اور اساطیر

(تحقیقی مقالہ)

ڈاکٹر قاضی عابد نے اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ ''اردو افسانہ اور اساطیر'' کے موضوع پر لکھا تھا۔ اسے اب کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ اساطیر کا موضوع اپنی بے پناہ وسعت اور زرخیزی کے باعث یوں تو دوسرے علوم سے بھی کچھ نہ کچھ تعلق رکھتا ہے، تاہم ادب کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت بہت ہی خاص ہو جاتی ہے۔ قاضی عابد نے ادب کی ایک صنف یعنی افسانے کو اس تناظر میں دیکھنے کی کاوش کی ہے۔ چھ ابواب پر مشتمل اس مقالہ میں پہلے ''اساطیر: تعریف، حدود اور امکانات'' کے تحت بنیادی معلومات فراہم کی گئی ہے۔ ''اردو داستانوں میں اساطیری عناصر'' کے زیرِ عنوان افسانے سے پہلے اردو داستانوں میں کارفرما ان اساطیری عناصر کی عمدگی کے ساتھ نشان دہی کی گئی ہے۔ اس کے بعد قیام پاکستان سے پہلے ۱۹۴۷ء تک اردو افسانے میں اساطیری عناصر دکھائے گئے ہیں۔

اگلے دو ابواب میں پاکستان اور ہندوستان کے افسانوں میں الگ الگ اساطیری عناصر کی کارفرمائی کو بیان کیا گیا ہے۔ آخر میں ''اردو افسانے پر اساطیر کے عمومی اثرات'' کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہر باب کے آخر میں حوالہ جات وحواشی شامل ہیں اور آخر میں کتابیات کا مکمل احاطہ موجود ہے۔ ڈاکٹر قاضی عابد نے یہ مقالہ لکھتے وقت محنت سے کام کیا ہے اور ان کا اندازِ بیان طالب علمانہ نہیں بلکہ ایسا عالمانہ ہے جو علم سے مملو اور انکساری سے گندھا ہوا ہے۔

(جدید ادب شمارہ نمبر ۱۸)

ساختیات۔۔۔ایک تعارف

ڈاکٹر ناصر عباس نیر ایسے صاحبِ علم دانشور نقاد ہیں جن کے علم کا نور ان کی تحریر سے از خود ظاہر ہوتا ہے۔ میرا ان کا تعلق لگ بھگ ربع صدی پر پھیلا ہوا ہے، ہمارے درمیان زیادہ تر اختلاف رائے کا اظہار ہوتا رہا لیکن ادبی اختلاف رائے کہیں بھی ذاتی رنجش کا باعث نہیں بنا۔ ریکارڈ پر موجود ہمارے اختلافی مباحث اختلاف کا منہ بولتا ثبوت ہیں تو ربع صدی سے قائم ہمارے ادبی مراسم ناصر عباس نیر کی اس اخلاقیات کا مظہر ہیں کہ ادبی اختلاف کو ذاتی دشمنی میں نہیں ڈھلنا چاہیے۔ ان کی کتاب ''ساختیات۔۔۔ایک تعارف'' اس موضوع سے متعلق ان کی مرتب کردہ کتاب کا دوسرا اور نظر ثانی شدہ ایڈیشن ہے۔ پہلا ایڈیشن مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور نے شائع کیا تھا اور یہ دوسرا ایڈیشن پورب اکادمی اسلام آباد نے شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، فہیم اعظمی اور ناصر عباس نیر کے موضوع سے متعلق دو دو مضامین شامل ہیں، ضمیر علی بدایونی اور قاسم یعقوب کا ایک ایک مضمون شامل ہے۔ کتاب گیارہ مضامین پر مشتمل ہے۔ پہلے سات مضامین میں نظری مباحث شامل ہیں جبکہ آخری چار مضامین میں ساختیاتی تنقید کے عملی نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ کتاب کے آخر میں پوری ذمہ داری کے ساتھ ساختیات کی اہم اصطلاحات، ساختیات کے اہم بنیاد گزاروں کا تعارفیہ اور کتابیات کو شامل کیا گیا ہے۔

کسی موضوع کی بحث میں اتفاق یا اختلاف کرنا ہر ادبی قاری کا حق ہے، تاہم ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے کتاب کو مرتب کرتے وقت درسی نوعیت کی معلومات کی سطح سے اوپر کے علمی مضامین کو کتاب میں جگہ دی ہے۔ جس سے کتاب کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ ساختیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب ایک اچھا علمی تعارفیہ ہے۔

(جدید ادب شمارہ نمبر ۱۸)

شہر خاموش ہے

(غزلیں،نظمیں)

ادبی جریدہ معیار کی ادارت سے شہرت پانے والے شاہد ماہلی نے اپنے اشاعتی ادارے کے ذریعے علم و ادب کی بھرپور خدمت کی۔اپنے تخلیقی اظہار کے لیے انہوں نے غزل اور نظم دونوں اصناف سے کام لیا۔غزل اور نظم کی غیر ضروری کشاکش کے باوجود شاہد ماہلی نے دونوں اصناف کے ساتھ بساط بھر انصاف کیا۔کچھ لوگوں کو ان کی غزل زیادہ اچھی لگی تو کچھ لوگوں کو ان کی نظم زیادہ بھلی لگی۔میرے جیسے لوگوں کو دونوں اصناف میں ہی شاہد ماہلی بھلے لگے۔شاہد ماہلی خود بھی خاموش طبع انسان ہیں اسی لیے انہوں نے شہر کی خاموشی کی طرف توجہ کی ہے۔غور سے دیکھیں تو یہ شہر جو خاموش ہے حقیقتاً خود شاہد ماہلی کے اندر کا شہر ہے۔اپنے اس مجموعۂ کلام کے ذریعہ شاہد ماہلی نے صرف شہر کی خاموشی کی ترجمانی نہیں کی بلکہ اس خاموشی کو ایک زبان دے دی ہے۔شاعری کی زبان۔

ایک لمحہ تھا جو تبدیل ہوا برسوں میں ایک منظر تھا جو دوبارہ دکھایا نہ گیا
پھرتا ہوں لے کے ہاتھوں میں اک کاسۂ انا سودائیوں میں ہوں،کبھی صحرائیوں میں ہوں
ہم اپنا درد سنائیں،اگر سنے کوئی کسی کا حال سنیں،کوئی ہم کلام تو ہو

''شہر خاموش ہے'' کی ساری غزلوں،نظموں میں شاہد ماہلی کے اندر کے خاموش شہر کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔اپنے قاری سے ہمکلام ہوتی ہوئی آوازیں،اور اپنا درد سناتی ہوئی آوازیں،جو ہمیں اپنی آواز بھی لگتی ہیں۔

(جدید ادب شمارہ نمبر ۱۸)

.....

نَرک (ناول)

نسیم انجم ایک عرصہ سے اردو فکشن میں اپنے حصے کا کام کر رہی ہیں۔اس کے علاوہ ریڈیائی ڈرامے بھی لکھتی رہی ہیں اور مسلسل کالم نگاری بھی کر رہی ہیں۔بطور کالم نگار تو میں انہیں کچھ عرصہ سے پڑھتا آ رہا ہوں لیکن ان کا ناول ''نَرک'' مجھے حال ہی میں پڑھنے کا موقعہ ملا ہے۔یہ ناول ایسے ہیجڑوں کی زندگی پر مشتمل ہے جن میں سے بعض قدرتی طور پر ایسے تھے تو بعض کو اغوا کر کے جبراً ہیجڑہ بنا دیا گیا۔اس موضوع سے متعلق انڈیا میں دو تین فلمیں بن چکی ہیں۔ایک دو پاکستانی ڈراموں میں بھی اس حساس موضوع پر کافی سنجیدگی کے ساتھ صورتِ حال کو پیش کیا گیا ہے۔ادبی طور پر افتی نسیم اس موضوع سے خود براہ راست منسلک رہے اور انہوں نے اس المیہ کے بعض پہلوؤں کو اجاگر کیا۔تاہم خود اس المیہ کا حصہ ہونے کے باعث ان کی تحریر میں غم و غصہ اور انتقامی رویہ جلد ابھر آتا ہے۔ادبی شخصیت ہونے کے باوجود افتی نسیم اس موضوع سے متعلق کوئی سنجیدہ بڑا کام نہیں کر پائے۔

نسیم انجم کا کمال ہے کہ ایک خاتون ہوتے ہوئے انہوں نے نہ صرف اس حساس موضوع پر ناول لکھا بلکہ ناول لکھنے کا حق ادا کر دیا۔''نرک'' ننھے ببلو کی المناک داستان ہے،اس کے ماں باپ دونوں ڈاکٹر تھے۔ایک دن اس بچے کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور پھر اسے جبراً ہیجڑہ بنا لیا جاتا ہے۔اسے گلنار نام دیا جاتا ہے۔اس ماحول میں رچ بس جانے کے بعد ایک دن آتا ہے جب اسے ہیجڑوں کا گرو بنا دیا جاتا ہے۔ہیجڑوں کی زندگی کے معمولات تو پورے ناول میں موجود ہیں تاہم اس بیچ دو خاص واقعات سامنے آتے ہیں۔گلنار (ببلو) کی طرح ایک بچہ کہیں سے اغوا کر کے لایا جاتا ہے۔گلنار کو اپنا زمانہ یاد آ جاتا ہے اور وہ سب سے چوری کسی نہ کسی طرح اسے اس کے گھر پہنچا دیتی ہے۔تب اسے لگتا ہے کہ اس نے ببلو کو اس کے ماں باپ کے پاس پہنچا دیا ہے۔دوسرا واقعہ ایک نارمل نوجوان دانش کا پیش آتا ہے جو صحافت کی دنیا میں قدم جمانے کی کوشش

کر رہا ہے۔لیکن سخت گیر باپ کی سختی اور حالات کی ستم ظریفی اسے گلنار کے گھر تک پہنچا دیتی ہے۔ہیجڑوں کے طور طریق کے مطابق وہاں اس کی گلنار سے شادی ہو جاتی ہے۔اس کا سخت گیر باپ اسے عاق کر دیتا ہے۔ماں بیٹے کی جدائی کے غم فوت ہو جاتی ہے۔تب اس کے باپ کے رویے میں تبدیلی آتی ہے۔اس کی دوست تانیہ اسے اس دلدل سے نکلنے میں مدد دیتی ہے۔اگر وہ ملک میں رہتا تو ہیجڑے اسے کسی بھی طریقے سے قتل کرا دیتے،اس لیے دانش اور تانیہ بیرون ملک چلے جاتے ہیں،اپنے والد سے اس کی صلح ہو جاتی ہے۔گلنار دانش کی یاد میں پریشان ہوتی ہے۔جب اس کا آخری وقت قریب آتا ہے وہ سارے ہیجڑوں کو سمجھاتی ہے کہ دوسروں کی تحقیر اور تمسخر کا نشانہ بننے سے بہتر ہے،ہم سب اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں اور اسی معاشرے میں گھل مل کر معمول کی زندگی گزاریں۔

یہ ایک طرح سے اپنے معاشرے کے لیے بھی پیغام ہے کہ انسانوں کی اس صنف کو بھی انسان سمجھ کر اپنے ماحول میں جگہ دیں اور ہیجڑہ برادری کو بھی درس ہے کہ الگ تھلگ رہنے کی بجائے نارمل انسان کی طرح محنت کر کے، پڑھ لکھ کر ملازمت کریں، کاروبار کریں۔بظاہر یہ سیدھی سی کہانی ہے (بس دانش اور تانیہ کے محبت آمیز مکالمے میں ایسے لگتا ہے جیسے خواتین کے کسی رسالے کی رومانی کہانی پڑھ رہا ہوں) لیکن ناول کی تیکنیک میں نسیم انجم نے اپنے انوکھے موضوع کے تمام کرداروں کو عمدگی سے پیش کیا ہے۔ان کی الگ الگ اور ملتی جلتی نفسیات،طور طریق، بظاہر پھکڑ پن مگر بباطن زخمی روح، درد کے اَن دیکھے اور ان جانے دیار،نسیم انجم نے اتنا کچھ اتنی مہارت سے بھر دیا ہے کہ اس موضوع پر لکھے گئے اس ناول کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اس ناول کو پڑھتے ہوئے کئی بار میرا دل بھر آیا۔کئی مقامات پر مجھے خوف کا سامنا کرنا پڑا۔ببلو کی نفسی کیفیات نے تو دہلا کر رکھ دیا۔میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ نسیم انجم نے اس حساس موضوع پر ابھی تک کا سب سے بڑا ناول لکھ دیا ہے۔

▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪

(مطبوعہ انٹرنیٹ میگزین ''ادبی منظر'' اسلام آباد۔شمارہ مارچ ۲۰۱۴ء)

جب ایسا ہو (افسانے)

سید ظفر ہاشمی ادبی رسالہ گلبن کے مدیر ہیں۔صاف گوئی اور بے باکی ان کا وصف خاص ہے۔اردو ادب کے ایک کم از کم معیار کو ملحوظ رکھنے کے ساتھ ان کا زیادہ زور اردو زبان کی بقا کے لیے کیے جانے والے اقدامات ہیں۔ادارت کے ساتھ نثر میں لکھنے کا سلسلہ بھی جاری ہے۔''جب ایسا ہو'' ان کے افسانوں کا ایک انتخاب ہے۔یہ افسانے معروف معنوں میں جدید نہیں ہیں لیکن اپنے عہد کے سماجی اور اخلاقی مسائل اور معاملات پر کھل کر گفتگو کرتے ہیں۔ان افسانوں میں غم وغصہ،محبت،نفرت،عبرت اور عقیدت کا احساس نمایاں ہے۔ہندوستان کے مسلمانوں کو درپیش داخلی و خارجی سلگتے مسائل کو ان میں بڑی جرأت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔سید ظفر ہاشمی کے مزاج کی عمومی پہچان کی طرح یہ ۲۸ منتخب افسانے بھی ان کی حق گوئی اور جرأت مندی کے غماز ہیں۔

(مطبوعہ جدید ادب جرمنی۔شمارہ نمبر ۶۔جنوری تا جون ۲۰۰۶ء)

▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪

سعادت

(حمد ونعت)

خواجہ محمد عارف میر پور کے رہنے والے ہیں اور اب انگلینڈ کے شہر برمنگھم میں آباد ہیں۔ان کا شعری مجموعہ 'سعادت' ان کی حمدیہ، دعائیہ اور نعتیہ شاعری پر مبنی ہے۔مناقبِ صحابہؓ،متفرق ملی نظمیں اور چند قطعات بھی مجموعہ میں شامل ہیں۔چونکہ ان سب کا پس منظر بھی مذہبی ہے اس لیے مجموعہ کا مجموعی تاثر قائم رہتا ہے۔پروفیسر نثار احمد فاروقی نے بجا طور پر لکھا ہے کہ عقیدت میں ڈوبی ہوئی شاعری میں فنی کمالات نہیں دیکھے جاتے، جذبے اور خلوص کو دیکھا جاتا ہے۔تاہم خواجہ محمد عارف کا یہ مجموعہ فنی لحاظ سے بھی مناسب ہے۔اس شاعری میں آج کے سیاسی اور سماجی مسائل بھی پس منظر سے صاف دکھائی دیتے ہیں، بلکہ دعائیہ شاعری کا محرک ہی یہی حالات ہیں۔اس

لحاظ سے خواجہ محمد عارف کی دعائیں ان کے دل کی آواز ہیں۔حمد ونعت میں ادب کے مقامات اور تقاضوں کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہے۔حمد ونعت سے خصوصی دلچسپی رکھنے والوں کے لیے 'سعادت' ایک عمدہ تحفہ ہے۔

(مطبوعہ جدید ادب جرمنی۔شمارہ:۱۳)

▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪

ٹیگور کے حوالے سے
ایک ادبی مکالمہ

انور خواجہ (امریکہ)۔۔حیدر قریشی (جرمنی)

نوٹ: میرا ایک مضمون ''رابندر ناتھ ٹیگور: ایک تاثر'' کلکتہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے جرنل ''دستاویز'' (ایڈیٹر پروفیسر شہناز نبی) کے ٹیگور نمبر میں شائع ہوا تھا۔یہی مضمون روزنامہ ''آج'' پشاور کے ادبی ایڈیشن مورخہ ۲۸ر فروری ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا۔امریکہ میں مقیم اردو کے افسانہ نگار انور خواجہ صاحب نے اس مضمون کو پڑھ کر ادبی ایڈیشن کے مدیر ناصر علی سید کو ای میل بھیجی اور اپنے تاثرات سے آگاہ کیا۔ناصر علی سید نے وہ ای میل مجھے فارورڈ کر دی۔یوں براہِ راست میرے اور انور خواجہ صاحب کے درمیان مکالمہ کی صورت بن گئی۔ٹیگور کے حوالے سے ہونے والے اس مکالمہ کو انور خواجہ صاحب کی اجازت سے یک جا کر کے اشاعت کے لیے پیش کر رہا ہوں۔اس سے اردو دنیا میں ٹیگور فہمی کی صورت حال کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور اسی کے پیش نظر ٹیگور کے اردو تراجم اور ان تک رسائی کے نئے امکانات کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔(ح۔ق)

Dear Nasir thank you for the column Adib Saray. The article of Hader Qureshi is very informative and send me his email address. He did not touch the part of his poetry which a kind of propaganda of Hinduism. I have not read his poetry deeply but I read his stories and novel. As for as I know that he was deeply influence by the poetry Hafiz but he did not acknowledged. Most of his literature is connected with orthodox Hunduism this is my personal opinion.
Sincerely,
Anwar Khawaja

محترمی انور خواجہ صاحب

سلام مسنون

ابھی برادرم ناصر علی سید صاحب نے آپ کا برقی گرامی نامہ مجھے بھیجا تو آج کے روزنامہ ''آج'' پشاور کے ادب سرائے میں شائع ہونے والے ٹیگور کے بارے میں میرے مختصر سے مضمون پر آپ کے تاثرات جان کر خوشی ہوئی۔ ٹیگور کی شاعری کے بارے میں اتنا ہی لکھ پایا ہوں جتنا ان کی شاعری کا ترجمہ شدہ حصہ میری دسترس میں آسکا تھا۔ یہ تراجم کلکتہ سے ڈاکٹر شہناز نبی صاحبہ نے خود اردو میں کیے اور مجھے عنایت کیے۔ ٹیگور کے مزید تراجم پڑھنے کو ملے تو پھر مزید کچھ عرض کرسکوں گا۔ تاہم ٹیگور کے بارے میں جو عمومی تاثر قائم ہوا ہے، اس سے مجھے ایسا نہیں لگتا کہ وہ ہندوازم کو پروپیگنڈہ کے طور پر بیان کرتے ہوں گے۔ جس طرح دوسرے کسی بھی مذہب کے شاعر اور ادیب کو اپنے مذہبی نظریات کی بنیاد پر (یا مارکسی نظریے کی بنیاد پر) قائم رہتے ہوئے مثبت فکر والی شاعری کرنے کا حق ہے ویسا ہی ٹیگور سمیت کسی بھی ہندو کو بھی اس حق سے محروم کرنا مناسب نہ ہوگا۔ ہاں یہ ضرور دیکھنا چاہیے کہ اپنے نظریے کے مثبت اثرات وہ انسانیت کی فلاح کے لیے پیش کررہے ہیں یا محض اپنے مذہب ومسلک اور نظریے کی تبلیغ کے لیے۔ حافظ اور رومی سے ٹیگور کی فکری قربت ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں پروفیسر سوگا تابوس کے ایک لیکچر کا اقتباس میری نظر میں ہے۔ اس کے چند حصے دیکھ لیں۔

''ٹیگور کی بچپن سے حافظ سے شناسائی تھی، کیونکہ انہوں نے اپنے والد کے وہ تراجم پڑھے تھے جو انہوں نے فارسی زبان سے کیے تھے۔۔۔۔۔ ٹیگور نے خود کو ماضی کے صوفی شعراء کا ورثہ دار ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ ان کی فکر وہی ہے جو ان عظیم صوفی شعراء کی تھی، صرف زبان جدید عہد کی ہے۔''

اب اگر صوفی ازم کی کھوج شروع کی جائے تو حافظ و رومی سے پہلے ابن عربی سے ہوتے ہوئے ہمیں گھوم پھر کر پھر ہندوستان آنا پڑتا ہے۔ سو افکار و خیالات کا سفر تو مسلسل ایک طرف سے دوسری طرف اور دوسری طرف سے مزید دوسری اطراف میں جاری و ساری رہتا ہے اور رہنا

چاہیے۔ ٹیگور ایک بڑے شاعر اور مذہبی رواداری اور انسانیت کی بھلائی کے خواہشمند شاعر تھے۔ وہ فرقہ پرست نہیں تھے۔ ان کی ادبی شخصیت کے اس پہلو کی عالمی سطح پر پذیرائی کی گئی ہے، ان کا تعلق برصغیر سے تھا، سو اس لحاظ سے یہ ہمارے لیے دوہری خوشی کا سبب ہونا چاہیے۔

آپ نے انہیں انگریزی میں پڑھا ہے اور یقیناً مجھ سے زیادہ پڑھا ہے، آپ کی رائے زیادہ وضاحت کے ساتھ سامنے آئے تو مطالعۂ ٹیگور کے حوالے سے میرے علم میں اضافہ کا موجب ہو گی۔ آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔ والسلام

آپ کا مخلص

حیدر قریشی

۲۸ فروری ۲۰۱۳ء

Dear Qureshi sahib, thank you for your letter. I do remember to read the translation of Tagor "Getan Jali" which was translated by Akhtar Hussain Raipuri. You shoud read the English translation of his poem which he has don himself. My impression is that he tried to base his philosphy on orthodox Hunduism which
include the whole system of cast. I agree with you that Sufism has track in Buddism which a shoot of Hundu mystic order. It is quite complicated problem. I am not student of Philosphy but I will go through it and let you inform but you are in better position and go into this problem. My thought may have been affected by his Tarana " Banda Matarim" which has been adopted by Bharat changing from Iqbal Poem. I will discuss it with you some time later on. I am also irritaed with one of his story Kabali Wala. it is base on fact but the writer point of view may have made me against Tagor. I will go through this story and read his poem again and let you know my opinion.
I am thankful to Nasir Ali Syed that he forwarded my email to you.
I am also happy to read your poems in this article and want to read more and also that you qouted Wazir Agha, who was a new kind of poet. Why not write an articleon Agha.
Thank you again
Sincerely,
Anwar Khawaja

محترمی انور خواجہ صاحب

سلام مسنون

آپ کی ای میل میں چند ہلکے اشاروں سے میں کچھ اندازہ تو کر پا رہا ہوں لیکن میرے لیے آپ کی طرف سے مزید یا مکرر مطالعہ کے بعد جو کچھ لکھا جائے گا، وہ زیادہ اہم ہوگا سو میں اس کا انتظار کروں گا۔

آپ نے ٹیگور کے ساتھ علامہ اقبال کا ذکر بھی کیا ہے تو مجھے پہلے سے یاد ایک بات یہاں لکھنے کا موقعہ مل گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ٹیگور کو نوبل انعام ملنے کی تاریخ کی لکیر کھینچ دی جائے تو اس سے پہلے کے زمانہ میں علامہ اقبال ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' کہہ رہے تھے اور اس سے بعد کے زمانے میں ''مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا'' کہنے لگے تھے۔ کیا ایسا محض اتفاقاً ہوا تھا یا واقعتاً ان کا فکری ارتقاء اسی وقت انہیں اس موڑ پر لے آیا تھا۔ اس کی تحقیق کسی پر اعتراض کے لیے نہیں بلکہ حقائق جاننے کی غرض سے کی جا سکے تو غلطی یا غلط فہمی دور کی جا سکتی ہے۔

آغا جی کے بارے میں چند ٹوٹے پھوٹے مضامین میں نے لکھے تھے اور ان کا مجموعہ کتابی صورت میں شائع کیا تھا۔ وہ کتاب اب مزید اضافوں کے ساتھ انٹرنیٹ پر دستیاب ہے۔ میری ای لائبریری میں یہ کتاب بھی موجود ہے۔ آپ کی سہولت کے لیے لائبریری کا لنک بھیج رہا ہوں۔

امید ہے آپ صحت و عافیت سے ہوں گے۔ والسلام

آپ کا مخلص

حیدر قریشی

۲ مارچ ۲۰۱۳ء

Dear Qureshi sahib, I will down your ebook if I can and read article about Agha and read your poems.

I do not know when Iqbal wrote the poem Hindustan Hamara. But I know due to policy of Congress he realized that the Hundu will crush Muslim with there majority. He pursued Jinnah to take over the Leadership of Muslim.

I have to read about Tagore more but this I know that his early poem were in

old classical Bangali or new Sanskirt. He wrote those poem anonymously and they were stories of Krishna and Rahda illicit love affairs. Later on he improved those poems and they became official chants of Hindu Beraggi or Fakir. He established in his village

School or University, Shanti Nakatin, which became the revival of Hundu culture and centre of Congress. His poetry have lyrical quality and became base of new Bengali music. In my opinion, he got the Noble prize being Hundu and his poem were translated in English. Iqbal could not get the Noble Prize because he was Muslim and his book " Payam-e- Mushriq was also translated in English. I am not a narrow minded Muslim but I know that English imperialism has spread this notion that Muslim are not superior mentally although the whole Western civilization could not produce poet and mystic Like Hafiz and Roomi.

IT is difficult subject and you are more suited to write about it. I do not have any books of Tagore.

I will try to down load your books. My books are also available on internet. I write mostly short stories. I will send you a link.

Thank you.

Sincerely,

Anwar Khawaja

محترمی انور خواجہ صاحب

سلام مسنون

آپ کی ای میل ملی، مجھے پہلی بار دل چسپی کے ساتھ تشویش ہونے لگی ہے۔ جب ہم دنیا کے کسی بڑے سے بڑے رائٹر کو بھی پڑھنے سے پہلے ایک واضح اور تقریباً فیصلہ کن مخالفانہ رائے قائم کر لیں تو پھر اس کی ہر خوبی بھی ہمیں عیب دکھائی دینے لگے گی۔ اس کے برعکس کسی چھوٹے سے چھوٹے ادیب کو بھی اگر دوستانہ انداز سے پڑھنا شروع کیا جائے تو اس کے کئی معائب کے باوجود ہمیں اس میں بہت سی خوبیاں بھی دکھائی دینے لگ جائیں گی۔ اگر کسی دوستی یا دشمنی کے جذبہ کے بغیر کسی کو پڑھا جا سکے تو تب بھی اس کے محاسن ضرور ظاہر ہوں گے۔ سو ادب کے مطالعہ میں میرا یہی طریق کار رہا ہے۔ تحقیقی معاملات میں بھی غیر جانبداری کے ساتھ کام کیا جاتا ہے۔ بے شک ہمارا دل کسی ایک آئیڈیالوجی کی طرف ہو لیکن حقائق کی پرکھ کرتے وقت ہمارے لیے دستیاب شواہد

ہمیشہ معتبر ہونے چاہئیں اور انہیں کی بنیاد پر نتائج اخذ کرنے چاہئیں۔ طے شدہ نتائج حاصل کرنے والی تحقیق کی بنیاد پر کی جانے والی تحقیق میں حقائق کم اور مفروضے اور جذبات زیادہ شامل ہو جاتے ہیں۔اس رویے سے قوموں کا وہی حال ہوتا ہے جو اس وقت وطنِ عزیز پاکستان کا ہو چکا ہے۔ چونکہ آپ نے گزشتہ ایک میل میں ڈاکٹر وزیر آغا کا ذکر اپنائیت کے ساتھ کیا تھا تو یہاں اس سارے معاملہ کو ڈاکٹر وزیر آغا کے ایک اصولی نوعیت کے موقف کے حوالے سے بھی دیکھ لینا مناسب لگ رہا ہے۔

ادب کی پرکھ کا سوال

''ادب کی پرکھ کا سوال ایک نجی محفل کی گفتگو سے اٹھا تو ان (وزیر آغا) کے داخلی اضطراب نے ایک نئے سوال کو جنم دیا۔'' پچھلے دنوں ایک نجّی محفل میں اردو کے ایک بزرگ نقّاد نے کسی تازہ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ میرے لیے اس کتاب کو پسند کرنا ناممکن ہے۔اس لیے کہ یہ تو میرے عقائد ہی کے خلاف ہے۔اور میں سوچنے لگا کہ ادب کی پرکھ کے سلسلے میں اگر عقیدے کو کسوٹی مقرر کیا جائے تو اس کے کیا نتائج برآمد ہوں گے؟'' **('ڈاکٹر وزیر آغا کی تیکنیک' مضمون بحوالہ کتاب شام کا سورج از ڈاکٹر انور سدید۔ص ۶۶۰)**

وزیر آغا کے اصولی موقف کو مدِ نظر رکھ کر ٹیگور سمیت کسی بھی ادیب کو آسانی سے پڑھا جا سکتا ہے اور جو اچھا لگے اس کا اعتراف بھی کیا جا سکتا ہے۔

ٹیگور کو نوبل پرائز ۱۹۱۳ء میں ملا تھا۔اور علامہ اقبال نے بہت بعد میں جا کر مسلمانوں کے لیے آزادی کا مطالبہ کیا تھا اور وہ بھی سراسر صوبائی آزادی کی بات تھی، ہندوستانی وفاق کے اندر رہتے ہوئے آزادی کا مطالبہ تھا۔ یہ اب بالکل الگ موضوع نکل آیا ہے۔اس پر بہت کچھ وضاحت کے ساتھ لکھا جا چکا ہے، میرا اس سلسلہ میں مزید کچھ کہنا مناسب نہیں ہے۔ میں ٹیگور اور اقبال دونوں کی ادبی شخصیات کا معترف ہوں، دونوں میں جو مشترک اور مختلف ادبی وفکری اقدار ہیں، انہیں بھی تھوڑا بہت سمجھ سکتا ہوں۔آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے میرے مضمون کو پڑھ کر اپنے خیالات سے آگاہ کیا اور مجھے آپ کے خیالات کو مدِ نظر رکھ مزید غور وفکر کرنے موقعہ ملا۔

آپ ٹیگور کے حوالے سے ان کی تخلیقات کے تناظر میں کوئی دوستانہ یا غیر جانب دارانہ مطالعہ کرنے کے بعد مجھے اپنے نئے خیالات سے باخبر کر سکے تو آپ کا ممنون ہوں گا۔

والسلام

آپ کا مخلص

حیدر قریشی

۳/مارچ ۲۰۱۳ء

Thank you for your email. I agree with you. In study of literature one should keep his believe apart. Iqbal wanted provincial autonomy but later on he came to know that Congress is not caring to give rights to Muslim so he asked Jinah to lead the Muslim. Orthodox Muslim movements Devband and Jamat Islami were deadly against Pakistan but when Pakistan came into being they came to Pakistan and started old Madrisha system and provided Zia force of young Mujahiddin. and begin killing their own people.

It is interesting discussion and you are more qualified to write and can get material and books but I cannot get any books in Los Angeles.

Dr Wazir Agha was a great scholar and poet. This is my own opinion, Anwar Sadeed friendship damage his name.

In which city you are in Germany.?

I will down load your books and if I have any difficulty I will email you.

Sincerely,

Anwar Khawaja

برادرم انور خواجہ صاحب

سلام مسنون

آپ کی ای میل ملی، خوشی ہوئی۔تحریک پاکستان کی مخالفت کرنے والے علماء کے گروہوں کی آپ نے بالکل بجا نشان دہی کی ہے۔اور پاکستان کا المیہ یہ ہے کہ وہی مخالف لوگ پاکستان کے نظریہ کے بلکہ پورے پاکستان کے مالک ومحافظ بن بیٹھے ہیں۔یہی لوگ پاکستان کے موجودہ مصائب کے ذمہ دار ہیں۔اللہ پاکستان کے حال پر رحم فرمائے۔آمین۔

آغا جی کے بارے میں آپ کی رائے جان کر خوشی ہوئی۔آپ سے جتنا مکالمہ ہوا ہے،اس لحاظ سے خوشی کا باعث ہے کہ مجھے ایک صاحبِ علم دوست کے ساتھ بات کرنے کا موقعہ ملا ہے۔اللہ آپ کو خوش رکھے۔والسلام

آپ کا مخلص

حیدر قریشی ۳/مارچ ۲۰۱۳ء

میں فرینکفرٹ کے قریب ہیٹرس ہائم شہر میں رہتا ہوں۔لکھنا بھول گیا تھا۔

ماہنامہ سبق اردو بھدوہی، انڈیا۔شمارہ: ۳۵۔جولائی ۲۰۱۳ء

پوپ کہانی کا قضیہ

بہت سے ادبی معاملات ہوتے ہیں،جنہیں لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد ہلکی سی دلچسپی کے ساتھ دیکھ کر اپنی دوسری ادبی ترجیحات میں مصروف ہو جاتی ہے۔کبھی کبھار کسی طرف سے تحریک دلانے پر مزید غور کی طرف مائل بھی ہونا پڑتا ہے۔لیکن کسی بھی اشو کی بحث میں کسی ادیب کی شمولیت تب جاندار ہوتی ہے جب وہ اپنے اندر کی لگن کے ساتھ اس میں دلچسپی لیتا ہے۔گزشتہ برس بریڈفورڈ سے مقصود الٰہی شیخ صاحب کی جانب سے مجھے پوپ کہانی کے موضوع کی طرف توجہ دلائی گئی۔میں نے ان کی کتاب ''پوپ کہانیاں'' پڑھ کر بذریعہ خط اپنی محتاط اور مختصر رائے سے آگاہ کیا۔اسی دوران مجھے رضیہ اسماعیل کی زیرِ اشاعت کتاب ''کہانی بول پڑتی ہے'' کے مطالعہ کا موقعہ ملا۔میں نے پوپ کہانی کے موضوع سے متعلق دونوں کتابوں کو مدِ نظر رکھ کر ایک مضمون لکھ دیا۔''پوپ کہانی اور رضیہ اسماعیل کی کہانیاں''۔اپنے مضمون میں جو کچھ لکھ چکا ہوں اور جن بنیادی سوالات کو اُٹھا چکا ہوں جب بھی ان کا کوئی علمی و ادبی جواب مل گیا، میں اس طرف پیش قدمی کرنے سے گریز نہیں کروں گا۔ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے میرے پوپ کہانی کے بارے میں موقف کو جاننے کے باوجود کسی ناراضی کا اظہار نہیں کیا جبکہ مقصود الٰہی شیخ صاحب باقاعدہ اسے ''زوروں سے منوانے'' کے لیے خط و کتابت کرنے لگے۔

مقصود الٰہی شیخ صاحب کے خطوط میں کبھی تو محبت گہری ہونے لگتی اور کبھی برہمی کا اظہار ہونے لگتا۔میں نے ان کی بعض سخت باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اصل موضوع پر توجہ مرکوز رکھنے کی کوشش کی۔تمام تر خط و کتابت کے باوجود میرا ان خطوط کو چھپوانے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔لیکن وقفہ وقفہ کے بعد مقصود الٰہی شیخ صاحب کی طرف سے ایسا ''محبت بھرا اصرار'' شروع ہو جاتا ہے کہ مجھے کوئی ''راہِ نجات'' دکھائی نہیں دیتی۔اب حال ہی میں ۲۸ مارچ ۲۰۱۳ء کو ان کی طرف سے پھر

اصرار ہوا تو مجھے مناسب لگا کہ پوپ کہانی کے موضوع پر شیخ صاحب کے ساتھ جو خط و کتابت ہوئی ہے، اسے یک جا کر دیا جائے۔ اس سلسلہ میں ایک دو قباحتیں درپیش تھیں۔ بعض ای میلز میں برہمی کے اظہار کے طور کچھ نامناسب باتیں لکھی گئی تھیں۔ میں نے جواب میں ان باتوں کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ پوپ کہانی میرا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس میں مجھے دلچسپی بھی نہ تھی۔ اس لیے میں نے ذاتیات میں الجھنے یا کسی ذاتی وضاحت کرنے سے گریز کیا۔ لیکن اب میں ساری خط و کتابت شائع کرنے لگا ہوں تا کہ پوپ کہانی کا قضیہ کھل کر سامنے آ سکے۔ اسی دوران مجھے احساس ہوا کہ مقصود الٰہی شیخ صاحب کی جن سخت باتوں سے میں نے صرفِ نظر کیا تھا، ان کے بارے میں تھوڑی سی وضاحت کر دینا ضروری ہے کیونکہ اب یہ خطوط ذاتی ریکارڈ سے نکل کر ادبی ریکارڈ پر آ رہے ہیں۔

میں نے ۱۱/اپریل ۲۰۱۲ء کو ''کولکاتا اور دہلی کا سفر'' کے عنوان سے ایک میل ریلیز کی تھی۔ اس پر مقصود الٰہی شیخ صاحب نے مسرت کا اظہار کیا۔ میں نے شکریہ کی ای میل بھیجی تو انہوں نے ۱۲/اپریل ۲۰۱۲ء کو ایک تراشہ بھیج دیا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہیں نومبر ۱۹۷۶ء میں ملکہ برطانیہ نے کسی شاہی دعوت میں مدعو کیا تھا۔ انہوں نے کسی ادبی تقریب کا ذکر کیا ہوتا تو انہیں جواب دیتا۔ ''بزمِ شاہی میں غریبوں کا گزر کیا معنیٰ'' والی بات تھی۔ سو میں نے جواب نہیں دیا۔ ۱۸/اپریل کو شیخ صاحب نے پھر وہی تراشہ بھیج دیا۔ تب میں نے انہیں اپنی ۱۹/اپریل ۲۰۱۲ء کی ای میل میں مختصراً لکھا کہ آپ نے ملکہ کا دعوت نامہ ارسال کیا ہے اور میں خود کو بادشاہ محسوس کر رہا ہوں۔ ساتھ ہی انہیں اپنی یادوں کے ایک باب کا لنک بھیج دیا۔ اس باب کے چند متعلقہ اقتباس یہاں درج کر رہا ہوں۔

''میرے پیش نظر دو باتیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ میں ایک طویل عرصے سے کبھی ایسا محسوس کیا کرتا ہوں کہ جیسے میں کسی پچھلے جنم میں بادشاہ/راجہ یا سردار قسم کی چیز تھا اور کبھی ایسے لگتا ہے کہ میں کوئی سادھو، سنت، فقیر یا ملنگ تھا۔۔۔۔۔۔۔ سیل کی کارکردگی کی اس تفصیل کے بیان سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ ہمارے اندر ہمارے آباؤ اجداد کی عادات و افعال کا کتنا بڑا حصہ موجود ہے۔ ان

کے ذریعے ہمارے نانہال، ددھیال کے اعمال و عادات کا بہت سارا حصہ ہم میں منتقل ہو جاتا ہے۔ اپنے آپ کو کبھی کوئی مہاراجہ یا سردار اور کبھی کوئی ملنگ فقیر محسوس کرنا مجھے ایسے لگتا ہے جیسے میرے ددھیال، نانہال میں سے کوئی ایسے رہے ہوں گے اور انہیں کی وہ بادشاہی اور فقیری میرے اندر بھی سرایت کر کے کسی نہ کسی رنگ میں میرے مزاج کا حصہ بنی ہوئی ہے۔ ''

''یہاں تک آتے آتے مجھے ایسا لگا ہے جیسے آج میرے اندر کے بادشاہ اور ملنگ میں لڑائی ہو گئی ہے۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ بادشاہ جیت گیا ہے اور فقیر کو قبر میں ڈال دیا گیا ہے۔ لیکن فقیر کی تو قبر بھی زندہ رہتی ہے اور سانس لیتی ہے۔ اب میں نہ خود سے مزید مکالمہ کر سکتا ہوں نہ اپنے قارئین سے مزید گفتگو کی گنجائش ہے، بس خدا سے ایک سوال ہے۔

خداوندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے، سلطانی بھی عیاری

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اپنی کہانی کا درویش بھی میں ہوں، سلطان بھی میں ہوں، اور خدا کا سادہ دل بندہ بھی میں ہی ہوں۔''

(''کھٹی میٹھی یادیں'' کے باب ''زندگی در زندگی'' سے)

یہ پس منظر اس لیے واضح کیا ہے کہ مقصود الٰہی شیخ صاحب کے پہلے خط میں جو نامناسب الفاظ ملیں گے، ان کے پس منظر میں یہ ساری پہلے والی خط و کتابت تھی۔ چونکہ شیخ صاحب میرے اشارے کا مطلب سمجھ ہی نہیں سکے تھے اس لیے انہیں لگا کہ میں اپنی کسی خودی میں گھرا ہوا ہوں، وغیرہ وغیرہ۔ شیخ صاحب نے کسی نئی، پرانی ادبی تقریب کا احوال بھیجا ہوتا تو اس پر خوشی کا اظہار کر سکتا تھا۔ بادشاہوں کے دعوت نامے پر کیا خوش ہوتا۔ یہ شخصی زندگی میں اعزاز ہو سکتا ہے لیکن ادب سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ پھر اتنا پرانا دعوت نامہ۔

ایک دو وضاحتیں اور۔۔ ایک یہ کہ میں نے کبھی بھی مقصود الٰہی شیخ صاحب سے اپنی کسی تحریر پر داد نہیں چاہی، کبھی بھی نہیں،۔۔۔ دوسری یہ کہ میں نے آج تک اس کا اظہار نہیں کیا لیکن آج یہاں لکھ رہا ہوں کہ مجھے بہت شروع کی ادبی عمر میں پاکستان میں اکیڈمی آف لیٹرز کی تقریب میں

شرکت کا موقعہ ملا تھا اور ایوان صدر میں ہونے والی دعوت میں بھی شرکت کی تھی۔ چار افراد کی مجھے جو ٹیبل ملی تھی اس پر راغب مراد آبادی اور عطاء الحق قاسمی موجود تھے۔ تیس سال سے زیادہ عرصہ گزر گیا، اسے کسی تفاخر کے اظہار کے طور پر کہیں بیان ہی نہیں کیا۔ ماریشس میں نائب صدر کی دعوت کا دعوت نامہ ہونے کے باوجود میں نے ایک اور ادبی کام کرنے کو ترجیح دی تھی، وہیں ہوتے ہوئے شریک نہیں ہوا تھا۔ اس کا ہلکا سا ذکر میرے ماریشس والے رپورتاژ میں موجود ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ میں اپنی فقیری میں خوش ہوں اور شاہوں کے ہاں جانے کی کوئی خاص خوشی نہیں ہوتی اور دوسروں کے معاملہ میں بھی یہی رویہ رہتا ہے۔ اس کے باوجود شیخ صاحب نے اس پس منظر میں میرے مزاج کو جانے بغیر اپنے پہلے خط میں جو کچھ لکھا ہے میں نے اس کا جواب نہیں دیا اور ان کی سخت باتوں کو نظر انداز کر دیا تھا۔ چونکہ اب یہ سارے خطوط چھپنے جا رہے ہیں تو مجھے مناسب لگا کہ اس سلسلہ میں یہ ہلکی سی وضاحت کر دوں۔

ایک اور بات جو انہوں نے اپنی ۱۸/دسمبر ۲۰۱۲ء کی ای میل میں لکھی ''شخصی کمزوریوں'' کے حوالے سے تھی۔ میرا اشارہ صرف ان شخصی کمزوریوں کی طرف تھا جو پوپ کہانی کی خط و کتابت میں ان سے سرزد ہوتی جا رہی تھیں۔ ان پر تفصیلی لکھ سکنے کے باوجود میں نے صرف پوپ کہانی کے خدوخال جاننے پر اصرار کیا۔ مثلاً انہوں نے پوپ کہانی کو ''ایجادِ من'' قرار دیا۔ ایک چیز جس کی شناخت ہی نہیں ہے، صرف نام رکھ دینے سے بندہ اس کا موجد بن جائے تو کیا کہا جا سکتا ہے۔ اس حوالے سے بہت کچھ لکھا جا سکتا تھا، لکھا جا سکتا ہے، لیکن میں نے موجد بننے کی ان کی اس معصومانہ خواہش کو ان کی شخصی کمزوری شمار کر کے نظر انداز کر دیا۔ ایک زمانہ میں جب وہ مایوسی کی لپیٹ میں تھے، میں نے ان کی ہمت بندھانے کے لیے انہیں خط لکھا تھا۔ بعد میں یاد دلایا تو انہیں مایوسی یاد نہیں آئی اُلٹا وہ خود کو اسٹیج پر بیٹھا ہوا سمجھ کر مجھے پبلک میں بیٹھا ہوا سمجھنے لگے۔ حالانکہ میں ایسی تقریبات میں نہ اسٹیج پر ہوں نہ پبلک میں۔ اسی طرح کی چند اور کمزوریاں بھی ہیں جو ان خطوط کو پڑھنے والے، مطالعہ کے دوران خود بہتر طور پر سمجھ لیں گے۔ اس ساری خط و کتابت کے سلسلہ میں یہ چند وضاحتیں کرنا ضروری سمجھا تھا سو کر دی ہیں۔ اب آگے وہ خط و کتابت دیکھ لیں

اور اپنے اپنے طور پر پوپ کہانی کے بارے میں جو چاہے رائے قائم کریں۔

مجھے جس دن اپنے بنیادی سوالوں کے جواب کی صورت میں مناسب رہنمائی مل گئی، میں پوپ کہانی میں ضرور دلچسپی لوں گا۔ ابھی تو معاملہ اس خط و کتابت میں اُٹھائے گئے نکات تک ہی رُکا ہوا ہے۔

اردو میں پوپ کہانی کی کہانی

نئی، پرانی خط و کتابت

مقصود الٰہی شیخ ۔۔۔ حیدر قریشی

جناب! میں تو آپ کو دور سے جانتا ہوں مگر آپ کی بے نیازی کا جواز کبھی سمجھ میں نہ آیا۔ اب تو آپ فوراً ریسپانس دیتے ہیں۔ ہم متوازی چلتے ہوئے بھی ایک اور ایک گیارہ کا عمل اپنا سکتے تھے۔ یہ یورپ میں اردو کے لیے بہتر ہوتا۔۔ خیر اگر مگر کا جواب دیجیے گا کیونکہ میں اور آپ گیا وقت نہیں۔ آپ کو ماہیا کا جنون تھا، میں بھی ایک کمپینر ہوں بحوالہ پوپ کہانی۔ راجہ اور بادشاہ والی بات۔۔ پلیز ٹریس یور شجرہ۔ روٹس میں گھسنے سے بھی بہت کچھ پتہ چل سکتا ہے۔ آپ کھوجتے رہیے، ورنہ بندہ خود کو خودی میں خدا مانتا ہے۔ لگتا ہے آپ پی سی تیکنیک میں خاصے ماہر ہیں۔ اگر آپ ڈاؤن لوڈ کر لیں تو ہم جب کبھی موقعہ ہوگا تو اردو میں مراسلت کر سکتے ہیں۔ والسلام

مقصود

پ۔ن: داد چاہنے والوں کو داد دینی بھی چاہیے۔ مہربانی کر کے اپنی چاہ اور اپنی چاہت سے نکل کر دوسروں کو داد نہ سہی، دو چار لفظ لکھ کر اپنے تاثرات بھیجنا (کم از کم) مجھے اچھا لگے گا۔

۱۹/اپریل ۲۰۱۲ء

میرا خیال ہے کہ ہم ایک دو بار قریب آ کر پھر دور ہوئے ہیں۔ جن دنوں آپ بہت زیادہ ڈپریس

تھے، میری آپ سے بہت اچھی خط و کتابت ہوئی تھی، پھر آپ ایک نئے جذبہ کے ساتھ اُٹھے۔ میں آپ کو بڑھتا ہوا دیکھتا رہا اور خوش ہوتا رہا کہ آپ کی ڈپریشن ختم ہوگئی ہے۔ انہیں دنوں میں آپ سے کہا تھا کہ اپنی کوئی کتاب بھیج دیں، میں پڑھ کر مضمون لکھ دوں گا۔ مقصد آپ کو متحرک کرنا تھا۔ آپ نے کتاب نہیں بھیجی، مجھے اصرار کرنا مناسب نہ لگا۔ اصل میں ایک دوسرے کے لیے اچھے جذبات رکھتے ہوئے بھی شاید کہیں مزاجوں کا فرق غیر ارادی طور پر روک بنا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی اور وجہ بھی ہو۔ بہر حال قسمت میں ایسا ہی ہونا تھا سو ہو گیا۔ اردو سکرپٹ میں تو ہم جب چاہیں خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ آپ کی پوپ کہانیوں کو دیکھا تو ہے لیکن مجھے افسانچے اور ان کے فرق کا ابھی تک اندازہ نہیں ہو سکا۔ کسی مضمون میں اس فرق کو واضح کیا ہو تو عنایت کیجیے گا۔ میں اس فرق کو سمجھنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد ہی کچھ عرض کر سکوں گا۔

آپ کا مخلص

حیدر قریشی ۱۹/اپریل ۲۰۱۲ء

اسے کہتے ہیں یار زندہ صحبت باقی!۔

میری یادداشت کمزور ہوگئی ہے۔ کبھی کبھی بڑی پشیمانی ہوتی ہے بندہ تپاک سے ملتا ہے اور میں کورے کاغذ کی مانند ہوتا ہوں جیسے، جیسے نہیں واقعی نہیں جانتا، پہچانتا۔ بس اب تو فوراً" اقرار کر لیتا ہوں اور پوچھ لیتا ہوں کہ کچھ تعارف اور پرانی ملاقات یاد دلائیے۔ آپ کا پتہ نہیں، جرمنی کیا صورت حال تھی۔ میں تو ایسا صحافی ہو گیا تھا جسے اخباری اور سماجی مصروفیات نے" پبلک مین" بنا دیا تھا۔ آپ کو اندازہ ہوگا کہ جب آدمی اسٹیج پر ہوتا ہے تقریر کرتا ہے تو اسے سب دیکھ رہے ہوتے ہیں اور اپنی اپنی جگہ جان اور پہچان لیتے ہیں مگر وہ جم غفیر میں سے ایک آدمی پر نگاہ نہیں ٹکا سکتا تو بعد میں کیا پہچانے گا؟ میرا خیال ہے آپ کی بات بھی درست ہے کہ باہمی احترام کے باوجود ہمارے مزاج ایک نہ تھے۔ آپ نے اس ناچیز پر مضمون لکھنا چاہا ہوگا۔ اب کیسے کہوں کہ میں کیوں چپ رہا؟ ہونا تو یہ چاہیئے تھا بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ عادتاً" میری خواہش ہوتی ہے کہ میرے کام پر

رائے زنی ہو اور میں اس روشنی میں کچھ سیکھ کر اپنی مہم اور کام کو آگے بڑھاؤں۔ اردو میں کام سے زیادہ شخصیت پر فوکس کیا جاتا ہے۔ دراصل مجھے آپ کے حوالے سے جو بات یاد آ رہی ہے وہ یہ ہے کہ آپ کی تحریریں" راوی" میں شائع کرتے ہوئے آپ نے میرا ایک آدھا مشورہ قبول کیا تھا۔ آپ کا پاکستان میں صحافت کا زیادہ تجربہ تھا مگر آپ نے فراخدلی سے میرا مشورہ مانا تھا۔ خصوصاً" سوانح عمری کی ایک آدھ قسط" راوی" میں چھپی جس میں گھریلو اور نجی اشارے زیادہ تھے پھر شاید آپ نے کتاب چھپوالی مگر" راوی" سے سلسلہ ٹوٹ گیا یا پرانی یادوں کے تعلق سے کوئی بات تھی۔ میرا تاثر یہی رہا کہ آپ ماھیا کی صنف منوانے میں جت گئے اور اس طوفان خیزی میں کہیں سے کہیں (بلندی پر) نکل گئے۔

خیر،۔ میں کمپوٹر تکنیک پر زیادہ حاوی نہیں۔ اس لئے آپ کو تازہ الحمراء لاہور میں پوپ کہانی سے متعلق مضمون علیحدہ فارورڈ کرتا ہوں۔ دیکھیئے۔ میں نت نئے کمپیئن چلاتا ہوں۔ آج کل پوپ کہانی کا سلسلہ چل رہا ہے۔ آپ ضرور رائے دیجئے۔ کتاب کی فرمائش کی بات مجھے قطعی یاد نہیں آ رہی۔ آپ یہ مضمون دیکھیئے۔ اس کے بعد آپ نے کہا تو میں کتاب" پوپ کہانیاں" بھی ارسال کر دوں گا۔ میں یہ بھی معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کبھی" مخزن" بھی ملا؟ آپ نے اپنے رسالے میں کوئی تبصرہ کیا ہو تو مجھے اس کی پی ڈی ایف میں اٹیچمنٹ بنا کر بھیج دیجئے گا۔ مجھے غرض نہیں کہ کس انداز میں ای میل کرتے ہیں۔ بس میں آسانی سے کھول سکوں اور پڑھ سکوں۔ امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ آپ کے خط کا خلوص متاثر کر رہا ہے۔ انشاء اللہ اب رابطہ رہے گا۔ گھر میں سب کو درجہ بدرجہ سلام و دعا۔ والسلام،۔

مقصود۔ ۱۹/اپریل ۲۰۱۲ء

برادرم مقصود الٰہی شیخ صاحب سلام مسنون

مخزن ملتا رہا تھا۔ ایک بار آپ کی طرف سے ایک فارم بھی ملا تھا۔ مجھے یہ سلسلہ اچھا نہیں لگا تھا کہ تخلیق کار رقم دے کر چھپے اور نقاد کو پیسے دے کر اس سے لکھوایا جائے۔ اس لیے میں نے فون پر اچھے پیرائے میں معذرت کر لی تھی۔ آپ کا اصرار تھا کہ میں خط کا جواب لکھ دوں، اور

میں ان تخلیق کاروں کی دلآزاری کا موجب نہیں بننا چاہتا تھا، جو اس طریق کے مطابق چھپ رہے تھے۔ ویسے ادبی رسائل کا ساتھ دینا، ان کے ساتھ مالی تعاون کرنا مناسب ہی نہیں بلکہ کسی حد تک ضروری بھی ہے۔ لیکن یہاں معاملہ تخلیق کار اور نقاد کے ساتھ رویوں کا تھا۔

جدید ادب میں ادبی رسائل پر تبصرے نہیں دیئے جاتے۔ صرف کتابوں پر ہی تبصرے کرتا ہوں۔

جب میں نے آپ سے کوئی کتاب بھیجنے کو کہا تھا تا کہ مضمون لکھ دوں، تب آپ بہت زیادہ ڈیپریشن کا شکار تھے۔ آپ کے ایک دو مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے خط ملے تھے، ان کے نتیجہ میں میں نے چاہا تھا کہ آپ اس وقتی ذہنی دباؤ سے باہر آسکیں۔ تب میں نے آپ کو بہت اچھے خط بھی لکھے تھے۔ مقصد تو یہ تھا کہ آپ ڈیپریشن سے نکل کر ادبی طور پر متحرک ہو جائیں۔ سو میرے مضمون کے لکھے بغیر ہی یہ مقصد حاصل ہو گیا۔

میری یادوں کا پہلا باب آپ نے بھی شائع کیا تھا، لیکن اس کا پہلا پیرا گراف حذف کر کے۔۔۔ اس کے بعد میری گلبن والوں سے بات ہو گئی تھی اور لگاتار یادوں کے گیارہ باب، دس قسطوں میں وہاں چھپے تھے۔ دس قسطوں کے بعد گلبن میں باقاعدہ لکھنے کا سلسلہ رک گیا۔ تاہم گاہے بگاہے جدید ادب ہی میں یادیں چھپتی رہیں اور اب تک یادوں کے مزید دس باب چھپ چکے ہیں۔ اور گیارھواں ان دنوں میں لکھ چکا ہوں، صرف اس باب کی نوک پلک سنوارنا باقی ہے۔ یہ سلسلہ رکا نہیں، بس چھپنے کے مقام بدلتے رہے ہیں۔

پوپ کہانی کے حوالے سے آپ کا مضمون ملا، غور سے پڑھ لیا۔ لیکن میرا سوال وہیں ہے۔ میں نے گزارش کی تھی کہ افسانچے اور پوپ کہانی میں کیا فرق ہے اور اسے کیسے سمجھا جا سکتا ہے؟

یہ لگ بھگ ویسے ہی سوال جیسی صورت ہے جب ہم سے ماہیا اور ہائیکو میں فرق کی بابت پوچھا گیا تھا۔ ہماری طرف سے اس کا بڑی وضاحت کے ساتھ جواب دیا گیا تھا۔ افسانچے اور پوپ کہانی کے فرق کے سلسلہ میں بھی بات وضاحت کے ساتھ سامنے آنا ضروری ہے۔

اس مضمون کو پڑھنے کے بعد لگا کہ آپ اسے ایجادِ من خیال کرتے ہیں۔ مجھے خیال آتا ہے کہ انگریزی میں پوپ کہانیوں کے نام سے پہلے سے کچھ لکھا جا رہا ہے۔ یہاں اب ہلکا سا کنفیوژن

پیدا ہو رہا ہے۔ مجھ پر الزام لگا تھا کہ میں ماہیا کا موجد بننا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کی سختی سے تردید کی تھی اور پھر اردو میں اس کے بانی کی حد تک بھی سہرا ہمت رائے شرما کے سر باندھ دیا تھا۔ اس موضوع پر پوری کتاب لکھ دی تھی۔ اس کے برعکس آپ اسے ایجادِ من قرار دے رہے ہیں۔ آپ کی ایجاد ہے تو اسے تسلیم کیا جانا چاہیے، لیکن اگر انگریزی سے اسے لیا گیا ہے تو پھر کچھ مارجن رکھنا مناسب ہوگا۔

ان دنوں اپنی یادوں کا نیا باب لکھنے کے ساتھ میرا جی نمبر کی تیاری میں مصروف ہوں۔ دنیا فیض اور راشد کی دھن میں انہیں فراموش کیے بیٹھی ہے۔ سوچا لوگ مشہور لوگوں کے نام پر کام کر کے اپنی شہرت کماتے ہیں۔ ہم کسی گمنام اور نامقبول بندے کے کام کو سامنے لاتے ہیں۔ سو اردو میں اہلِ ملامت کے امام میرا جی پر کام میں لگا ہوا ہوں۔ جون تک رسالہ چھاپنے کا ارادہ ہے۔ انشاء اللہ۔ امید ہے آپ ہر طرح صحت و عافیت سے ہوں گے۔

والسلام آپ کا مخلص **حیدر قریشی** **۲۰/اپریل ۲۰۱۲ء**

پیارے حیدر قریشی صاحب،۔

مخزن" پر تبصرہ کرنا نہ کرنا آپ کا حق اور صوابدید پر تھا۔" سائز کی بنیاد پر آپ نے اسے مجلّہ یا رسالہ سمجھا اور گریزاں رہے تو کوئی بات نہیں۔ شہاب نامہ کو کتاب سمجھا جائے یا رسالہ؟ مخزن کا" دی اینڈ" ہو گیا۔ بحث میں پڑنا بیکار ہے۔ شکوہ نہ شکایت۔ آپ مطمئن رہیں۔ **دوبارہ اس پر گفتگو نہ ہوگی۔**

میں حیران ہوں آپ نے" مخزن" کے پیچھے فکر کو قطعی نظر انداز کر دیا لہذا دو چار جملوں میں۔'op-CoWriters کے قیام کی بابت عرض کر دوں۔ مغرب میں اردو قلمکاروں کی پہچان وطن عزیز میں ہونی چاہیئے۔ اس کو صورت دینے کے لئے صلاح مشورہ کیا گیا۔ مجھے" راوی" سے رٹائر ہوئے دو سال ہو چکے تھے مگر احباب نے بھلایا نہیں اور مجھ سے رابطے جاری رکھے تھے۔ میں خود" مخزن" جاری کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا چنانچہ تخمینہ منگوایا گیا اور (مختصرا") احباب کو دس دس

پرچوں کی قیمت پیشگی بھیج کر منگوانے کے لئے کہا گیا۔اس طرح دو مقصد حاصل کرنا مقصود تھا اول سرمایہ، دوم پرچے کی تقسیم۔ مجھے اپنے بیٹے کے ایئر لائن میں ہونے کی وجہ سے کم کرائے میں پاکستان جانے آنے کی سہولت حاصل تھی۔ پہلی مرتبہ میں تین ماہ کے لئے پاکستان کے مختلف شہروں میں پھرا۔ وہاں بے خبری کا عالم تھا اور کوئی یہاں والوں کو گھاس ڈالنے پر تیار نہ تھا ویسے میرا بس ہی نہ چلا میں تو اپنے ہفت روزہ میں بھی لکھنے کا معاوضہ یا اعزازیہ دینے کو تیار تھا مگر ناخن ہی نہ ہوئے۔اب مانے جانے نقادوں کی عزت واحترام ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے قیمتی وقت کے مدنظر اعزازیہ کی صورت نکالی۔ساتھ تحریرا" کہا گیا کہ اپنی انٹی گریٹی قائم رکھتے ہوئے رائے زنی کیجئے تاکہ برطانیہ کے لکھنے والوں جن میں قیصر تمکین مرحوم اورش صغیر ادیب مرحوم جیسے پہلے سے مسلمہ افسانہ نگار شامل تھے، وہ متفق رہے اور ساتھ چلے کہ مرکزی دھارے میں برطانیہ کے لکھنے والوں کی شمولیت کے لئے یہ قدم ناگریز ہے۔اس طرح ممکن ہے۔ لکھنے والے کا درجہ مقرر ہو سکے۔اس کے نتیجے میں بعض لکھاری میدان چھوڑ کر بھاگ بھی گئے۔

مجھے نہیں معلوم آپ نے کیسے سرمایہ مہیا کیا اور اپنا پرچہ چھاپا۔ " کو آپ" کی حد تک میں مطمئن ہوں کہ مقصد حاصل ہوا اور اس کے بعد وطن عزیز کے سالانہ ادبی جائزوں میں یہاں والوں کا نام آنے لگا۔شاباش ہے یہاں والوں نے تنقید سنی اور آگے بڑھے اور کئی دوستوں نے مقام بنایا۔اگر آپ کی نظر معاصر ادب واشاعت پر ہے۔تو میں بات یہیں ختم کرتا ہوں۔ برطانیہ کی حد تک یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ جن " گل محمد " قسم کے مخالفین نے حصہ نہیں لیا وہ خسارے میں رہے اور وہ برطانوی مقامیت جہاں ادبی رسالے سرے سے نہ تھے اور "راوی" بند ہو گیا تھا، باہر متعارف ہی نہ ہو پائے۔آپ جانتے ہیں کہ میں نے "راوی" میں نئے لکھنے والوں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کی۔ آج وہ نئے، نئے نہیں، جانے مانے ہیں۔

آپ میری ڈیپریشن کا ذکر کر رہے ہیں۔اخبار کا دھندا ہی ایسا ہے کہ چنگا بھلا آدمی دیوالیہ ہو جائے۔ ہاں کئی مرتبہ مکان مارگیج رکھا، دیوالہ نہ نکالا اور صحافت نہ چھوڑی۔ میری یادداشت کمزور ہے۔آج یاد نہیں رہتا جبکہ پیدائش کے وقت کی بات یاد آجاتی ہے۔ میں آپ کے خلوص

اور نیک جذبے کی قدر کرتا ہوں کہ میرے خیالات سے اتفاق نہ کرتے ہوئے خیال رکھا اور مجھے حوصلہ افزا خط لکھے۔اگر اس وقت کا میرا یا آپ کا اپنا خط کمپوٹر یا کسی کونے کھدرے میں محفوظ ہو تو بھیجئے گا۔کیا خبر یادیں کھنگالنا مفید ثابت ہو۔آپ نے اپنا قلم نہیں روکا اور لکھتے رہے۔ میں آپ کی ثابت قدمی اور ادبی میدان میں اونچا اٹھنے کی بابت سب نہیں تو بڑی حد تک کچھ نہ کچھ جانتا ہوں اور خوش ہوں کی آپ کی محنت رائگاں نہ گئی۔آپ اپنی جگہ ضرور مسرور ومطمئن ہوں گے۔ میں آپ کی آئندہ کامیابیوں کے لئے دعا گو ہوں۔

جہاں تک پوپ کہانی کا تعلق ہے۔کیا آپ نے اس بارے میں "ایوان اردو" جنوری یا اپریل تک چل رہی بحث دیکھی؟" گلبن" میں تو تنقید دیکھی ہوگی۔ میرا جوابی حملہ بھی کہیں نہ کہیں چھپا دیکھا ہوگا۔اگلے مہینے " ایوان اردو" والے پچھلے تین ماہ میں جو خطوط شائع ہوئے ان کے حوالے سے میرا جواب مضمون چھاپ رہے ہیں۔آپ کو کوئی معلومات درکار ہوں تو بتایئے بھیج دوں گا ویسے جمعہ کو میں نے ہوائی ڈاک سے آپ کو اپنی کتاب " پوپ کہانیاں " پوسٹ کر دی ہے۔اس میں بہت سی اغلاط ہیں۔آپ ان سے سہو نظر فرمایئے گا اور مدعا پر نگاہ رکھتے ہوئے بتایئے گا۔آپ کی رائے میرے لئے قیمتی ہوگی۔والسلام، **مقصود**

خط کل لکھنا شروع کیا تھا۔طویل داستان اور مرحلوں کو سمیٹنا مشکل ہے۔آپ اپنی بیتی بحوالہ رسالہ ضرور بتایئے۔کاش ہم نے share experience کر کے ایک دوسرے کو فائدہ پہنچایا ہوتا اور ایک دوسرے سے کچھ سیکھا ہوتا!!۔

۲۳/اپریل ۲۰۱۲ء

برادرم مقصود الٰہی شیخ صاحب سلام مسنون

آپ کی پہلی ای میل بھی مل گئی تھی اور اب دوسری استفسار والی میل بھی مل گئی ہے۔استفسار والی میل کا جواب اسی جواب میں آ گیا۔فون نمبر لکھ دیتا ہوں۔

آپ نے مخزن کے سلسلہ میں جو موقف اختیار کیا ہے، اسے آپ کی سوچ اور آپ کے زاویے سے

درست سمجھتا ہوں۔ہم نے بالکل ابتدائی ادبی زمانہ میں خانپور میں دو کتابیں اسی بنیاد پر شائع کی تھیں۔تاہم جب جدید ادب کا اجرا کیا تھا تو ۸۰ صفحات کا شمارہ بھی اپنے ذاتی خرچ سے شائع کیا اوراب جرمنی سے جو رسالہ نکال رہا ہوں تو یہ بھی اپنی پاکٹ منی سے نکال رہا ہوں۔سال بھر میں جتنی رقم بچا سکتا ہوں اس پر لگ جاتی ہے،اسی لیے جب مجھے کسی تقریب میں اپنے ذاتی خرچ پر بلایا جاتا ہے تو میں اس لیے معذرت کرتا ہوں کہ اتنے خرچ کی گنجائش نہیں ہے۔یا رسالہ نکالوں یا تقریبات میں شرکت کروں۔سو رسالہ نکالنا زیادہ مناسب لگتا ہے۔ادبی کام کرنے کی توفیق ملنا سب سے بڑا ادبی انعام سمجھتا ہوں۔ادب کی خدمت کرنے کا میرا کوئی دعویٰ نہیں ہے۔میں صرف اپنی ادبی زندگی بسر کر رہا ہوں۔عام زندگی کی طرح ادبی زندگی کی بھی اپنی ایک دنیا ہے۔

آپ سے جو مراسلت ہوئی تھی،اس کی وجہ امریکہ سے سلطانہ مہر صاحبہ کا سوالنامہ تھا۔میں نے آپ کو بھیجا تھا تو اس کے جواب میں ۶ جنوری ۱۹۹۹ء کا لکھا ہوا آپ کا خط ملا تھا۔آپ کے خط کا جواب میں نے ۸ جنوری کو فیکس سے بھیج دیا تھا۔اس پر آپ کا ۹ جنوری کا تحریر کردہ جواب ملا تھا۔یہ مراسلت آپ کی اجازت سے ''اردو دنیا'' جرمنی کے شمارہ اگست ۲۰۰۰ء میں شائع بھی کر دی گئی تھی۔آپ چاہیں تو وہ صفحہ سکین کر کے بھیج دوں گا۔

پوپ کہانی کے سلسلہ میں میرا استفسار صرف اس کے خدوخال کی تفہیم کے لیے ہے۔جوگندر پال جی کے افسانچے پڑھنے کے بعد افسانچے کا تصور واضح ہو چکا ہے۔میں مختصر ترین پیرائے میں پوپ کہانی اور افسانچے کے فرق کو سمجھنا چاہتا ہوں اور اسی تناظر میں عام شارٹ سٹوری اور پوپ کہانی کے فرق کو جاننا چاہتا ہوں۔اسے عام فہم انداز میں مختصراً لکھ دیں تو میرے جیسے کئی اور لوگوں کو بھی سمجھنے میں سہولت ہو جائے گی۔ایوانِ اردو اور گلبن میرے پاس نہیں آتے۔سو آپ کے مذکورہ مضامین اور جوابات میری نظر سے نہیں گزرے۔

آپ کے نیک جذبات کے لیے بے حد شکر گزار ہوں۔اللہ آپ کو صحت و عافیت سے رکھے،ہماری صحت،تندرستی کے لیے دعا فرماتے رہیے۔

آج کا باقی وقت اپنے سفر کی روداد کو مکمل کرنے کی کوشش کروں گا،امید ہے آج اسے مکمل کر ہی

لوں گا۔انشاءاللہ۔

والسلام آپ کا بھائی **حیدر قریشی** **۲۳/اپریل ۲۰۱۲ء**

آپ کی ای میل مل گئی،شکریہ۔''اردو دنیا'' کا پیج ارسال خدمت ہے۔آپ اپنا فون نمبر لکھ بھیجئے۔

آپ کا **حیدر قریشی** **۲۳اپریل ۲۰۱۲ء**

محبت نامے:''اردو دنیا'' جرمنی کے شمارہ:اگست ۲۰۰۰ء میں مطبوعہ پرانی خط و کتابت

یہ خط و کتابت مطبوعہ ''اردو دنیا'' کے صفحہ کو سکین کر کے مقصود الٰہی شیخ صاحب کو بھیجی گئی۔

۹۹/۱/۶

حیدر قریشی صاحب نیا سال مبارک

سلطانہ مہر صاحبہ کا براہِ راست اور اب آپ کی معرفت گوشوارہ سوالات ملا۔بھائی! مجھ پر آج کل یاسیت طاری ہے۔بیچ بیچ میں خوش بھی ہو لیتا ہوں کہ خالقِ دو جہاں ناشکرا نہ سمجھ لے۔سچ پوچھئے تو سب باتیں لاحاصل نظر آتی ہیں۔لکھنے لکھانے کے تعلق سے تازہ خیالات یہ ہیں کہ اس صدی کے دو ایک نام ہی رہ جائیں گے۔جیسے دو صدی پہلے کا ''غالب'' چل رہا ہے۔اپنی جگہ سوچتا ہوں کہ کون سا ایسا تیر مار لیا۔نہ تین میں،نہ تیرہ میں۔بس دل بھرا بھرا ہے۔کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوتی۔جہاں ضرورت محسوس ہوتی ہے وہاں فرض نبھانے کی کوشش کر گزرتا ہوں۔بعد میں وہ بھی کمزور فضول دکھائی دیتی ہے۔دیا بجھنے سے پہلے بھڑکتا ہے،یہاں اس کے بغیر ہی بجھ رہے ہیں۔

بہر حال یاد فرمائی کے لئے ممنون ہوں۔میں تو سمجھا تھا آپ نے بھی دوسروں کی طرح جیسے احمد سعید انور اور نعیمہ ضیاء الدین صاحبہ کی طرح منہ موڑ لیا۔یہی سمجھا کہ اس دنیا میں جہاں کئی قسموں کے تعصب ہوتے ہیں ان میں مذہبی و فرقہ دارانہ زیادہ تگڑا ہوتا ہے۔آپ کو تو ''راوی'' نے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔خیر۔آپ بڑے جذبے سے ماہیے کا پرچم لہراتے بڑھ رہے ہیں۔نوجوان ہیں،جذبہ ہے۔آپ کی لگن قابلِ داد ہے۔میرا خیال ہے یہ میدان آپ نے جیت

ہی لیا ہے۔امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ **مقصود الٰہی شیخ**

نوٹ از ادارہ ''اردو دنیا'': خط دفتر ''راوی'' بریڈفورڈ سے بھیجا گیا۔

از جرمنی **محترم مقصود الٰہی شیخ صاحب** سلام مسنون

آپ کا ۶ رجنوری کا تحریر کردہ عنایت نامہ ملا، شکریہ۔

آپ نے خود پر طاری جس یاسیت کا ذکر کیا ہے اس سے کسی نہ کسی مرحلے میں ہم سب کا واسطہ پڑتا ہے۔سب کچھ لا حاصل یا بے معنی لگنے لگتا ہے۔لیکن صرف ادب ہی کیوں؟ کیا یہ زندگی ہی بے معنی اور لا حاصل نہیں لگنے لگتی؟ اول فنا، آخر فنا، اس کے باوجود اسی زندگی میں کتنی ''جان'' ہے!

ادب اور عبادت دونوں کو میں ''فائدے'' کے حساب سے نہیں سوچتا۔عبادت محض جنت کے حصول کے لیے ہو تو یہ سیدھی سادی رشوت بن جاتی ہے، جبکہ عبادت جب بندے اور خدا کے درمیان تعلق کو قائم کرتی ہے تو عبادت کی لذت ہی اپنا اجر آپ بن جاتی ہے۔ایسے ہی ادب کی تخلیق کا عمل خود ایک لذت آفریں عمل ہے تو پھر بے معنویت اور لا حاصلی کا احساس کیوں؟ ہاں جب بعض مخالفین، حاسدین حسد سے مغلوب ہو کر گھٹیا درجے کی مخالفت کرتے ہیں تو تھوڑا سا دُکھ ضرور ہوتا ہے، لیکن تب ہی یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ شاید خدا نے ہمیں اتنا کام کرنے کی توفیق بخش دی ہے کہ کم ظرف لوگ ہم سے حسد کرنے لگے ہیں۔آپ نے اپنے افسانوں کے ذریعے بھی اور ''راوی'' کے ذریعے بھی ادب کی خدمت کی ہے۔ان خدمات سے انکار کرنے والے ان خدمات کو مٹا تو نہیں سکتے۔سو اُن لوگوں کو اُن کے حال پر چھوڑیں اور خدا کی دی ہوئی صلاحیتوں کو اس کی عطا کردہ توفیق کے مطابق بروئے کار لاتے رہیں۔یہ نیکی ہے اور نیکی کبھی ضائع نہیں ہوتی۔اللہ آپ کو خوش رکھے۔

مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھا کریں۔امید ہے سلطانہ صاحبہ سے آپ نے رابطہ کر لیا ہوگا۔والسلام

نیک تمناؤں کے ساتھ **حیدر قریشی** ۸ /۹۹/۱ **(بذریعہ فیکس بھیجا گیا)**

۹۹/۱/۹

حیدر قریشی صاحب سلام مسنون

آپ نے خط ملتے ہی جواب لکھ دیا۔آپ کا خط میرے لئے تپتی دوپہر میں تازہ ہوا کا جھونکا ہے۔حوصلہ بندھا، میں کوشش کروں گا کہ آپ کی تسلی سے دیر تک تسکین حاصل کروں۔زندگی اسی کا نام ہے، کبھی صبح اور کبھی شام ہے۔میں تو ویسے بھی سمجھتا ہوں کہ شامِ زندگی آ پہنچی۔کوئی سدا نہ جیتا ہے نہ کام ہی کرتا رہتا ہے پھر بھی آپ ایسے ہوشمند اور ذی شعور اس کے کام کا اقرار کریں تو محنت اکارت نہ جانے کا احساس جاں نواز اور مسرت بخش ثابت ہوتا ہے۔بہت بہت شکریہ۔ آپ کا **مقصود الٰہی شیخ**

پ ر ت: سوتے کو جگانے والی ادبیت اس خط میں موجود ہے۔انداز خوبصورت ہے اور تحریر جاندار! سلطانہ مہر صاحبہ کو ابھی کوائف نہیں بھیجے۔کیا اسے آپ کی طرف سے تاکید سمجھوں؟

اس پرانی خط و کتابت کا مطبوعہ صفحہ مقصود الٰہی شیخ صاحب کو بھیجا گیا تو ان کی طرف سے یہ رسید ملی

حیدر بھائی! مختصر نامہ ملا، کیا آپ سے رؤف نیازی کے مضمون کا قفل (اٹیچ منٹ) کھل گیا۔اگر آپ مصروف ہیں تو کتاب مل جانے پر اکٹھا جواب دیجئے گا۔صحت و سلامتی کی دعا و سلام کے ساتھ۔

مقصود ۲۳ اپریل ۲۰۱۲ء

مقصود الٰہی شیخ صاحب کی ایک اور ای میل:

معاف کیجئے گا اپنا فون نمبر لکھنا بھول گیا۔

گھر:

00 44 1274 495462

Mobile:- 00 44 7778 774 694

۲۳/اپریل۲۰۱۲ء

برادرم مقصود الٰہی شیخ صاحب سلام مسنون

آپ کی دونوں ای میلز مل گئیں، شکر گزار ہوں۔فون نمبر محفوظ کر لیا ہے۔میں اپنے سفر کی روداد کو فائنل کرنے میں منہمک ہو گیا تھا۔اسے بروقت لکھ لینا ضروری تھا۔سو اب اسی کام سے فارغ ہوا ہوں۔

رؤف نیازی صاحب کا مضمون پڑھ لیا تھا۔میرے سوالوں کا جواب کہیں ملا ہوتا تو شئیر کرتا۔کسی فرصت میں اطمینان سے اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کریں گے۔ہو سکتا ہے تب مجھے سمجھنے میں آسانی ہو جائے۔بہت سے دوستوں کو جب ماہیا کا وزن عروضی حوالے سے بتاتا تھا تو انہیں کچھ سمجھ نہیں آتا تھا لیکن جب انہیں کوئی ماہیا گنگنا کر بتاتا تھا تو وہ فوراً سمجھ جاتے تھے۔سو ہو سکتا ہے پوپ کہانی کو بھی میں منہ زبانی زیادہ مناسب طور پر سمجھ سکوں۔

کل سے میری صبح سویرے کی ڈیوٹی شروع ہو رہی ہے۔۲۵ سے ۳۰ اپریل تک یہی ڈیوٹی رہے گی۔یہ بہت تھکا دینے والی ڈیوٹی ہوتی ہے کیونکہ اس میں صبح سویرے جاگنا پڑتا ہے۔بہر حال جیسے ہی وقت ملا میں خود آپ کو فون کروں گا۔باقی ای میل سے تو ہمہ وقت رابطہ رہ سکتا ہے۔

باقی۔۔۔۔باقی۔۔۔۔۔والسلام آپ کا بھائی **حیدر قریشی**

۲۳مارچ۲۰۱۲ء

حیدر بھائی،

آپ کا ای میل مل گیا۔ٹیلی فون نمبر نوٹ کر لیا ہے۔پوپ کہانی کے بارے میں، میں قواعد بیان کرنے کا قائل نہیں اس لئے کیا عرض کروں؟ کتاب مل جانے پر آپ کو اس کی شروعات کا پتہ چل جائے گا۔میں نے انگریزی ادب زیادہ نہیں پڑھا اور جو ٹاواں ٹاواں پڑھا اس میں پوپ کا ذکر

میرے علم سے باہر تھا لیکن کتاب میں ممتاز حسین صاحب کا مضمون اس پر روشنی ڈالتا ہے۔اس وقت آپ کو پاکستانی نقاد جناب رؤف نیازی صاحب کا مضمون بھیج رہا ہوں۔شاید آپ کو مطلوب نکتہ مل جائے۔مجھے "اردو دنیا" میں ہماری مراسلت ضرور ارسال فرمائیے۔میں ممنون ہوں گا۔مجھے جیسے کوئی گم شدہ شے مل جائے گی کہ یہ گوشہ میرے ذہن سے مٹا ہوا ہے۔اسی طرح ایک بار مشہور فنکار طلعت حسین ہمارے "راوی" کے دفتر میں آئے، سارا دن رہے۔بی بی سی کے لئے میرا انٹرویو لیا۔میرے بھائی (سالار) انعام عزیز حوم نے بھیجا تھا۔میں اپنے تئیں ادب اور صحافت میں کمتری جانتا رہا ہوں۔انٹرویو اس لئے دینے پر راضی ہوا کہ انعام صاحب بغیر جتائے اپنے دوست کا ٹی اے ڈی بنوانا چاہتے تھے۔خیر یہ بات یونہی سی ہے اس لئے مجھے کیا پوچھا گیا یا کیا کہا گیا، کیا یاد رکھنا تھا؟ دلچسپ بات یہ ہے کی ان کی آمد ایک قصہ بن گئی۔اس کا میرے دماغ میں کوئی نشان نہیں۔گھر والے بتاتے ہیں۔مجھے یقین ہے کہ ایسا ہوا ہوگا۔یہ کہانی یوں شروع ہوتی ہے کہ ہمارا دفتر بہت بڑا تھا۔ورکرز (اور اپنے لئے ایک کینٹین بھی بنوائی گئی تھی۔دفتر کرائے پر تھا۔فریدہ اپنے اور ورکرز کے لئے قبولی بنا رہی تھیں۔طلعت صاحب نے دفتر میں گھستے ہی خوشبو سونگھی اور کہا بندے کو روک دیجئے ریستوران سے کچھ نہ منگوائیے۔میں یہ قبولی ہی کھاؤں گا۔وغیرہ۔بہت سادہ مگر شاندار اور دلچسپ شخصیت ہیں۔اب میں یہ واقعہ مزے لے لے کر سنتا ہوں۔کچھ تفصیل آپ کو لکھ دی۔دراصل میں "راوی" میں پوری طرح غرق تھا اور کچھ کیا؟ سب کچھ آنکھوں سے اوجھل رہتا تھا۔اب ہسپتال جانے کا وقت نزدیک آ رہا ہے۔باقی پھر۔

والسلام،۔ **مقصود** **۲۳اپریل۲۰۱۲ء**

آپ کی کتاب کا تحفہ مل گیا ہے۔ممنون ہوں۔یہ صرف رسید بھیج رہا ہوں۔انشاءاللہ جلد آپ سے بات ہوگی۔

آپ کا بھائی **حیدر قریشی** **۲۷/اپریل۲۰۱۲ء**

سہ ماہی ''اردو'' کے مدیر وسیم فرحت کارنجوی کے نام مقصود الٰہی شیخ صاحب کا ای میل جو مجھے بھی بھیج دیا گیا۔

جناب من

آج ادھر سہ ماہی "اردو" کا سالنامہ ملا، ادھر آپ کو کتاب " پوپ کہانی -۲" وصول ہوگی۔ کچھ ایسا ہی حسن اتفاق ہوا اور ہمارے ستارے بھی ملتے رہیں۔ یو کے اور یورپ میں ابھی کتاب ایشوع نہیں ہوئی ہے۔

میں تھکن سے چور اور نزلے کھانسی سے مغلوب ۲۳ دسمبر کو پہنچا ہوں۔ آتے ہی ڈاکٹر کے یہاں حاضری دی۔ پانچ روز کا انٹی بائیوٹک کورس رات پورا ہو جائے گا۔ خدا کرے میں اٹھ بیٹھوں۔

اسلام آباد میں کتاب پوپ کہانی۔۲ کی تقریب تعارف کے بعد پوپ کہانی کے حق میں کمپیئن تیز ہو گیا ہے۔ امید ہے آپ کو براہ راست رپورٹ آ چکی ہوگی۔ اپنی دلچسپی اور موضوع میں غرقابی کی بنا پر پہلے جناب حیدر قریشی کا مضمون پڑھا۔ تھک گیا، اس لئے مضمون بغور پڑھنے اور رسالہ کی خوبی و خوبصورتی کا مطالعہ اگلے دنوں پر اٹھا دیا لیکن یہ کہوں گا کہ آپ نے محنت کی ہے۔ اللہ اجر دے گا اور اس کے بندے داد۔!!

حیدر قریشی صاحب کے مضمون پر رائے زنی قبل از وقت ہے مگر کہنا پڑے گا کہ (اس کا عتاب مجھ پر) پتہ نہ چلا انہوں نے مغرب و مشرق پر نگاہ کرتے ہوئے کس کا مقدمہ لڑا اور کس کے خلاف دلائل دیئے۔ شاید یہ اچھی تنقید کے ذیل میں آتا ہو۔ میں صاف بات اور بے لاگ تنقید کے حق میں ہوں۔۔ سمجھنے کی کوشش کروں گا۔ ہمت جمع کر سکا تو ان کو بھی پہلے تاثر یا ردعمل کے حوالے سے خط لکھوں گا۔ اپنی کتاب بھیجوں گا۔ وہ ہمیشہ کتاب و رسالہ سے نوازتے ہیں۔ پچھلے دو ماہ کی غیر حاضری سے رابطہ دھیما پڑ رہا تھا۔

والسلام۔ **مقصود الٰہی شیخ**، بریڈفورڈ (یو کے)۔ **۲۸ دسمبر ۲۰۱۲ء**

جنابِ من! بالواسطہ مکتوب ملا اور بلاواسطہ جواب لکھ رہا ہوں۔

میں نے پوپ کہانی کے حوالے سے جو کچھ لکھا، اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق ایمانداری سے لکھا۔ کسی پر عتاب کا میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ بلکہ اس زاویے سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے جناب کی بہت سی شخصی کمزوریوں کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا، انہیں اپنے مضمون میں اشارتاً بھی بیان نہ کیا تھا۔ تاہم اب اگر کسی مضمون میں مجھ پر کسی قسم کا غیر ضروری الزام آیا تو اپنی صفائی کے طور پر ان باتوں کا ذکر ضرور کروں گا، جن سے پہلے شعوری طور پر گریز کیا تھا۔ اب جواباً اور وضاحتاً ان باتوں کے ذکر سے واضح ہو جائے گا کہ میں نے پوپ کہانی کے مسئلہ پر اپنے ایماندارانہ خیالات کا اظہار کرتے ہوئے جن ضمنی باتوں سے صرفِ نظر کیا تھا، وہ اس موضوع کو سنجیدگی سے زیر بحث لانے کے لیے تھا، وگرنہ ان باتوں کی بھی ایک اہمیت تھی جنہیں نظر انداز کر دیا تھا۔

باقی میرا پوپ کہانی کے موضوع پر کسی سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ ایک نئی چیز لائی گئی اور اس کی طرف بار بار توجہ دلائی گئی تو اس کو جاننے اور سمجھنے کے لیے اگر کوئی سوال اٹھاتا ہے اور اچھے پیرائے میں اٹھاتا ہے تو اسے منفی رنگ میں لینا کوئی صحت مند رویہ نہیں ہوگا۔ بہر حال کسی علمی و ادبی موضوع پر بات آگے چلی اور اس میں مجھے کسی صفائی کی ضرورت پیش آئی تو انشاءاللہ دستیاب حقائق کی بنیاد پر جواب ضرور پیش کروں گا۔

مخلص **حیدر قریشی** **۲۸ دسمبر ۲۰۱۲ء**

میرے مخلص، میرے مہربان!۔

سنگ آمد و سخت آمد۔ یار! آپ تو بے بات تپ جاتے ہیں۔ بے عیب اللہ کی ذات ہے۔ میری جن شخصی کمزوریوں سے آپ واقف ہیں ان پر دلجمعی سے روشنی ڈالیئے۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ کسی مضمون کی ضرورت نہیں جب دل چاہے لکھیئے۔ آپ کی تسلی تشفی سے مجھے خوشی ہوگی۔۔

میں میکدے کی راہ سے ہو کر نکل گیا ورنہ سفر حیات کا کافی طویل تھا

آپ پل میں تولہ پل میں ماشہ! من سے نکل گیا ہے۔ کیا کتاب بھیجوں یا پڑھنے کا وقت نہیں ہو گا؟ ابھی نقاہت اور بیماری کی وجہ سے اسی تھوڑے لکھے کو زیادہ سمجھئے۔ والسلام۔ **مقصود**

پ۔ت: اگر آپ نے اپنے خط کی نقل کرنجوی صاحب کو بھیجی ہے تو اس خط کی نقل بھی بے شک ارسال کر دیجئے۔ **۲۸/دسمبر ۲۰۱۲ء**

محترمی مقصود الٰہی شیخ صاحب!

آپ نے کسی ایڈیٹر کو کوئی مکتوب لکھا تھا اور اچھے جذبے سے لکھا تھا تو مجھے اس کی کاپی نہیں بھیجنا چاہیے تھی۔ کاپی بھیجی تھی تو پھر اپنی طرف سے میرے لیے کچھ لکھ دینا چاہیے تھا، تاکہ مجھے بات کا اندازہ ہو جاتا۔

پوپ کہانی کی بحث میں جتنی میری شرکت ہوئی ہے، اس میں آپ کی طرف سے تحریک بھی دلائی گئی تھی، اور بات سے بات نکلتے ہوئے رضیہ صاحبہ کی طرف سے تحریک ملی تھی۔ آپ کے ساتھ اس ضمن میں جو خط و کتابت ہوئی تھی، اس میں کئی ایسی خامیاں تھیں، جنہیں میں تنقیص کے طور پر درج کر سکتا تھا۔ لیکن میں نے ان باتوں کو ضمنی حیثیت دے کر صرف پوپ کہانی کے خدوخال کی طرف توجہ مرکوز رکھی۔ اس میں آپ سے اختلاف کا پہلو نکلا تو اسے بھی احترام کے ساتھ ادبی زبان میں پیش کیا۔ سو میری طرف سے کسی پتھر کی توقع مت کیجیے، جیسے میں احترام کو ملحوظ رکھتا ہوں، آپ اسی طرح درگزر سے کام لیا کیجیے۔ کوئی ادبی بحث علمی دائرے میں چلانا چاہیں تو سر آنکھوں پر! کوئی اختلاف کی بات ادبی انداز میں آئے تو وہ بھی قبول۔۔۔۔ میں آپ کا یہ خط کسی دوست کو بھیجنا مناسب نہیں سمجھتا، کیونکہ پھر اس کا جواب بھی بھیجنا پڑے گا۔

آپ کی صحت، تندرستی کے لیے دعا گو ہوں۔ میری صحت تندرستی کے لیے بھی دعا کیجیے گا۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔

والسلام

آپ کا مخلص

حیدر قریشی **۲۸/دسمبر ۲۰۱۲ء**

---

۲۸ مارچ ۲۰۱۳ء کی ای میل میں پھر میری رائے کے لیے تقاضا کیا۔
اس کے جواب میں میں نے مختصراً لکھا:

محترمی شیخ صاحب! یہ سب شیئر کرنے کے لیے آپ کا شکریہ۔ اس ضمن میں آپ کی طرف سے کوئی پیش رفت نہیں ہوئی، جس سے پوپ کہانی کی تفہیم کا سلسلہ آگے بڑھ سکتا۔ سو بات وہیں کی وہیں ہے۔ جیسے جس کے دھیان میں آئی۔۔۔۔ آپ کا مخلص **حیدر قریشی**

۲۸ مارچ ۲۰۱۳ء

اس کے جواب میں شیخ صاحب نے لکھا:

''**بھائی!** کیا بات کرتے ہیں آپ؟۔ گرامر سے ہٹ کر کیا خیال کی کوئی اہمیت نہیں؟ آپ مایوس کر رہے ہیں۔ **مقصود** **۲۸ مارچ ۲۰۱۳ء**

مطبوعہ **عکاس انٹرنیشنل** سلام آباد۔ شمارہ نمبر ۱۸۔ جولائی ۲۰۱۳ء

امریکہ میں پوپ کہانی کی حقیقت

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی کتاب ''کہانی بول پڑتی ہے'' کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں انہوں نے انگریزی پوپ کہانی کو امریکی اور برطانوی ادب کے حوالے سے سمجھنے کی سنجیدہ کاوش بھی کی۔ امریکہ میں ''پوپ کہانی'' لکھنے والے کارل کنگ وینکلس سے انہوں نے رابطہ کیا۔ ان کے موقف کو جان کر اپنے طور پر دستیاب مواد سے مدد لی، چنانچہ اپنی محنت و تحقیق کے بعد انہوں نے تحریر کیا:

''امریکن لٹریچر میں پوپ کہانی ایک نہایت پختہ نثری صنف کے طور پر پہلے سے ہی موجود ہے اور بہت عرصے سے لکھی اور پڑھی جا رہی ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ پوپ میوزک سے پہلے ہی امریکن لٹریچر میں ''پوپ اسٹوری'' بے حد مقبول ہو چکی تھی تو کچھ غلط نہ ہوگا بلکہ امریکہ میں ایک وقت ایسا تھا کہ پوپ میوزک کی بجائے پوپ اسٹوری زیادہ مقبول تھی اور اس کے رائٹرز راک اسٹارز کی طرح سیلبرٹی کا درجہ رکھتے تھے۔ جن میں ارنسٹ ہمنگوے (Ernest Hemengway) ایڈگر ایلن پو (Edgar Alan Poe) ایف سکاٹ فٹز جیرالڈ (F. Scott Fitgerald) دیومس (Dumas) ار آیل سٹیونسن (R.L Stevenson) جیک لندن (Jack London) او ہنری (O,Henry) اور جارج سمنن (George Simenon) نے ناولوں کے ساتھ ساتھ بہت اچھی پوپ کہانیاں لکھ کر بے حد داد وصول کی۔ دی موسٹ ڈینجرس گیم (The most Dangerous game) اور لیڈی اور دی ٹائیگر (The Lady or The Tiger) اعلیٰ درجے کی خالصتاً پوپ کہانیاں ہیں جو اپنے وقت میں بے حد مقبول ہوئیں۔''

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کے مضمون پوپ میوزک سے پوپ کہانی تک'' سے اقتباس
بحوالہ کتاب ''کہانی بول پڑتی ہے''

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کے اس اقتباس کو بنیاد بنا کر اردو میں ایک صاحب نے خود کوئی تحقیق کیے بغیر انگریزی ادبیات میں ''پوپ کہانی'' کی جڑیں دور تک پہنچا دیں۔ اور پھر اس اقتباس کو اس کے پورے سیاق و سباق کے ساتھ سمجھنے کی بجائے اردو میں پوپ کہانی کا جواز دینے کے لیے اسے بطور سند پیش کر دیا۔ اسے میرے جیسے انگریزی سے نابلد لوگوں کی مجبوری اور انگریزی سے واقف لوگوں کی تساہل پسندی قرار دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے ڈاکٹر رضیہ اسماعیل سے درخواست کی کہ وہ مذکورہ بالا اقتباس میں درج سارے مقبول انگریزی رائٹرز کے بارے میں معلوم کریں کہ واقعی وہ لوگ اپنے دور میں ''پوپ کہانی'' لکھا کرتے تھے؟، ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے بڑی آسانی سے اس بھید کی حقیقت ظاہر کر دی۔ انہوں نے کارل کنگ وینکلس سے رابطہ کیا اور ان سے استفسار کیا کہ کیا یہ بڑے انگریزی رائٹرز خود ''پوپ کہانی'' لکھنے کا دعویٰ کرتے تھے؟، جواب ملا کہ نہیں انہوں نے ایسا نہیں لکھا تاہم ان کی کہانیاں بہت مقبول ہوتی تھیں، اس لیے وہ اصلاً ''پوپ کہانی کار'' تھے۔ انہوں نے یہ بھی اقرار کیا کہ ۱۹۹۰ء کی دَہائی کے آخر میں ''پوپ کہانی'' کا لیبل اختیار کیا گیا۔ امریکہ سے آنے والی اس وضاحت سے پہلے میں اپنے طور پر جو کچھ دیکھ رہا تھا اور اسے جس طرح سمجھ رہا تھا، اس کا اظہار میں نے ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی کتاب ''کہانی بول پڑتی ہے'' میں شامل اپنے مضمون میں مناسب طور پر کر دیا تھا۔ اس مضمون کے تین اقتباس یہاں پیش کر رہا ہوں جو موضوع زیرِ بحث سے متعلق میرے خیالات ہیں۔

۱) ''اگر یہ لفظ محض پاپولر کہلانے کی خواہش کا اظہار ہے تو بات بنتی دکھائی نہیں دیتی۔ کیونکہ پریم چند سے لے کر منٹو تک ہمارے ابتدائی اور اہم لکھنے والوں کی کہانیاں تو اردو میں مقبولیت کے سات آسمان چھو چکی ہیں۔ اور آج بھی کہانی پڑھنے والوں میں مقبول ہیں۔ ان سے زیادہ پاپولر کہانیاں کس نے لکھی ہیں!''

۲) ''پوپ کہانی کیا ہے؟'' کے تحت مغربی دنیا کے پوپ کہانی والے اسے جن اوصاف کے ذریعے واضح کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، وہ سب عمومی اوصاف ہیں، جنہیں تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ادب کی جملہ اصناف میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مجھے ایسے لگتا ہے کہ ادب کو درپیش نئے

چیلنجز کے سامنے بعض لکھنے والے سراسیمگی کی کیفیت میں ہیں۔ایک پاپ اسٹار کی مقبولیت کے سامنے اپنی انتہائی عدم مقبولیت سے دل برداشتہ ہوکر بعض ادیبوں نے جیسے پوپ کہانی کی راہ اپنا لی ہے۔صرف کہانی کیوں؟ آپ ادب کی ساری اصناف کو بھی پوپ کے سابقہ کے ساتھ جوڑ لیجیے۔لیکن اس سے مقبولیت تو ملنے سے رہی۔ادب کے دیار میں قبولیت اور مقبولیت دونوں کی اپنی اپنی جگہ ہے۔کسی ادیب کو اچھا لکھنے کی توفیق مل جانا،قبولیت کے زمرہ میں آتا ہے اور ایک اچھے ادیب کے لیے توفیق مل جانا ہی بڑی بات ہے۔مقبولیت ایک دوسرا موضوع ہے۔سر، دست اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ قناعت پسند ادیب قبولیت پر ہی خوش رہتے ہیں۔آگے جو ملے، نہ ملے،توفیق دینے والے کی مرضی۔''

۳) ''ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے امریکہ کے پوپ کہانی لکھنے والے ایک مصنف کنگ وینکلس سے رابطہ کیا اور ان کی دو منتخب پوپ کہانیوں کو اپنے مجموعہ میں شامل کرنے کی اجازت حاصل کر لی۔''مشین'' اور ''سرخ دروازہ'' کے نام سے ترجمہ کی گئی ان دونوں کہانیوں کا ترجمہ اسماعیل اعظم نے بہت عمدگی سے کیا ہے۔ان دونوں کہانیوں کو پڑھ کر مجھے خوشی ہوئی۔یہ دونوں کہانیاں نیم علامتی پیرائے میں لکھی ہوئی ہیں۔اور وہ جو پوپ کہانی کا مطالبہ تھا کہ کہانی عام فہم لفظوں میں ہو،وہ یہاں پوری طرح ادا نہیں ہوتا۔کہانی ''مشین'' سے مجھے ایسا لگا کہ کنگ وینکلس نئے لکھنے والے ہیں۔ان میں صلاحیت ہے لیکن ابھی تک ادب کی بڑی سطح پر ان کا اعتراف نہیں کیا گیا، یا مناسب پذیرائی نہیں کی گئی۔چنانچہ وہ بڑے لکھنے والوں اور اہم نقادوں کو کہانی میں تمسخر کا نشانہ بناتے ہیں۔''سُرخ دروازہ'' مختلف رنگوں کی علامات کے سہارے کہانی کو دلچسپ اختتام تک پہنچاتا ہے۔دونوں کہانیوں سے ایسا تاثر بھی ملتا ہے کہ امریکہ میں آزادیٔ اظہار کے باوجود بہت کچھ کہنے میں مسائل کا سامنا ہوسکتا ہے۔چنانچہ کنگ وینکلس نے علامات کا سہارا لے کر اپنے مخصوص نیم علامتی پیرائے میں اپنے دل کی بات کہہ دینے کی کوشش کی ہے۔''مشین'' میں تو نیم علامتی پیرایہ نیم سے کچھ زیادہ کھلتا دکھائی دیا تو انہیں آخر میں یہ اضافی نوٹ دینا پڑ گیا:''اس کہانی میں جس سوسائٹی کی منظر کشی کی گئی ہے۔امریکی معاشرے سے اس کی کوئی مماثلت نہیں ہے''۔

ابھی تک ''پوپ کہانی'' کے تعلق سے مجھے جو سوجھ رہا تھا اور میں نے جو کچھ لکھا ہے، مجھے اس کی توثیق ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔یہاں ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی ای میل اور اس

کے جواب میں کارل کنگ وینکلس کی دو ای میلز پیش کر رہا ہوں۔امید ہے اس کے بعد معتبر انگریزی رائٹرز پر کسی اصطلاحی پوپ کہانی کی تہمت نہیں لگائی جائے گی۔

On Tue, Jun 4, 2013 at 6:47 PM, Razia Khalida wrote:

Hello Mr Wenclas

I hope you are fine.

I spoke to you about your "Ten Pop Stories" last year and i also did my own small scale research on the internet about the pop story.

I need your assistance to further clarify the situation about he pop story as at present there is a debate going on among the urdu fiction writers about the validity of pop story that how it differs from any other form of short story as the traits given for a pop story apply to any short story.

During my internet research i found out that Ernest Hemingway, Edgar Alen Poe, F.Scott Fitzgerald, Dumas, R.L.Stevenson, Jack London, O'Henry and George Simenon, apart from writing novels wrote very good pop stories. "The most dangerous game" and "The lady or the Tiger" were very good pop stories of their times.

I wonder if these stories were known as pop stories at that time and the writers actually did use the term pop for them or someone else later on labelled these as pop stories???

It will be very helpful for me to have your views on this.

Additionally,I have spoken to a few English short story writers in the UK and they do not seem to be familiar with this term.

One person mentioned "flash story" which is a very brief form of story writing and as we know this year's Man Booker Prize in the UK has been awarded to the flash/brief story writing.

I will be much obliged to have your response at your earliest convenience.

Kind Regards

Dr R. Ismail

Birmingham.UK

رضیہ اسماعیل کی اس ای میل کے جواب میں کنگ وینکلس نے لکھا:

Date: Tue, 4 Jun 2013 22:43:50 -0400

Subject: Re: Pop Stories by King Wenclas

Dear Dr, Ismail,

To my understanding, the short stories done by writers of the past (Stevenson, O. Henry, et.al.) are pop stories by default. At the time they were published, short stories were popular by definition. In the U.S. they were extremely popular, published in large circulation newspapers and in large circulation magazines like the Saturday Evening Post. F. Scott Fitzgerald made more money, and was more widely known, through his short stories than his novels.

Today, most stories published in the U.S. are "literary" stories, following the standard university workshop model. Their intent isn't to entertain, but to impress literary critics and writing teachers. It's not an accident that the short story has lost its readership. The focus of literary stories is craft, not entertainment. They're a distinctly different kind of short story from those which were once widely read. Today, at least in the U.S., O. Henry and Jack London are scorned by the academy. Robert Louis Stevenson isn't taken seriously. (Then again, at one time rock n roll music wasn't taken seriously. I see the short story fitting a similar pattern as the pop song-- both should be short, punchy, with hooks to interest the listener/reader.)

Those old time writers likely didn't call their art pop stories, but they were considered popular stories. Scott Fitzgerald was criticized by some for spending too much energy writing popular stories. The word "pop" was popularized in the 50's and 60's with pop music, pop art (Roy Lichtenstein; Andy Warhol), and such. The connection with the short story seems obvious. At least to me.

I've used the term "pop" in regard to the short story since the late 90's, when I was a leading zine writer. Other zine writers-- Frank Marcopolos to name one-- were publishing pop stories, and referring to them as pop, at least informally. If literary people in Britain don't use the term, they're behind the times. But then, the short story traditionally was always a more American preoccupation, and least in the short story's heyday. Edgar Allen Poe; Mark Twain; Bret Harte; Frank Stockton; Ambrose Bierce; Stephen Crane; Jack London-- their stories wildly popular, and in style very readable. I'd love to see the short story become that popular again. Writers need to present stories the public will actually enjoy reading.

(Flash fiction, to my mind, is something different. Related, maybe, but inferior.)

I hope these impressions off the top of my head are helpful. I don't know who else writes about these things but myself-- I don't mind being a trailblazer.

Best,

Karl "King" Wenclas

پہلی ای میل بھیجنے کے چند منٹوں بعد کنگ وینکس نے ایک اور ای میل بھیجی اور اس میں اپنے موقف کو کچھ اور واضح کرنا چاہا۔ وہ ای میل بھی دیکھ لیں۔

Date: Tue, 4 Jun 2013 23:00:52 -0400

Subject: Re: Pop Stories by King Wenclas

p.s. I should add that the word "pop" has a dual meaning. It refers to popular-- which the great short story writers undoubtedly were. But "pop" also points to the word populist, which is something a bit different.

At one time, in America, literature was a populist art form, in a way it never was in England. Virtually all the great American writers were populists, through Steinbeck, and maybe the Beats. American literary criticism became noticeably more elitist beginning in the 1950's. Populism refers to the novel. Populist authors took a much broader view of American society than writers do today. Their style, not coincidentally, was geared toward a mass audience, toward a broad public. Simpler and more accessible. Writing technique was a secondary consideration with these authors. (Theodore Dreiser, notably.) One can read the essays of Frank Norris to get a sense of the different viewpoints. Populists like Norris believed that literature belonged to everybody-- not just to a small clique of the well-bred. One of the problems with American literature today is that it's dominated by New York and by those who attended elite Ivy League universities. Tastes are different in other parts of the nation. It's a debate I was involved in when a member of the Underground Literary Alliance last decade.

Well, it's an enormous subject.

-K.W.

امریکی لٹریچر اور برطانوی لٹریچر کے فرق کے معاملہ سے قطع نظر کنگ وینکلس نے خود اعتراف کیا ہے کہ ارنسٹ ہمنگوے (Ernest Hemengway) ایڈگر ایلن پو (Edgar Alan Poe) ایف سکاٹ فٹز جیرالڈ (F. Scott Fitgerald) دیومس (Dumas) ار آیل سٹیونسن (R.L Stevenson) جیک لندن (Jack London) او ہنری (O,Henry) اور جارج سمنن (George Simenon) جیسے

رائٹرز نے اپنی کہانیوں کو کسی مخصوص معنی میں ''پوپ کہانی'' نہیں لکھا لیکن چونکہ ان کی کہانیاں بہت پاپولر تھیں اس لیے وہ پوپ کہانی کار تھے۔ امریکی پوپ کہانی کے حق میں یہ کوئی معقول موقف نہیں ہے۔اس طرح تو اردو میں پھر پریم چند، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، غلام عباس جیسے معتبر اور مقبول کہانی کار بھی پھر پوپ کہانی کار تھے۔حالانکہ ان میں سے کسی نے سُرخاب کا ایسا کوئی پر اپنے سر لگانے کی ''جرات'' نہیں کی۔وہ اچھی کہانیاں لکھتے رہے اور وہ مقبول بھی ہوتی رہیں۔اب انگریزی کے لوگ ہوں یا اردو کے، اگر کسی کی کہانیاں مقبول نہیں ہوتیں تو بھلے نہ ہوں، پر وہ لکھ سکتے ہیں تو انہیں اچھی کہانیاں لکھتے رہنا چاہئے۔لیکن اگر کوئی نہ تو اچھی کہانی لکھے اور نہ ہی مقبول ہو، پھر بھی وہ خود کو مقبول سمجھنے کے لیے، یا مقبول باور کرانے کے لیے پوپ کہانیاں لکھ رہا ہے تو ادبی طور پر یہ ایک مضحکہ خیز صورتِ حال ہوگی۔

پوپ کہانی: کنگ و ینکلس سے رضیہ اسماعیل تک

امریکہ میں اور انگریزی ادب میں پوپ کہانی کے خدوخال پر اتنی بحث نہیں ہوئی جتنی چند برسوں کے اندر اردو ادب میں ہو چکی ہے۔اس کا کریڈٹ سب سے زیادہ ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کو جاتا ہے۔ان کی کتاب ''کہانی بول پڑتی ہے'' کی اشاعت سے پہلے اردو میں پوپ کہانی کا ذکر یک طرفہ اور بیت برائے بیت کی حد تک تھا۔اردو فکشن سے دلچسپی رکھنے والے بیشتر سنجیدہ ادباء ''پوپ کہانی'' کے نام سے پیش کیے جانے والے میٹر کو بطور صنفِ ادب سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔اس سلسلہ میں ڈاکٹر انور سدید، سید ظفر ہاشمی، نیلم احمد بشیر، نجم الحسن رضوی، نوید سروش، لطیف راز، شمشاد احمد وغیرہ کسی لاگ لپیٹ کے بغیر پوپ کہانی کے نام سے پیش کی جانے والی تحریروں کو پہلے سے موجود افسانچے کی صنف ہی قرار دے رہے تھے۔

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے جب پوپ کہانی کے تالاب میں ''کہانی بول پڑتی ہے'' کا پتھر پھینکا تو تالاب میں دائرہ در دائرہ لہریں بننے لگیں۔ایک طرف مختصر ترین کہانی کی کھوج کا سلسلہ شروع ہوا جو شیخ سعدی اور خلیل جبران سے ہوتا ہوا اردو میں منٹو، جوگندر پال اور منشا یاد جیسے پختہ افسانچہ نگاروں تک پہنچا۔یہ سلسلہ مزید تحقیق کی طرف گیا تو ماضی بعید میں ۶۲۰ سال قبل مسیح میں اے سَپ (Aesop) نامی ایک یونانی افسانچہ نگار دریافت ہو گیا، جسے اب تک کی دریافت کے مطابق مختصر کہانی یا افسانچے کا باوا آدم قرار دیا جا سکتا ہے۔قدیم ترین کے ساتھ جدید تر صورت یہ سامنے آئی کہ Shortest Stories لکھنے میں غیر معمولی شہرت کی حامل امریکی مصنفہ محترمہ لِڈیا ڈیوس (Lydia devis) کو سال ۲۰۱۳ء کا بکر پرائز دیا گیا۔ان کے نام کے ساتھ ان کی Shortest Stories کا بطور خاص چرچا ہوا۔اس انگریزی لفظ کا اردو ترجمہ افسانچہ ہی ہو سکتا ہے۔لِڈیا ڈیوس پر پوپ کہانی لکھنے کا کوئی الزام نہیں آیا۔ایک طرف مختصر ترین کہانی کی شناخت مسلسل واضح ہو رہی تھی۔دوسری طرف پوپ کہانی اپنی شناخت کے بحران میں گھر گئی۔ادبی دنیا کے اصرار کے باوجود پوپ کہانی کے خدوخال کو واضح کرنے کی بجائے اسے گرامر کہہ کر جان چھڑائی جا رہی تھی۔افسانچے سے اسے الگ ظاہر کرنے کے سوال کا جواب ہی نہیں دیا جا رہا تھا۔تب

ہی ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے ''کہانی بول پڑتی ہے'' کے ذریعے اردو دنیا کو امریکی پوپ کہانی کا رکنگ وینکلس سے متعارف کرایا۔تب معلوم ہوا کہ کنگ وینکلس صاحب تو معمول کی کہانیوں کو ہی پوپ کہانی کے لیبل کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔ان میں پہلے سے موجود کہانیوں سے ہٹ کر کچھ بھی نہیں ہے،سوائے پوپ کہانی کے نام کے۔

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے کنگ وینکلس سے ہونے والی اپنی برقی خط وکتابت کا کچھ حصہ ''کہانی بول پڑتی ہے''میں شائع کیا۔اس میں موصوف نے انگریزی فکشن کے کتنے ہی بڑے نام یہ کہہ کر گنوا دیئے کہ یہ سب بھی پوپ کہانی لکھتے تھے۔پہلے تو ہمارا فرض بنتا تھا کہ ہم کنگ وینکلس کی پوپ کہانیوں اور ادبی دنیا کی معمول کی کہانیوں میں فرق تلاش کرتے۔لیکن یہ کام تو ہم نے اردو میں پوپ کہانی کے نام سے پیش کی جانے والی تحریروں اور افسانچوں کے درمیان فرق کو سمجھنے اور سمجھانے کی حد تک بھی ضروری نہیں سمجھا پھر انگریزی میں پوپ کہانی کے نام پر پیش کی جانے والی تحریروں پر توجہ کون کرتا۔ہاں کنگ وینکلس کے بیان کو لے کر بعض احباب متعدد معروف ومقبول انگریزی رائٹرز کے نام گنوانے لگ گئے کہ ان سب نے بھی پوپ کہانی لکھی تھی۔تب ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے ایک اور اہم کام کیا۔امریکی پوپ کہانی کا رکنگ وینکلس سے مزید برقی خط وکتابت کی اور ان سے پوچھا کہ آپ نے جن بڑے بڑے ناموں کے بارے میں لکھا تھا کہ وہ بھی پوپ کہانی لکھ چکے ہیں تو کیا ان لوگوں نے پوپ کہانی کے لیبل کے ساتھ اپنی کہانیاں پیش کی تھی۔موصوف کا جواب آیا نہیں،انہوں نے ایسا نہیں لکھا،لیکن چونکہ ان کی کہانیاں بے حد پاپولر تھیں،اس لیے وہ پوپ کہانی کار تھے۔لیجئے صاحب قصہ ہی تمام ہوا۔ہمارے ہاں پریم چند،راجندر سنگھ بیدی،کرشن چندر،سعادت حسن منٹو،غلام عباس جیسے کتنے ہی بڑے افسانہ نگار ہیں جو مقبولیت کے سات آسمان چھو چکے ہیں،تو پھر وہ سب بھی پوپ کہانی کار ہوئے۔لیکن ان میں سے کسی نے پوپ کہانی کا موجد ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔یہ دعویٰ شیخ سعدی،خلیل جبران اور منٹو نے اپنی مختصر ترین کہانیوں کی بنیاد پر بھی نہیں کیا۔

کنگ وینکلس صاحب نے اپنی نئی خط وکتابت میں بتایا کہ انہوں نے ۱۹۹۲ء میں سب سے پہلی پوپ کہانی لکھی تھی۔اور انگریزی میں وہ اس کے بانی ہو گئے۔بات صرف اتنی تھی کہ کنگ وینکلس صاحب اپنے ہاں کے نقادوں سے شاکی تھے،انہیں ان کی توقع کے مطابق پذیرائی نہیں مل سکی تھی،چنانچہ انہوں نے مقبول ہو جانے والی کہانیاں لکھنے کی بجائے اپنی کہانیوں کو پوپ کہانی کا عنوان دے کر خود ہی ان کی

مقبولیت کا اقرار کر لیا۔جبکہ وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں ویسا ان سے پہلے بھی لکھا جا رہا تھا،ان سے زیادہ اچھا بھی لکھا جا رہا تھا اور اس سب پر کسی نے پوپ کہانی کا لیبل نہیں لگایا تھا۔کنگ وینکلس صاحب اپنی کہانی پر اعتماد کرنے کی بجائے پاپولریٹی کے چکر میں پڑ گئے۔اس کے باوجود ادبی اہمیت کے حوالے سے انگریزی ادب میں ان کا کوئی نام ہی نہیں ہے۔نہ تین میں نہ تیرہ میں!

کنگ وینکلس کی جس نئی خط وکتابت کا میں نے ذکر کیا ہے،ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے وہ مجھے فراہم کر دی تھی۔اس کی بنیاد پر میں ایک نیا مضمون ''امریکہ میں پوپ کہانی کی حقیقت'' لکھ چکا ہوں۔یہ مضمون میری آنے والی کتاب ''ہمارا ادبی منظر نامہ'' میں شامل ہے۔پوپ کہانی کے نام پر انگریزی میں جو کچھ ہوا اس کی حقیقت آپ کے سامنے کھول کر رکھ دی ہے۔اردو کے حوالے سے پہلے بہت کچھ لکھ چکا ہوں،مزید کیا کہوں؟ادب سے سنجیدہ دلچسپی رکھنے والے احباب خود ہی اس سارے معاملہ پر غور کریں۔

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ایسے سلیقے کے ساتھ پوپ کہانی کا معاملہ اردو میں پیش کیا کہ اردو میں ہی نہیں انگریزی میں بھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا۔اس لحاظ سے ''کہانی بول پڑتی ہے'' کی اشاعت ایک اہم ادبی واقعہ ہے۔اس کی اشاعت کے نتیجہ میں مزید تحقیق کے در وا ہوئے اور افسانچے کی کہانی ماضی بعید سے لے کر حال تک زیادہ نکھر کر سامنے آئی۔''کہانی بول پڑتی ہے'' کے پورے پس منظر میں یہ ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی بہت بڑی کامیابی ہے۔اس کامیابی پر انہیں مبارک باد پیش کرتا ہوں!

ابھی تک میں نے ان ادبی،تحقیقی امور پر بات کی ہے جو ''کہانی بول پڑتی ہے'' کی اشاعت کے نتیجہ میں موضوعِ بحث بنے اور اس سے اصل حقائق کھل کر سامنے آتے گئے۔اب آخر میں ''کہانی بول پڑتی ہے'' پر لکھے ہوئے اپنے پہلے مضمون کا آخری حصہ یہاں دہرا دینا چاہتا ہوں۔اس سے رضیہ اسماعیل کی کہانیوں کے بارے میں میری رائے بھی واضح ہو جائے گی۔کنگ وینکلس کی دو کہانیوں کے اردو ترجمہ پر بات کرنے کے بعد میں نے لکھا تھا:

''کنگ وینکلس کی دو کہانیوں کے بعد ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے اپنی بارہ کہانیاں شامل کی ہیں۔ان کی پہلی کہانی ''تھرڈ ورلڈ گرل'' کے اختتام تک پہنچا تو ایسا لگا کہ سچ مچ کوئی گونگی کہانی بول پڑی ہے۔''ائر فریشنز'' صرف برطانیہ ہی کی نہیں اب تو یورپ بھر کے پاکستانیوں کی مجموعی فضا کی

ترجمانی کر رہا ہے۔اور ''آنر کلنگ'' پڑھتے ہوئے ایسے لگا کہ کہانی صرف بول نہیں پڑتی بلکہ بعض اوقات چلاّتی بھی ہے۔قبل از اسلام کے مکہ میں زندہ گاڑ دی جانے والی بیٹیوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں بھی جیسے اکیسویں صدی کی انوکھی آنر کلنگ میں شامل ہوگئی ہیں۔تب اس ظلم کو غیرت کے جاہلانہ تصور پر تحفظ حاصل تھا اور اب اسے خود مذہب کے نام پر تحفظ حاصل ہے۔''تھرڈ ڈائمنشن'' برطانیہ میں اسائلم لینے کی سہولتوں سے سچ جھوٹ بولنے کی کسی حد تک چلے جانے والوں کی دلچسپ کہانی ہے۔باقی ساری کہانیاں بھی اپنی اپنی جگہ دلچسپ ہیں۔''ریڈیو کی موت'' کہانی کو میں نے یہ سمجھ کر پڑھنا شروع کیا تھا کہ سیٹلائٹ اور ٹیلی ویژن چینلز کی نت نئی کرشمہ سازیوں کے سامنے ریڈیو کے دَم توڑنے کی کہانی ہوگی۔لیکن یہ تو ایک بھلی مانس سی کہانی نکلی۔لیکن اپنی بھل منسئی کے باوجود کہانی اچھی ہے۔''کہانی بول پڑتی ہے'' میں شامل ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی بارہ کہانیاں ان کے اندر کی افسانہ نگار کا پتہ دیتی ہیں۔یہ کہانیاں برطانیہ میں مقیم پاکستانیوں کی مختلف النوع کہانیاں ہیں۔خامیاں اور خوبیاں، دوسروں کی ہوں یا اپنوں کی، ان سب کو ایک توازن کے ساتھ نشان زد کیا گیا ہے۔کہیں کہیں تبلیغی رنگ غالب ہونے لگتا ہے لیکن صرف ایک دو کہانیوں میں ایسا ہوتا ہے۔ بیشتر کہانیوں کا اختتام جیسے ہلکا سا ادھورا چھوڑ دیا جاتا ہے، لیکن یہ عمل کسی نوعیت کا ابہام پیدا نہیں کرتا، بلکہ قاری خود کہانی میں شریک ہو کر اسے مکمل کر لیتا ہے، کیونکہ اختتامی ادھورا پن ایک واضح اشارا چھوڑ جاتا ہے۔اس سے کہانی کا سادہ بیانیہ ایک رنگ میں علامتی سا بن جاتا ہے۔

مجموعی طور پر ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی یہ کہانیاں اردو افسانے کے سفر کا تسلسل ہیں۔افسانہ غیر مقبول ہے یا سارا ادب ہی غیر مقبول ہوتا جا رہا ہے؟ وہ مقبولیت کے کسی پھیر میں نہیں پڑیں۔ان کے لیے اتنا ہی بہت ہے کہ انہیں یہ کہانیاں تخلیق کرنے کی توفیق مل گئی۔قبولیت نصیب ہوگئی۔ توفیق ملنے کی اس قبولیت پر میری طرف سے دلی مبارک باد!''

(۸ مارچ ۲۰۱۴ء کو ''آگہی'' برمنگھم کے زیر اہتمام ''کہانی بول پڑتی ہے'' کی تقریب میں پڑھا گیا)

انٹرنیٹ میگزین **ادبی منظر** اسلام آباد۔شمارہ: مارچ ۲۰۱۴ء

http://issuu.com/adabi-manzar/docs/adabi_manzar_shumara_1

انتظار حسین کے کالم کے حوالے سے دو وضاحتیں

انتظار حسین کے کالم **مطبوعہ روزنامہ ایکسپریس 9.11.12 بعنوان ''میرا جی... جنازہ کیسے اٹھا، سال کیسے منایا گیا''** کے بعض مندرجات کے حوالے سے دو وضاحتیں کرنا ضروری ہیں۔

پہلے ایک وضاحت۔

''جدید ادب'' کا میرا جی نمبر جولائی ۲۰۱۲ء میں چھپ گیا تھا اور اگست، ستمبر تک پاکستان کے احباب تک پہنچ چکا تھا۔انتظار حسین کو بھی تب ہی رسالہ مل چکا تھا۔اب اس کالم میں انہوں نے ڈیلی ڈان میں پانچ مضامین کے ایک ساتھ چھپنے کو اولیت دی ہے اور یہ تاثر دیا ہے کہ یہ کام پہلے ہوا ہے اور جدید ادب کا میرا جی نمبر بعد میں آیا ہے۔افسوس دانستہ یا نادانستہ دیا گیا یہ تاثر خلافِ واقعہ ہے۔جدید ادب کے میرا جی نمبر کے اعتراف میں کسی کو انقباض ہے تو ویسے ہی اسے نظر انداز کر دیں لیکن حقائق کو مسخ نہ کریں۔

جب انتظار حسین پر کسی طرف سے کوئی دباؤ نہیں تھا یا انہیں کوئی اشارا نہیں ملا تھا تو انہوں نے فراخدلی کے ساتھ میرا جی کا ذکر ان الفاظ میں کیا:

''ویسے تو میرا جی بھی اتنے ہی توجہ کے مستحق ہیں جتنی توجہ کے مستحق فیض اور راشد سمجھے گئے تھے۔۔۔ترقی پسندوں نے جو میرا جی کی مذمت کر رکھی ہے کہ ذہنی طور پر بیمار شاعر ہے۔ذات کی الجھنوں میں پھنسا رہتا ہے۔مریضانہ داخلیت پسندی کا شکار ہے، اس پر مت جایئے۔فیض صاحب کی ترقی پسندی اپنی جگہ مگر جدیدیت کے تصور نے تین شاعروں فیض، راشد، میرا جی کو ایک رسی میں باندھ رکھا ہے یا کہہ لیجیے کہ ایک رشتہ میں پرو رکھا ہے۔اور وہ جو اردو میں جدید شاعری کی روایت قائم ہوئی اس میں ان تین کی حیثیت اس روایت کے بڑوں کی تھی اور اب بھی ہے۔۔۔۔جدیدیت کے تصور سے متاثر نئے ذہنوں نے زیادہ اثر میرا جی سے قبول کیا۔یہ تینوں لاہور میں

موجود تھے مگر نئی شاعری کے رسیا نوجوان میرا جی کے گرد اکٹھے ہوئے۔ میرا جی ان کے گرو بن گئے۔ مختار صدیقی، یوسف ظفر، قیوم نظر، مبارک احمد، ضیا جالندھری، گویا میرا جی کے زیر اثر ایک پورا مکتبہ شاعری وجود میں آ گیا۔ پھر آگے چل کر جو نوخیزوں کی ایک ٹولی نمودار ہوئی اور جو دعویٰ کرتی تھی کہ جدید شاعر تو اصل میں ہم ہیں۔ اس ٹولی نے بھی اپنا رشتہ میرا جی ہی سے جوڑا۔ حالانکہ ان میں ایسے نگ بھی تھے جو فکری اعتبار سے بائیں بازو سے ہم رشتہ نظر آتے تھے۔ اور میرا جی کا معاملہ یہ تھا کہ جتنے وہ جدیدیت کے حامی تھے اتنے ہی قدیم کے رسیا تھے۔ ان کے مجموعۂ مضمون ''مشرق و مغرب کے نغمے'' پر نظر ڈالیے۔ ایک طرف تو وہ مغرب کے ان شاعروں اور ان اہلِ فکر پر لمبے لمبے مضمون باندھ رہے ہیں جنہیں شاعری میں جدیدیت کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے۔ جیسے بادلیئر، میلارمے، والٹ وٹ مین، ڈی ایچ لارنس۔ دوسری طرف بھگتی اور قدیم ہند کے شعراء کے ترجمے کرتے نظر آتے ہیں، جیسے ودیاپتی چنڈی داس، امارو، ساتھ میں میرابائی کے نام لیوا بنے ہوئے ہیں۔ گویا نئی اردو شاعری کی روایت وہ اس طرح قائم کرنا چاہتے ہیں کہ اس میں مشرق اور مغرب کے ڈانڈے ملتے نظر آئیں۔ اور قدیم اور جدید کا امتزاج دکھائی دے۔''

(انتظار حسین کے کالم روزنامہ ایکسپریس۔ ۱۴ مئی ۲۰۱۲ء سے اقتباس)

لیکن جب ادبی سماج کے کسی کونے سے انہیں اشارا ہوا تو ان کی گفتگو کا لہجہ بھی بدل گیا اور ان کا موقف بھی کیا سے کیا ہونے لگا۔ ان کی ادبی اخلاقیات پر کالمانہ ضروریات یوں حاوی ہوگئیں۔

''اب اختر الایمان کی سنیے ''میرا جی اپنے زمانے کا بڑا نام تھا۔ میں نے بمبئی کے تمام ادیبوں کو اطلاع بھجوائی۔ اخبار میں بھی چھپوایا۔ مگر کوئی ادیب نہیں آیا۔ جنازے کے ساتھ صرف پانچ آدمی تھے۔'' وہی جن کا ذکر اوپر آیا ہے۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

ایسے پراگندہ خاطر پراگندہ دل کا جنازہ ایسے ہی اٹھنا تھا اور سال بھی اسی رنگ سے منایا جانا تھا۔''

(کالم مطبوعہ روزنامہ ایکسپریس 9.11.12)

میرا جی کی موت کا انتظار حسین جیسے بظاہر مرنجاں مرنج ادیب نے جس طرح ذکر کیا ہے، یہ

بھی ان کے عمومی مزاج سے لگا نہیں کھاتا۔ میرا جی کی تدفین پر زیادہ لوگوں کا نہ آنا محض اس وجہ سے تھا کہ تقسیم برصغیر کے معاً بعد کا زمانہ تھا، میرا جی کو پاکستانی مان کر اور بھارت کی تب کی دہشت زدہ سیاسی فضا کی وجہ سے لوگوں نے آخری رسومات میں شرکت سے گریز کیا۔ اس بات کو اچھے پیرائے میں بیان کیا جا سکتا تھا۔ تاہم اگر اسی حوالے سے ن م راشد اور مجید امجد کا ذکر کیا جائے تو کیا انتظار حسین اتنی ہی بے حسی اور سفاکی کے ساتھ ان کے انجام کا ذکر کریں گے؟

ن م راشد کی میت کو جلایا گیا، کیا انتظار حسین اسے کریا کرم کہیں گے؟۔۔۔

اسی طرح مجید امجد کی لاش کو گندگی کے ٹرک پر ڈال کر ان کے گاؤں بھیجا گیا۔ کیا اس بے رحمی کا اتنا ہی مزہ لے کر ذکر کریں گے جس طرح انہوں نے میرا جی کی موت کا ذکر کیا ہے، جبکہ میرا جی کی آخری رسومات ان ظاہری باتوں کے حوالے سے راشد اور مجید امجد کے مقابلہ میں کہیں بہتر طور پر ادا ہوئیں۔

یہاں مقصد راشد یا مجید امجد کی اموات اور ان کے ساتھ روا رکھے جانے والے آخری سلوک پر بحث کرنا نہیں ہے، یہ ہمارے معاشرے کی بہت ساری مکروہات کی ایک ہلکی سی جھلک ہے۔ مقصد صرف اتنا ہے کہ میرا جی کی موت کو اتنی سفاکی سے بیان نہیں کیا جانا چاہیے تھا۔ اگر انتظار حسین جیسے تہذیب کے نمائندہ ادیب بھی اپنی برادری کے اہم لوگوں کا اس طرح ذکر کرنے لگے تو پھر اپنی موجودہ تہذیب کی حالتِ زار کا رونا کیسا؟

بحوالہ

http://poetmeeraji.blogspot.de/search?updated-min=2012-01-01T00:00:00-08:00&updated-max=2013-01-01T00:00:00-08:00&max-results

اردو افسانے کے سو سال

آپ اردو افسانے کے سو سالہ سفر کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

نوٹ: اردو افسانہ کے سو سال پورے ہونے پر ایک سوال کی صورت میں روزنامہ جناح اسلام آباد نے ایک ادبی مذاکرہ کا اہتمام کیا تھا۔ منشا یاد کے توسط سے مجھے اس میں شرکت کی دعوت ملی تھی۔ تب میں نے اختصار کے تقاضا کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو کچھ لکھا تھا، اتفاق سے ایک فائل میں مل گیا ہے۔ انتہائی مختصر ہونے کے باوجود اپنے ان تاثرات کو یہاں شامل کر رہا ہوں۔ **(ح۔ق)**

اردو افسانے کی اولیت کا مسئلہ اپنی جگہ تاہم اردو میں افسانے کے تین ابتدائی مرکزی نام ہیں راشد الخیری، سجاد حیدر یلدرم اور منشی پریم چند۔ ان میں سے اولیت کا اعزاز بے شک اول الذکر دونوں ناموں کو علی الترتیب دیا جا سکتا ہے لیکن افسانے کے باب میں پریم چند کی جو تخلیقی خدمات ہیں ان کے باعث افسانے کے باوا آدم بہر حال پریم چند ہی ہیں۔ بعینہ جیسے اردو غزل امیر خسرو سے لے کر قطب شاہی دور تک پنپتی رہی لیکن غزل کے باوا آدم ولی دکنی ہی ٹھہرے۔

اردو افسانہ ایک عرصہ تک مختلف اخلاقی، سیاسی اور سماجی و معاشی قسم کے مقاصد کے تابع رہا۔ تاہم ایسے رویوں میں بھی کئی اہم تخلیقات سامنے آئیں۔ اخلاقی مقاصد کے تحت لکھنے والوں نے تہذیبی روایات کی بقا کے لئے جدو جہد کی، تو رومان نگاروں نے خوابوں کی دنیا سجائے

رکھی۔ ترقی پسندوں نے سماجی اور معاشی انقلاب کی جدو جہد میں تخلیقی طور پر بھرپور شرکت کی تو کسی حد تک حقیقت پسندوں نے جنسی نفسیات کی گرہیں کھولنے میں قدم قدم پر چونکایا۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند اور قیام پاکستان کے نتیجہ میں جو انسانی المیہ سامنے آیا اسے دونوں طرف کے افسانہ نگاروں نے گہرے کرب کے ساتھ لیکن تخلیقی سطح پر بیان کیا۔ اس کے بعد اردو افسانہ سارے پرانے رجحانات کے ملے جلے انداز کے ساتھ اپنا سفر کرتا رہا۔ اس سفر میں کمزور تخلیقی یا تقلیدی اذہان نے ان افسانوی رویوں کے بے تکے اظہار کے کئی نمونے بھی پیش کئے۔ اخلاقی موضوعات کو برتنے والے مصلحین غیر تخلیقی المیے سے دوچار ہوتے دکھائی دیئے تو رومان نگاروں کی رومانویت بھی مریضانہ حد تک گئی۔ معاشی انقلاب لانے والے نعرے بازی کی سطح پر اتر آئے تو جنسی نفسیات پر لکھنے والوں نے جنسی چکا چوند پیدا کرنے کو ہی مطمحِ نظر بنا لیا۔ اس کے باوجود اردو افسانے کو قارئین کی ایک بڑی تعداد میسر رہی۔

پھر یوں ہوا کہ 1958ء میں جنرل ایوب خان کے مارشل لاء کے معاً بعد اردو افسانہ معمول سے زیادہ علامتی پیرایۂ اظہار اختیار کرنے کی طرف مائل ہوا۔ سیاسی جبر کی فضا میں دل کی بات کہنے میں احتیاط کے باعث علامتی پیرایہ تجریدی افسانے کی سطح تک چلا گیا۔ اور یہیں سے قاری کا رشتہ افسانے سے ٹوٹ گیا۔ چند برسوں کی تجریدی مارا ماری کے بعد کہانی نہ صرف افسانے میں واپس آئی بلکہ افسانہ مغربی دین ہونے کے باوجود اپنی مشرقی روایات (داستانوں اور حکایات وغیرہ) سے فیضیاب ہو کر بہتر روپ اختیار کرنے لگا۔ آج کے افسانہ نگار کے سامنے جدید عہد کے مسائل اور ان سے متعلق اہم سوالات ہیں۔ آج کے سارے اہم افسانہ نگار اپنے اپنے تخلیقی دائروں میں ان سوالات کے جواب تلاش کر رہے ہیں۔

بحیثیت کہانی کار اپنے مقامی مسائل سے لے کر عالمی صورتِ حال تک بہت کچھ ہمارے سامنے ہے۔ کمپیوٹر اور دیگر جدید تر ایجادات کے ذریعے ہم خود قدیم داستانوں کے کردار بن چکے ہیں۔ یوں ہمیں داستانوں سے بھی آگے کا بہت بڑا سفر درپیش ہے۔ اس سفر میں کون کتنا سرخرو ہوتا ہے؟ اس کا فیصلہ تو آنے والا وقت کرے گا۔ ایک بات بہر حال طے ہے کہ آج اردو

میں اتنی ہی بڑی کہانی لکھی جارہی ہے جتنی بڑی کسی دوسری زبان میں لکھی جارہی ہے۔ بلکہ بعض ''بڑی عالمی کہانیوں'' سے بڑی کہانی اردو میں لکھی جارہی ہے۔لیکن المیہ یہ ہے کہ افسانے کے ناقدین اپنی اپنی مصلحتوں کے دائرے میں اسیر ہیں اوران کہانیوں کے بیشتر اصل قاری ٹی وی چینلز کی بھول بھلیاں میں کھوئے ہوئے ہیں۔اردو افسانہ سو سالہ سفر میں تخلیقی طور پر سرخرو ہونے کے باوجود دیانتدار ناقدین اوراپنے کھوئے ہوئے قارئین کی تلاش میں ہے۔

▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪

تحریر کردہ: مورخہ 6 فروری 2004ء

مطبوعہ: ادبی صفحہ۔روزنامہ جناح اسلام آباد۔۱۰ فروری ۲۰۰۴ء

ادبی محبت کا قرض

ادبی احباب کی طرف سے بھیجی جانے والی کتابوں میں سے بیشتر کتابوں پر مضامین یا مختصر تبصروں کی صورت میں اظہار خیال کر چکا ہوں۔لیکن ابھی بھی بہت ساری کتابیں ہیں جن پر لکھنا باقی ہے۔اب ایسے وقت میں جب اپنی کتاب ''مضامین اور تبصرے'' کو مکمل کر رہا ہوں اور اسے اپنی چھ کتابوں کے مجموعہ ''ہمارا ادبی منظر نامہ'' کا حصہ بھی بنانے جارہا ہوں تو مجھے احساس ہوا کہ موصولہ کتب میں سے چند بہت اہم کتابوں کا تھوڑا سہی، ذکر کیا جانا واجب ہے۔سو یہاں ایسی کتب کا ہلکا سا ذکر کر رہا ہوں۔

مظفر حنفی کی شعری کلیات کی دو جلدیں ''کمان'' (ص ۴۹۶) اور ''تیزاب میں تیرتے پھول'' (ص ۴۶۶) کے نام سے دہلی سے شائع ہوئی ہیں۔''کمان'' میں ان کے ابتدائی پانچ شعری مجموعے ''تیکھی غزلیں''، ''عکس ریز''، ''صریرِ خامہ''، ''پانی کی زبان''، ''طلسمِ حرف'' شامل ہیں۔ان کے ساتھ ادبِ اطفال سے متعلق نگارشات ''کھیل کھیل میں'' کے زیرِ عنوان شامل ہیں۔ جبکہ ''غیر مطبوعہ متفرقات'' کے عنوان سے وہ شاعری جمع کر لی گئی ہے جو مذکورہ بالا مجموعوں میں تو شامل نہیں تھی لیکن ادبی رسائل اور بیاضوں سے انہیں تلاش کر کے محفوظ کر لیا گیا ہے۔یوں ''کمان'' میں ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۱ء تک کا کلام شامل ہے۔شعری کلیات کی جلد دوم ''تیزاب میں تیرتے پھول'' میں ۱۹۷۱ء کے بعد کے سات شعری مجموعے ''دیپک راگ''، ''یم بہ یم''، ''کھل جا سم سم''، ''پردہ سخن کا''، ''یا اخی''، ''ہاتھ اوپر کیے''، ''آگ مصروف ہے'' شامل ہیں۔جبکہ ۲۰۰۴ء کے بعد سے لے کر ۲۰۱۲ء تک کی غزلیں ''نئی غزلیں'' کے زیرِ عنوان شامل کر لی گئی ہیں۔دونوں کلیات میں ایک صفحہ پر دو غزلیں دی گئی ہیں، یوں ۹۶۲ صفحات میں پیش کی گئی شاعری مروج شعری مجموعوں کے حساب سے ۳۸۴۸ صفحات کا کلام سمیٹے ہوئے ہے۔مظفر حنفی کی کلیات کی جلد اول کا دیباچہ شمس الرحمٰن فاروقی نے اور جلد دوم کا دیباچہ شمیم حنفی نے تحریر کیا ہے اور دونوں نے مظفر

حنفی کی شاعری پر عمدہ اظہارِ خیال کیا ہے۔ مظفر حنفی کی شاعری کو پڑھتے ہوئے ان کے شعری سفر کا ارتقاء سامنے آتا ہے۔ اور یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ مظفر حنفی تخلیقی اعتبار سے، ڈکشن کے لحاظ سے، تجربات کی جہات سے ایک بہتر اور شاندار شاعر ہیں۔ کلام میں سے صرف تبرکاً چند شعر یہاں پیش ہیں۔

''ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے'' اس کی نظروں میں سب حقیر ہوئے
تھوڑا سا التفات میاں یار بادشاہ دینے لگے ہیں زخم دھواں دار بادشاہ
لازم ہے دل میں تیر کے مانند آیئے اب جسم ہو گیا ہے کماں یار بادشاہ
ہزاروں جنّتیں آباد، لاکھوں دوزخیں پیدا تمھاری خودنُمائی سے، ہماری خود پسندی سے
تیغ میری نوادرات میں ہے اور کشکول میرے ہات میں ہے
گرتی رہتی ہے دل پہ شبنم سی جانے کیا بات اس کی بات میں ہے

رشید امجد جدید اردو افسانے کا بے حد اہم نام ہیں۔ ان کے ۱۳۴ افسانوں کا انتخاب ''عام آدمی کے خواب'' کے نام سے اسلام آباد سے شائع ہوا ہے۔ ۵۰۷ صفحات پر محیط یہ انتخاب رشید امجد کی افسانہ نگاری کے پورے سفر کی روداد بن گیا ہے۔ ''بے زار آدم کے بیٹے''، ''سہ پہر کی خزاں''، ''ریت پر گرفت''، ''پت جھڑ میں خود کلامی''، ''دشتِ خواب تک''، اور بھاگے ہے بیاباں مجھ سے'' جیسے افسانوی مجموعوں کے بیشتر افسانے اس کتاب میں شامل ہیں۔ سادہ بیانیہ سے جدید افسانے تک رشید امجد کا سفر ہو یا ترقی پسندی سے صوفیانہ تجربوں تک کی روداد ہو، رشید امجد کے سارے سفر کا مجموعی تاثر ان افسانوں سے بخوبی عیاں ہے۔ میرے لیے تو اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ میں جدید افسانے میں جوگندر پال اور رشید امجد سے بے حد متاثر ہوں۔ تاہم اس کتاب کے شروع میں رشید امجد نے ایسی بات لکھ دی ہے جو سراسر میری اپنی زندگی کی کہانی لگتی ہے۔ رشید امجد لکھتے ہیں کہ:

''یہ کہانیاں ایک عام آدمی کے وہ خواب ہیں جو اُس نے زندگی بھر دیکھے لیکن تمام تر جدوجہد اور خواہشوں کے باوجود تعبیر نہ پا سکے، کیونکہ وہ ایک عام آدمی تھا۔۔۔ سو اُس نے اپنے

خواب اپنے بیٹے کو جو اُسی کی طرح عام آدمی تھا، منتقل کر دیئے، اس امید کے ساتھ کہ جدوجہد ایک نسل سے دوسری، تیسری اور کئی نسلوں تک جاری رہتی ہے، یہ ایک امید ہے کہ شاید کسی دن ان خوابوں کو تعبیر مل جائے۔ یہ کہانیاں اسی خواہش کی مختلف تصویریں ہیں۔''

رشید امجد کی افسانہ نگاری پر ناصر عباس نیر کی یہ رائے بڑی فیصلہ کن ہے:

''ان کا افسانہ اس سے آگے جا کر اس انسانی سیلف کا اثبات کرتا ہے جو تاریخ، روایت اور عصری تناظر، تینوں کو عبور کر جاتا ہے۔ اپنے سوال کا جواب خود مختارانہ انداز میں خود وضع کرتا ہے اور آگے نتائج تاریخ کے سپرد کر دیتا ہے۔ یہ خصوصیت رشید امجد کو اُن جدید افسانہ نگاروں سے ممتاز ثابت کرتی ہے جو محض عصر یا تاریخ و روایت اور ان کی موزونیت و ہم آہنگی کی دریافت تک محدود رہتے ہیں۔''

قیصر شمیم مغربی بنگال میں اردو کے ممتاز شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ غزل، نظم اور گیت نگاری پر انہیں یکساں قدرت حاصل ہے۔ ''ان کی غزلوں کا مجموعہ ''سانس کی دھار'' کے نام سے شائع ہوا تھا اور نظموں اور گیتوں کے مجموعے کا نام ہے ''پہاڑ کاٹتے ہوئے''۔ اس مجموعے کی ایک خوبصورت نظم ''نیا سال'' یہاں پیش کرتا ہوں۔

''اے وقت کی رقاصہ/پھر سال گرہ تیری/کس شان سے آئی ہے/اس سال گرہ پر ہم/کرتے ہیں دعا دل سے/اس سال ترا جوبن/کچھ اور نکھر جائے/اس سال ترا گیسو/کچھ اور سنور جائے/پھر تیری اداؤں سے/اس سال کے آخر تک/جو کچھ بھی گزرنا ہے/وہ ہم پہ گزر جائے!''

ڈاکٹر صادق جدید اردو ادب کی ترویج و اشاعت کے لیے ایک عرصہ سے سرگرمِ عمل ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ ''نظمیں، غزلیں گرد آلود'' کے نام سے دہلی سے شائع ہوا ہے۔ اس مجموعہ میں شامل ''بے خوابی کی آٹھ نظمیں'' کی نظم نمبر ۶ اور غزل کا ایک شعر یہاں پیش کر رہا ہوں۔ اس سے ان کی شاعری کے انداز کا اندازہ کیا جا سکے گا۔

''مِرے آدھے بدن کی/پسلیوں میں/جو سُرنگیں بن رہی ہیں/اُن کے سارے راستے/آنکھوں میں آ کر/مل گئے ہیں!/۔۔۔ اور میں/راتوں میں سورج ڈھونڈتا ہوں!''

عمر کے ڈوبتے جزیرے میں　　چھوڑ کر چل دیا شباب کہاں

ظہیر انور نقاد، سفر نامہ نگار، ترجمہ نگار، ڈرامہ نگار کی حیثیت سے ادبی دنیا میں بخوبی جانے جاتے ہیں۔تھیٹر کے حوالے سے ان کے لکھے ہوئے ڈرامے ہوں یا فن ڈرامہ کی تنقید، انہیں اس حوالے سے خصوصی اہمیت حاصل ہے۔''منظر پس منظر'' تھیٹر کی تنقید پر مبنی ان کے مضامین کا مجموعہ ہے جسے کولکاتا سے شائع کیا گیا ہے۔اس سے پہلے ''ڈراما، فن اور تکنیک'' کے نام سے ان کی ایک تنقیدی کتاب ۱۹۹۶ء میں شائع ہو چکی ہے۔''منظر پس منظر'' تھیٹر اور ڈراما کے موضوع پر اور اس کے جملہ پہلوؤں پر ان کی مضبوط گرفت کی غمازی کرتا ہے۔اس مجموعہ میں ان کے اردو میں بارہ مضامین کے ساتھ ایک انگریزی مضمون بھی شامل ہے۔

برمنگھم، انگلینڈ سے **جاوید اختر چودھری** کے مضامین کے مجموعہ ''شیرازہ'' نے مجھے حیران کر دیا۔یہ ان کے تنقیدی افکار و خیالات کا پہلا مجموعہ ہے۔اگر مجھے شروع سے ان کے اس اندازِ تحریر کا علم ہوتا تو انہیں مشورہ دیتا کہ وہ تنقید نگاری کو اپنی دوسری ادبی اصناف پر ترجیح دیں۔''شیرازہ'' میں ملے جلے مضامین شامل ہیں۔ان میں کچھ رسمی نوعیت کے ہیں، کچھ تقریباتی ضرورت کے تحت لکھے گئے ہیں۔ایسے مضامین میں بھی ان کی تنقیدی سوجھ بوجھ کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہوتا ہے لیکن جن مضامین کو انہوں نے وسیع ادبی تناظر میں لکھا ہے، وہاں ان کے اندر کا شاندار نقاد اپنی علمی شان و شوکت کے ساتھ نمودار ہوتا ہے۔علمی مباحثہ کرتے ہوئے جاوید اختر چودھری دلائل سے پوری طرح لیس ہوتے ہیں اور ان دلائل پر عمدہ جملوں کی تیز نوک بھی چڑھاتے ہیں۔ان کی اس نوعیت کی تنقید میں ڈاکٹر خالد سہیل، بخش لائل پوری، افتخار نسیم اور قیصر حمید کے حوالے سے لکھی گئی تحریریں ان کی واضح شناخت بنتی ہیں۔

ڈاکٹر علی احمد فاطمی معروف ترقی پسند نقاد ہیں۔ان کی دو کتابیں ''فیض۔ایک نیا مطالعہ'' اور ''مجاز شخص و شاعر'' شائع ہوئی ہیں۔فیض صاحب پر علی احمد فاطمی کے مضامین میں کوئی قابلِ ذکر نئی بات نہیں ہے۔تاہم اتنا ضرور ہے کہ یہ کتاب فیض صاحب جیسے عوام اور عام فہم شاعر کو مزید آسان بنا دیتی ہے۔اسے فیض صدی کے تناظر میں دیکھا جائے تو بے شمار رسمی نوعیت کی

کتابوں کی بھرمار میں فیض فہمی کی ایک اچھی کتاب کہا جا سکتا ہے۔''مجاز شخص و شاعر'' میں علی احمد فاطمی کی تحریر زیادہ جاندار لگتی ہے۔شاید اس لیے بھی کہ اس کتاب کے مضامین انہوں نے رسمی طور پر نہیں بلکہ جی جان سے لکھے ہیں۔خراج کا پہلو نمایاں ہونے کے باوجود علی احمد فاطمی نے ترقی پسند انداز نظر کے مطابق مجاز کے بارے میں عمدہ مضامین پیش کیے ہیں۔دونوں کتابیں الٰہ آباد سے شائع ہوئی ہیں۔

ایم نصر اللہ نصر کولکاتا کے قریب ہوڑہ میں آباد ہیں، وہاں انہوں نے ''ہوڑہ رائٹرز ایسوسی ایشن'' قائم کر رکھی ہے، جس کی ادبی سرگرمیوں کا میں خود بھی گواہ ہوں۔ان کا شعری مجموعہ ''امکان سے آگے'' ان کے شعری امکانات کو اجاگر کرتا ہے۔قیصر شمیم کی ادبی تربیت کے نتیجہ میں ان کی شاعری میں ایک نکھار آیا ہے۔چند اشعار پیش ہیں۔

اس کو شک کی بڑی بیماری ہے　　اور شک کا علاج ہے ہی نہیں

کر گئی نم آنکھ کو گیلی ہوا　　یاد تھی اس کی کہ برفیلی ہوا

نصؔر! اکثر سوچتا رہتا ہوں میں　　کہہ گئی کیا مجھ سے شرمیلی ہوا

خود نمائی تمہیں مبارک ہو　　نصؔر جس حال میں ہے بہتر ہے

میں تہہ دل سے دعا کرتا ہوں کہ ایم نصر اللہ نصر کے مزید شعری امکانات بھی کھل کر سامنے آسکیں!

یعقوب نظامی بریڈفورڈ انگلینڈ کی ایک فعال ادبی اور صحافتی شخصیت ہیں۔ان کی ''پاکستان سے انگلستان تک''، ''پیغمبروں کی سرزمین''، ''انگلستان میرا انگلستان'' جیسی عمدہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔اب ان کا نیا سفر نامہ ''یورپ یورپ ہے'' شائع ہوا ہے۔یہ اٹلی، فرانس، بلجیم، جرمنی اور سوئٹزرلینڈ کے سفر کی یادوں پر مشتمل ہے۔ان کا انداز تحریر ہمیشہ کی طرح رواں دواں اور دلچسپ ہے۔

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل برمنگھم کی نہایت متحرک علمی و ادبی شخصیت ہیں۔ان کی علمی و ادبی کار کردگی کی کئی جہات ہیں۔''خوشبو، گلاب، کانٹے'' ان کی شعری کلیات ہے۔۶۷۲ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ان پانچ کتابوں پر مشتمل ہے۔۱۔گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو، ۲۔سب آنکھیں

میری آنکھیں ہیں،۳۔میں عورت ہوں،۴۔پیپل کی چھاؤں میں،۵۔ہوا کے سنگ سنگ۔۔۔۔
ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے غزلیں،نظمیں،نثری نظمیں،ماہیے اور دوہے تمام اصناف کو آزمایا ہے اور ہر صنف میں اپنے تخلیقی جوہر دکھائے ہیں۔''خوشبو،گلاب،کانٹے'' میں اپنا سارا شعری اثاثہ یک جا کر کے رضیہ اسماعیل نے اپنے قارئین کے لیے سہولت مہیا کر دی ہے۔شاعری سے انتخاب:

گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو　　مجھے کانٹوں پہ چلنا آ گیا ہے
زندگی ریت ہوتی جاتی ہے　　کوئی صحرا بنا گیا مجھ کو

نثری نظم **''اُترن''**: عورتیں/اترن پہننے سے گھبراتی ہیں/مگر۔۔/دوسری عورتوں کے شوہر چرا کر/اوڑھ لیتی ہیں!

دوہا: میں سلفے کی لاٹ ہوں سجناں،تو گھبرو پنجابی　　سیدھے راہ پہ آ جا ورنہ ہوگی بڑی خرابی

ولایتی ماہیے: کلچر کا رونا ہے/ آ کے ولایت میں/ اب کچھ تو کھونا ہے
کروے ہیں سکھ ماہیا/ کس کو سنائیں اب/ انگلینڈ کے دکھ ماہیا

نظم ''یاد کے جگنو'': تمہاری یاد کے جگنو چمکتے ہیں/مرے چاروں طرف منڈلا رہے ہیں
یوں/محبت کے شبستانوں میں جیسے اَدھ کھلی کلیاں/معطر سے گلوں کے بازوؤں میں باہیں ڈالے/ناز سے اٹھلاتی پھرتی ہوں!

برمنگھم میں ایک اور شاعر ہیں **پرویز مظفر**۔آپ معروف و ممتاز شاعر و ادیب مظفر حنفی کے صاحب زادے ہیں۔نظم و غزل دونوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔''تھوڑی سی روشنی'' ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ان کی نظموں میں سادگی نثر کی حد تک چلی جاتی ہے،جبکہ غزل میں ان کے جوہر زیادہ کھلتے دکھائی دیتے ہیں۔ایک نظم اور چند اشعار سے میری بات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

''ہم/تمھارے لیے/پیچھے پلٹے/تمھیں سہارا/دینے کے لیے/اپنے ساتھ لینے کے لیے/مگر تم نے تو/ہمیں مجسمہ بنا دیا/برسوں سے وہیں کھڑے ہیں ہم'' **(نظم: ص ۲۰۴)**

کرنی ہے دل بات غزل کی زبان میں　　تم نے ہمیں بھی ڈال دیا امتحان میں
غلط بات پر وہ ستم گر اَڑا ہے　　بپھرتی ندی کے کنارے کھڑا ہے

اُٹھا دیتا کوئی ہمیں بزم سے　　اگر ہم اجازت نہیں چاہتے

اشفاق حسین کینیڈا کے متحرک و فعال شاعروں اور ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔فیض احمد فیض سے ان کی محبت اور عقیدت کو ایک دنیا جانتی ہے۔۱۹۷۴ء میں اشفاق حسین کے ایم اے اردو کے مقالہ کا موضوع تھا ''فیض ایک جائزہ''۔تب سے علمی و ادبی محبت کا جو سلسلہ چلا تھا وہ آج تک قائم ہے۔اس دوران انہوں نے فیض کے حوالے سے مزید کام بھی کیا۔اور فیض صدی تک آتے آتے انہیں موقعہ مل گیا کہ ایک طرف اپنے سارے پرانے لکھے ہوئے کو یک جا کریں،دوسری طرف پرانی یادوں اور باتوں کے ذریعے فیض صاحب پر کچھ نیا بھی لکھا جائے۔چنانچہ انہوں نے اپنی نئی پرانی پانچ کتابوں کو ایک جلد میں جمع کر کے اس کا نام رکھا ''شیشوں کا مسیحا فیض'' اور یوں فیض صاحب کی صدی منالی۔1207 صفحات پر مشتمل یہ علمی و ادبی محبت نامہ ان پانچ کتابوں پر مشتمل ہے۔

فیض شخصیت اور فن،فیض حبیب عنبر دست،فیض کے مغربی حوالے،فیض ایک جائزہ،فیض تنقید کی میزان پر۔

کتاب ''فیض کے مغربی حوالے'' پہلی بار جنگ والوں نے شائع کی تھی اور یہ ایک ہزار صفحات پر مشتمل تھی۔یہاں اس کی تلخیص کر کے اس کو صرف 360 صفحات میں سمیٹا گیا ہے۔اس کے باوجود کتاب مجموعی طور پر 1207 صفحات پر محیط ہو گئی ہے۔اس کتاب کے دو اثرات تو مجھے بالکل سامنے دکھائی دے رہے ہیں۔اشفاق حسین اور فیض صاحب کے تعلق کو دیکھتے ہوئے بعض لوگوں نے فیض صاحب کے ساتھ اپنے رابطہ کی کوئی ایک آدھ کڑی لے کر اس پر اپنے تعلقات کی پوری عمارت کھڑی کر دی۔جس مقامِ ملاقات پر فیض صاحب جس کار کو تقویت پہنچانے گئے تھے،وہ کیا تھا اور اس حوالے سے ان کی کارکردگی کیا تھی؟اس بارے میں کوئی ذکر نہیں ملتا۔بس مصنف موصوف سے فیض صاحب کی تعلق داری ہی کتاب کا حاصل نکلتا ہے۔دوسرے ''شیشوں کا مسیحا فیض'' کی ضخامت کو دیکھتے ہوئے بعض لوگوں نے فیض فہمی کے لیے کتاب کی فربہی کو ہی اہم سمجھ لیا،چنانچہ انہوں نے پھر سارا زور اس پر لگا دیا کہ جیسے تیسے ہو کتاب کی ضخامت ہیبت ناک ہونی

چاہیے۔اس نوعیت کی آنے والی بعض فربہ کتابوں کا المیہ یہ ہے کہ ان میں فیض صاحب کے حوالے سے صرف پہلے سے کہی گئی باتوں کو ہی دہرایا گیا ہے۔

اشفاق حسین نے ''شیشوں کا مسیحا فیض'' میں فیض سے ایک بھرپور ملاقات کرا دی ہے۔تاہم اس ملاقات میں بعض باتیں کھٹکتی بھی ہیں۔''فیض کے مغربی حوالے'' کے نام سے احساس ہوتا ہے کہ مغربی دنیا نے فیض صاحب کا بھرپور اعتراف کیا ہوگا۔لیکن یہاں ایک برطانوی (جو متحدہ ہندوستان کے زمانے سے شناسا تھا) اور ایک امریکی لیڈی کے علاوہ باقی سارے لکھنے والے سابق سوویت یونین سے تعلق رکھتے ہیں۔''فیض تنقید کی میزان پر'' میں وزیر آغا، شمس الرحمٰن فاروقی اور اسی طرح بعض دیگر ناقدین کے بنیادی اختلافی نکات کو ابھارے بغیر فیض کا دفاع کیا گیا ہے، لیکن اگر ان نقادوں کے اختلافی نکات کو پورے پس منظر کے ساتھ دیکھا جائے تو ان کا موقف بے حد مضبوط اور جاندار ہے۔پنڈی سازش کیس کے حوالے سے میں تمام ترقی پسند دوستوں سے گزارش کر رہا ہوں کہ وہ مطالبہ کریں کہ سرکاری سطح پر اس کیس کی تمام خفیہ اور غیر خفیہ فائلیں اب قوم کے لیے کھول دی جائیں۔ہوسکتا ہے اس سے ''پنڈی سازش کیس'' میں ملوث ہمارے سارے ترقی پسند احباب مکمل بے قصور ثابت ہو جائیں۔پاکستانی سرکار کی دستاویزات میں جو بھی حقائق ہیں وہ اب سامنے لائے جانا چاہئیں۔

مجموعی طور پر ''شیشوں کا مسیحا فیض'' اشفاق حسین کی فیض کے لیے محبت کی ادبی روداد ہے۔ایسی محبت جو کسی وقتی ضرورت کا نتیجہ نہیں بلکہ جو چالیس برسوں کے ادبی تعلق پر محیط ہے۔اشفاق حسین سے کتنا ہی اختلاف کر لیا جائے لیکن فیض کے تئیں ان کی ادبی محبت کی سچائی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اشفاق حسین کے تین شعری مجموعوں کا مجموعہ ''میں گیا وقت نہیں ہوں'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔591 صفحات پر محیط اس کتاب میں ''اعتبار''، ''ہم اجنبی ہیں'' اور ''آشیاں گم کردہ'' تین شعری مجموعے شامل ہیں۔اب تک کی ساری شاعری کو یک جا کر دینے کا فائدہ یہ ہے کہ ایک تو تینوں کتابیں ایک جلد میں محفوظ ہوگئیں، دوسرے اشفاق حسین کے شعری سفر کا ارتقائی منظر بھی

پوری طرح سامنے آ گیا۔کسی انتخاب کے بغیر اس کتاب میں سے ایک نظم اور غزلوں سے چار اشعار پیش ہیں۔ نظم **''ڈرتے رہو''**: وہ جو اُتری نہیں ذہن کے سادہ صفحوں پہ/اُس نامکمل عبارت سے/ڈرتے رہو/اپنی مرضی سے/پیدا نہ ہونے کی/اتنی سزا/کچھ زیادہ نہیں/ایک نادیدہ طاقت سے/ڈرتے رہو/اپنے ہونے کے/کربِ ندامت سے ڈرتے رہو/

تعلقات کی یہ برف اور کچھ گھلے ذرا
ہماری خامیوں پہ بھی وہ تبصرہ کرے ذرا

اس زندگی میں کچھ تو تب و تاب چاہیے
آنکھوں کو روز ایک نیا خواب چاہیے

میں نے جو بات بھروسے پہ کہی تھی اُس سے
وہ اسے سُرخیِ اخبار تلک لے آیا

ہم اجنبی ہیں یہاں پر مگر وطن سے کم
دھواں دھواں سا ہے منظر مگر وطن سے کم

نسیم انجم کراچی کی معروف صحافی اور ادیبہ ہیں۔ان کی تحریر کی خوبی ہے کہ کالم لکھتے وقت اس میں ادبی رنگ بھر دیتی ہیں اور ادب لکھتے وقت اپنے اردگرد موجود خبروں سے ادبی تحریر کی بنیاد اُٹھاتی ہیں۔یوں ان کے حالاتِ حاضرہ کے کالموں میں ادبیت اور ان کی ادبی تحریروں میں خبریت کو با آسانی دیکھا جا سکتا ہے۔''گلاب فن اور دوسرے افسانے'' ان کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ ہے۔ان افسانوں کے موضوعات انہوں نے اپنے معاشرے سے ہی لیے ہیں۔ایسے موضوعات جو انسانی اور سماجی المیوں کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور اس حوالے سے ہمیں ہماری ذمہ داریوں کا احساس دلاتے ہیں۔نسیم انجم نے تحقیق و تنقید کے شعبہ میں بھی کام کیا ہے۔اس ضمن میں ان کی تازہ تصنیف ''خاک میں صورتیں اور اردو شاعری میں تصورِ زن'' اہمیت کی حامل کتاب ہے۔

فضا اعظمی کی طویل نظم ''خاک میں صورتیں'' کو انہوں نے اپنا موضوع بنایا ہے اور اردو شاعری میں تصورِ زن کے تناظر میں فضا اعظمی کی نظم کا تجزیہ تصویر کا ایک اور رُخ سامنے لایا ہے۔فضا اعظمی کی نظم میں مسدس حالی جیسے انداز کے ساتھ عورت کی مظلومیت کی تاریخ بیان کی گئی ہے اور پرانے زمانے سے آج کے عہد تک کی روداد ایک خاص فکری پس منظر میں بیان کی گئی ہے۔نسیم انجم نے اسی فکری پس منظر کو مزید نمایاں کرتے ہوئے ادب میں تانیثیت کا ایک نیا زاویہ ابھارنے کی سعی کی ہے۔ابھی تک ادب میں تانیثیت کے حوالے سے مغربی مفکرین کے فرمودات

کو بنیادی اہمیت دی جاتی رہی ہے۔نسیم انجم نے اپنی اس کتاب میں اسلامی فکر کے حوالے سے عورتوں کی مظلومیت کو نمایاں کرنے کے ساتھ ان کے حقوق کی بات کی ہے۔ بیان کردہ بیشتر واقعات بلاشبہ ایک تاریخی حقیقت ہیں اور نسیم انجم نے تانیثی حوالے سے اردو میں لکھنے والی خواتین کے برعکس مغرب کی بجائے اپنی روایات اور اپنی تاریخ کی بنیاد پر اپنا کیس تیار کر کے ایک بامقصد شاعر کی نظم اور دوسرے کلام سے اپنی با مقصد کتاب مکمل کی ہے۔ بے شک وہ اپنے مقصد میں کامیاب دکھائی دیتی ہیں۔

کینیڈا میں مقیم مصور، موسیقار، شاعرہ اور ادیبہ **پروین شیر** ادب اور فن سے پرخلوص وابستگی رکھتی ہیں۔ان کا پہلا شعری مجموعہ ''کرچیاں'' کچھ عرصہ قبل شائع ہوا تھا اور اپنے پیش کش کے انداز کے باعث لوگوں کی توجہ اور دلچسپی کا باعث بنا تھا۔اس کے بعد ان کی مزید دو کتابیں ''نہال دل پر سحاب جیسے'' اور ''چند سیپیاں سمندروں سے'' شائع ہوئی ہیں۔''نہال دل پر سحاب جیسے'' ان کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔''کرچیاں'' کی شاعری کی طرح اس مجموعے میں اردو شاعری کے ساتھ ان کا انگریزی ترجمہ پیش کیا گیا ہے اور ساتھ ہی پروین شیر کی مصوری کے عمدہ نمونے بھی دیئے گئے ہیں۔کتاب حسبِ سابق ''کافی ٹیبل سائز'' کی ہے۔پیش کش کا انداز نہایت خوبصورت ہے۔اس مجموعے کی ایک اور خاصیت یہ ہے کہ اس میں شامل تمام پچاس نظمیں ماں کے حوالے سے کہی گئی ہیں۔

''چند سیپیاں سمندروں سے'' پروین شیر کا سفرنامہ ہے۔ساؤتھ افریقہ اور ساؤتھ امریکہ کا سفر نامہ۔اس میں سفر کی روداد کو بھی اردو کے ساتھ انگریزی میں ترجمہ کر دیا گیا ہے۔مختلف ابواب کی مناسبت سے پروین شیر نے اپنی پینٹنگز بھی سجائی ہیں اور دورانِ سفر کھینچی گئی تصویریں بھی کتاب میں شامل کی ہیں۔اس کتاب کی ایک خوبی یہ ہے کہ کافی ٹیبل سائز کے مقابلہ میں ہاف سائز کر دی گئی ہے۔کتابوں کی منفرد اور پُرکشش پیش کش کے باعث پروین شیر قارئین کو متوجہ کرنے میں کامیاب ہیں۔دونوں کتابیں پڑھنے کے بعد قارئین اپنی رائے خود قائم کر سکیں گے۔

لاہور میں مقیم ٹیلی ویژن کے معروف و ممتاز پروڈیوسر اور اس سے بھی زیادہ شاندار

شاعر **ایوب خاور** کا چوتھا شعری مجموعہ ''محبت کی کتاب'' حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ پہلے تین شعری مجموعوں میں صورت حال یوں تھی کہ شاعر اور ڈرامہ کا ہدایت کار ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔شاعر ہدایت کار سے استفادہ کر لیتا اور ہدایت کار شاعر سے تھوڑی بہت رہنمائی لے لیتا۔لیکن ''محبت کی کتاب'' میں شاعر اور ہدایت کار دونوں یک جان و یک قالب ہو گئے ہیں۔آغا حشر کاشمیری کے زمانے کے تھیٹر میں مکالمات میں شاعری کا رواج رہا ہے۔پھر ہندوستانی فلم 'ہیر رانجھا' میں کیفی اعظمی نے بھی مکالمات کو اشعار کے روپ میں پیش کیا ہے۔لیکن یہ سب روایتی شاعری کے انداز میں پیش کیا گیا۔اب ایوب خاور نے اسی روایت کو تازہ کرتے ہوئے اس میں توسیع کی ہے۔''محبت کی کتاب'' ایک منظوم ڈرامہ ہے لیکن اس میں روایتی انداز کی بجائے جدید نظم کے پیرائے کو اختیار کیا گیا ہے۔ایک ویلنٹائن ڈے سے شروع ہونے والی یہ کہانی اگلے ویلنٹائن ڈے پر اختتام پذیر ہوتی ہے۔ایوب خاور کے اندر کے شاعر اور ہدایت کار نے مل کر اس فن پارے کو خوبصورتی کے ساتھ مکمل کیا ہے۔

ابھی متعدد اور اہم کتابیں مجھے اپنی طرف متوجہ کر رہی ہیں۔خاص طور پر یہ کتابیں۔

شعری مجموعے: ''ہوا کی یورش'' از علیم الدین علیم (کولکاتا)، ''یادیں بھی اب خواب ہوئیں'' از فاطمہ حسن (کراچی)، ''اخلاصِ سخن'' از حلیم صابر (کولکاتا)، ''سفر مقدر ہے'' از احمد کمال حشمی (کانکی نارہ)، ''تم کیا گئے'' از اسحاق ظفر (واہ)۔**افسانوں کے مجموعے**: ''چوتھا فنکار'' از شبیر احمد (کولکاتا)، ''ٹھوکا'' از جاوید اختر چودھری (برمنگھم) ''مرارحتِ سفر'' از ترنم ریاض (دہلی)، ''یمبر زل'' از ترنم ریاض (دہلی)، **متفرق**: ''کتابِ دوستاں'' مضامین از فاطمہ حسن (کراچی)، ''برسبیلِ غالبؔ'' از ڈاکٹر سید معین الرحمٰن (لاہور)، ''برف آشنا پرندے''، ناول از ترنم ریاض (دہلی)، ''ترجمہ آئینۂ فردا میں'' از ایم علی (کولکاتا)، ''کشفِ ذات کی آرزو کا شاعر'' تنقید از طارق حبیب (سرگودھا)، ''تھوڑی سی فضا اور سہی'' مضامین از اشفاق حسین (انٹاریو)۔۔۔۔۔

لیکن ان سب پر لکھنا ، لکھنے کی توفیق ملنے کی صورت میں کسی اور وقت پر اٹھا رکھتا ہوں کہ میری اس کتاب کا کام اب مکمل ہو چکا ہے۔ ■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

انڈیا سے باہر کی اردو دنیا میں

آج کی جدید اردو نظم

قصیدہ اور مثنوی کی روایت رکھنے والی اردو نظم کے دور میں ہی نظیر اکبر آبادی پابند نظموں میں عوامی شاعری کا آغاز کر چکے تھے۔ پھر جب محمد حسین آزاد نے ''رنگِ زمانہ'' بدلنے کی طرف توجہ دلائی تو اس زمانہ کے شعراء نے نئے رنگ کو اختیار کرنے کے لیے اپنے اپنے روایتی ڈھب سے ''جدید نظمیں'' کہنے کی کاوش کی۔ انہی شعراء میں سے مولانا الطاف حسین حالی نے ایک رنگ اپنایا اور پابند اردو نظم کو ایک خاص نہج پر لے آئے۔ علامہ محمد اقبال نے اسی پابند نظم کو اس کے کمال تک پہنچا دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ علامہ اقبال کی پابند نظموں نے پابند نظم کو اس کے کمال تک پہنچا دیا۔ ان کے بعد ترقی پسند شاعروں کا دور آیا تو انہوں نے بھی عمومی طور پر اقبال والے انداز میں ہی اپنے نظریات کا پرچار شروع کیا۔ عین اس وقت جب ایک طرف علامہ اقبال کی سربلند پابند نظم کھڑی تھی دوسری طرف ترقی پسندوں کی بلند آہنگ پابند نظم نے گویا صورِ قیامت پھونک رکھا تھا۔ ایسے ماحول میں چند سر پھرے شاعروں نے اردو میں آزاد نظم کا آغاز کیا۔ میرا جی، تصدق حسین خالد، ن۔م۔ راشد اور بعض دوسرے شعرائے کرام نے بڑے دھیمے لہجے میں آزاد نظمیں کہنا شروع کیں۔

شروع میں ان کی شدید مخالفت ہوئی لیکن یہ لوگ علمی طور پر اپنا موقف تو بیان کرتے رہے لیکن انہوں نے مار دھاڑ والی کسی بحث سے گریز کیے رکھا۔ اور پھر دنیا نے دیکھا کہ ہئیتی طور پر اقبال کی تقلید کرنے والے ترقی پسند شاعر بھی تدریجاً آزاد نظم کی طرف آنے لگے۔ اور نئی نسل بھی اپنے شعری اظہار کے لیے پابند نظم کے مقابلہ میں آزاد نظم کو زیادہ بہتر محسوس کرنے لگی۔ علامہ اقبال کی مقبولیت میں ابھی تک کوئی کمی نہیں آئی لیکن ان کی نظموں کے دلدادہ ہونے کے باوجود نئی نسل کے

شعراء نے نظم کی ہیئت کے معاملہ میں علامہ اقبال کی تقلید کرنے کی بجائے میرا جی جیسے شاعروں کی تقلید کی۔ اقبال کے رنگ میں اور ان کی ہئیت کو اپنانے والوں میں آج ایک بھی صفِ اول کا شاعر دکھائی نہیں دے گا۔ ان کے برعکس اردو نظم کے جدید ناموں میں جتنے بھی اہم اور بڑے نام ہیں وہ سب کے سب میرا جی کی ہئیت کے عمومی انداز میں ہی نظمیں کہنے والے ہیں۔ چھوٹے بڑے ناموں سے قطع نظر آج جتنے بھی آزاد نظم نگار ہیں وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر نظم کی اس ہئیت کو اپنائے ہوئے ہیں، یا اس کی تقلید کر رہے ہیں جنہیں میرا جی جیسے شاعروں نے متعارف کرایا اور اس کے فروغ کے لیے نام ونمود کی خواہش کیے بغیر تخلیقی لگن کے ساتھ خاموشی سے کام کرتے چلے گئے۔

انڈیا سے باہر کی اردو دنیا میں پاکستان کے نظم نگاروں کے ساتھ میں بیرونِ برِصغیر کے اردو نظم نگاروں کا بھی ذکر کروں گا۔ جرمنی میں رہتے ہوئے جن شاعروں اور نظموں تک میری رسائی ہو سکی ہے وہی میرے مضمون کا حصہ رہیں گے۔ جدید اردو نظم کن مرحلوں سے گزرتے ہوئے آج کے عہد تک پہنچی، اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، سو مجھے اس کی تفصیل میں بھی نہیں جانا۔ زمانی طور پر بھی میں صرف اکیسویں صدی کی نظم تک توجہ مرکوز رکھنا چاہوں گا۔

اکیسویں صدی کی نظم اپنے انہیں نظم نگاروں کے جلو میں سامنے آئی جو بیسویں صدی کی آخری ایک دو دہائیوں سے نظمیں کہہ رہے تھے۔ اس کارواں میں مزید نئے لکھنے والے بھی شامل ہوتے چلے گئے۔ ان کے انفرادی میلانات کے مطابق جدید نظم کے رنگ ڈھنگ بھی وہی ہیں جو گزشتہ صدی کی آخری دہائی کی نظم کے تھے۔ تاہم نئی صدی کے آغاز سے ہی دو بڑے واقعات نے کسی نہ کسی طور پوری دنیا پر اپنا گہرا اثر ڈالا۔ ایک سانحہ تو امریکہ میں ورلڈ ٹریڈ ٹاورز سنٹر پر دہشت گرد حملہ کی صورت میں ظاہر ہوا جس نے دنیا بھر کو عمومی طور پر اور پاکستانیوں اور پاکستان کو خصوصی طور پر متاثر کیا۔ دوسرا بڑا واقعہ سائبر کی دنیا میں انقلاب آ جانے اور پوری دنیا کے سمارٹ فون میں سمٹ آنے کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ اس مضمون میں یہ دیکھنے کی کوشش کروں گا کہ آزاد نظم کے داخلی و نفسی مضامین کی روایت کس حد تک مزید آگے بڑھی ہے اور اس کے دوش بدوش

ان نئے اہم ترین واقعات نے ہمارے نظم نگاروں کو کس حد تک اپنی طرف متوجہ کیا ہے اور وہ اس حوالے سے کیا سوچ رہے ہیں۔

غزل اور نظم میں بیک وقت اظہار کرنے والے سینئر شعرائے کرام کے ہاں روایتی مضامین ان کی داخلی کیفیات سے مل کر ایک نئے انداز سے سامنے آتے ہیں۔ چند شعراء کی نظمیں مثال کے طور پر پیش ہیں۔

☆''دریا میں رہنا بھی ہے/ بہنا بھی ہے/ پل پل کچھ کرنا بھی ہے/ بھرنا بھی ہے/ فصلِ غم بونا بھی ہے/ ڈھونا بھی ہے/ مرنے سے ڈرنا بھی ہے/ مرنا بھی ہے''

تہمت ہے مختاری کی۔عبداللہ جاوید (کینڈا)

☆''عشق نے/ بے قراریاں بخشیں/ عشق نے، کب کسے/ قرار دیا/ عشق نے/ پہلے چھین لی دستار/ بعد میں/ پیرہن اتار دیا/ عشق نے/ لمحہ لمحہ زخم دیئے/ عشق نے/ لحظہ لحظہ مار دیا''۔

عشق نے ۔عبداللہ جاوید

☆''آکاش کی سرحد سے پرے تیرا نگر تھا/ صدیوں کا سفر تھا/ میں ذرہء آوارہ تھا اور محوِ سفر تھا/ صدیوں کا سفر تھا/ وہ ساعتِ گم گشتہ کہ میں خود سے نہاں تھا/ کیا جانے کہاں تھا/ تو میری نگاہوں میں تھا میں جسم بدر تھا/ صدیوں کا سفر تھا/ پڑتا تھا تری راہ میں ہر گام سرِ دار/ لمحے تھے کہ تلوار/ کہنے کو تو دو چار قدم پر ترا گھر تھا/ صدیوں کا سفر تھا/ اُس تیرہ مسافت پہ کمر بستہ تھے سارے/ سب چاند ستارے/ نکلا تو مرے ساتھ بس اک نجمِ سحر تھا/ صدیوں کا سفر تھا/ کہتا تھا چلیں شہرِ شفق چل کے بسائیں/ سورج کو منائیں/ اور میرے بدن میں کوئی شعلہ نہ شرر تھا/ صدیوں کا سفر تھا/ لگتا تھا مرا حاصلِ جاں تھا جو کہیں تھا/ معلوم نہیں تھا/ وہ وہم تھا، پرچھائیں تھا جو بھی تھا جدھر تھا/ صدیوں کا سفر تھا/ کرنوں نے فلک پر جو بدن اُس کا تراشا/ تھا طرفہ تماشہ/ سب لوگ یہ کہتے تھے نہیں تھا، وہ مگر تھا/ صدیوں کا سفر تھا'' **صدیوں کا سفر۔رشید قیصرانی**

عبداللہ جاوید اور رشید قیصرانی کی ان نظموں میں زندگی اور عشق کے روایتی مضمون کو داخلی و نفسی کیفیات میں گوندھ کر نفاست کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ دونوں شعراء کے تغزل کی ہلکی

آنچ نے نظموں کے نغماتی آہنگ میں ایک انوکھا سا بہاؤ پیدا کر دیا ہے۔ برصغیر سے باہر بس جانے والے شاعروں اور ادیبوں کے ہاں وطن کی یاد کے مختلف پہلو ملتے ہیں۔ یادِ وطن کا ایک انداز دیکھیں۔

☆''ایک کنیز کی ہے یہ کہانی/ آسائش کے قلعے کے اندر/ بجلی، پانی اور غذا کی/ نادیدہ دیوار میں جس کو/ دھیرے دھیرے/ چُنا گیا ہے/ پیارے وطن کے چھوٹے سے گھر/ تیرا پیار سلامت، لیکن/ اب میں تجھ تک کیسے آؤں؟؟؟'' **انارکلی۔نیّر جہاں** (امریکہ)

وطن کی یاد کی اس کیفیت کے برعکس بعض شعراء کے ہاں نئے حالات اور نئے سماج میں اپنی ذمہ داری کا احساس ملتا ہے۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی بجائے آگے بڑھنے اور کسی مخصوص قوم کے افراد کی بجائے پوری انسانیت کے لیے سوچنے کا رویہ مستحکم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ اس نوعیت کی نظموں میں سے ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی ایک نظم پیش کر رہا ہوں۔

☆''ہمیں اب تیز چلنا ہے/ بہت ہی تیز چلنا ہے/ ہمیں قندیل کی لو تیز کرنی ہے/ اسی قندیل کی لو سے ہمیں/ دل کے کسی تاریک گوشے میں چھپی/ نیکی کی اک ننھی کرن کو ڈھونڈنا ہوگا/ اسے رستہ دکھانا ہے/ جو صدیوں کے سفر میں بھول کر رستہ/ کہیں سہمی، کہیں سمٹی/ سجا کر خواب آنکھوں میں/ ہمارے راستے میں آنکھ بن کر دیکھتی ہوگی/ قدم آگے بڑھاؤ تم/ کہ اب پیچھے پلٹ کر دیکھنے کے/ سارے لمحے کھو چکے ہیں/ سبھی امکان اب گم ہو چکے ہیں/ ہمارے خواب اب تحلیل ہو کر/ وقت کی سولی پہ چڑھنے کے قریں ہیں/ ہمیں نیکی کی اس ننھی کرن سے ہی/ زمانے بھر کی تاریکی میں/ اب سورج اگانے ہیں/ ہمیں بیتی ہوئی صدیوں کے/ سب احساں چکانے ہیں/ ہمیں مرتے ہوئے انسان کو/ پھر سے بچانا ہے/ اسے ارفع.....اسے اعلیٰ.....اسے اشرف..... بنانا ہے!''۔

ہمیں اب تیز چلنا ہے۔رضیہ اسماعیل

ساقی فاروقی برطانیہ میں اردو شاعری کی ایک نمائندہ مثال ہیں۔ انہوں نے برطانیہ میں رہتے ہوئے اپنے پرانے ماحول سے ایک نئی کہانی نکالی ہے اور نظم ''حمل سرا'' میں اسے ایک چونکانے والا موڑ دے کر قاری کو انتظار اور سسپنس کی حالت میں لانے کی کوشش کی ہے کہ دادی

اماں کے مطالبہ پر کیا نتیجہ نکلا؟ ویسے دادی اماں کا مطالبہ فی ذاتہ اتنا دلچسپ ہے کہ قاری کو مزید انتظار کی ضرورت نہیں رہتی۔ فیصلہ کچھ بھی ہو یہی بڑی بات ہے کہ آج کے دور میں پرانی بستیوں میں مقیم دادیاں بھی طلاق مانگنے لگی ہیں۔، استحقاق، چقماق، تریاق، آفاق اور طلاق کے قوافی کے استعمال سے ساقی فاروقی نے اپنی نظم میں ردھم بھی پیدا کر دیا ہے۔ نظم ملاحظہ فرمائیں۔

☆''دادی اماں/(بستی کے سب سے ممتاز گھرانے کی بیٹی/سب سے معزز آنگن کی دلہن/ماشاء اللہ/ستّر کے پیٹے میں ہوں گی)/اپنا استحقاق مانگتی ہیں/دادا جان کہ/دس کم ساٹھ برس تک ان سے/اندھی گھپ کالی راتوں میں/چھپ چھپ کے ملنے آئے/بیوی کی زرخیز آنکھوں میں/صرف اولاد نرینہ کے/خواب اُگا کے چلے گئے/یہ شوہر کے رستے میں/حائل نہ ہوئیں/دل کے ٹکڑے/ہوسٹلوں میں پلے بڑھے/حیف کہ ان کے دکھ سکھ میں/شامل نہ ہوئیں/دادا جان کی سخت طبیعت نے/اس کا موقع ہی نہ دیا/یہ وہ ناطق/جو خاموش رہیں/اُس نازیبا خاموشی میں/آگ لگانے کے دن آئے/اب اپنے چقماق مانگتی ہیں/(ان کے اندر تنہائی کا زہر اترتا چلا گیا/اور زمانہ اردگرد سے/پرچھائیں کی طرح گزرتا چلا گیا)/سوگ میں ہیں/تریاق مانگتی ہیں/ایک جنم تک/اندھی گونگی بہری بن کے/اپنے ہی گھر میں بے دخل/بے قدری کے ''سخی حسن'' میں دفن رہیں/آج نئے آفاق مانگتی ہیں/دادی اماں طلاق مانگتی ہیں''

حمل سرا۔ساقی فاروقی (سخی حسن کراچی کا ایک قبرستان ہے)

ابرار احمد جدید اردو نظم کا ایک معتبر اور اہم نام ہیں۔ روایتی مضمون اور پرانی علامتوں کو انہوں نے نظم کی نئی فضا میں عمدگی کے ساتھ ایسے سمو دیا ہے کہ یہ سب اِسی عہد سے وابستہ باتیں ہیں۔

☆''کوہکن!/پھینک یہ تیشہ اپنا/سر کو ٹکرا کے بہت دیکھ لیا/پتھروں سے کبھی آنسو نہیں ٹپکا کرتے/اک جنوں سے کبھی نہریں نہیں نکلا کرتیں/تیرے ہاتھوں سکت/دل میں وہ وحشت نہ رہی/بیٹھ چشمے کے کنارے پہ/بہا دے آنسو/بھر لے آنکھوں میں یہ سبزہ/یہ مہکتا منظر/آ!/ادھر لَوٹ زمینوں کی طرف/اپنی بستی کو پلٹ/اپنے مکینوں کی طرف/اپنے پھولوں کی طرف دیکھ/انہیں ہاتھ لگا/اُٹھ کے بڑھ اپنوں کی جانب/جو تری راہ میں تھے/اور غیروں پہ نظر کر/اپنی/یہ جو رونق

ہے/لپکتی ہے، لپٹتی ہے ہر اک دامن سے/کوئی دن اس سے نمٹ/اس کے اندر سے گزر/خواب اوڑھے ہوئے/خوابوں سے لدی آنکھوں سے/اور اک رنگِ شب و روز میں ٹھہری دنیا/جتنی بھی ادنیٰ ہے، معمولی ہے/چھوڑ تکرار، گوارا کر لے/جو بھی موجود ہے/اب اس کا نظارہ کر لے/اپنی بے سود محبت سے کنارا کر لے!'' **پھینک دے تیشہ اپنا۔ابرار احمد**

نظم کی آخری لائن پڑھتے ہوئے مجھے بے ساختہ فیض صاحب کی مشہور نظم کا مشہور مصرعہ ''اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو'' یاد آ گیا۔ بظاہر اس مصرعہ کا ابرار احمد کی نظم کی آخری لائن سے کوئی تعلق دکھائی نہیں دیتا لیکن مجھے بہرحال یہ مصرعہ مسلسل یاد آئے جا رہا ہے۔

خاور اعجاز کی نظم کی اپنی الگ آن بان ہے۔ انہوں نے ''کہانی'' سلسلے کی کئی نظمیں پیش کی ہیں۔ ایسی ایک نظم یہاں پیش کر رہا ہوں جو اتنے مختصر ترین الفاظ میں ہزاروں برسوں کے انسانی سفر کا خوبصورت احاطہ کر رہی ہے۔

☆''کہانی!/کہاں سے کہاں تُو مجھے لے کے پھرتی رہی/باغِ جنّت کی رُخصت سے آغاز ہوتی ہے/پانی پہ بہتی ہُوئی ایک کشتی کے ہمراہ چلتی ہے/بازارِ مصر اور سِینا کے صحرا سے ہوتی ہُوئی/شہرِ مکہ میں کچھ دن ٹھہرتی ہے/اور پھر مدینہ کی سمت آ نِکلتی ہے/تیرے مآخذ/پُرانے صحیفوں کے دریاؤں سے پھُوٹتے ہیں/ہزاروں برس کا سفر کر کے آئی ہے تُو/بھید تخلیق کے اپنے الفاظ میں باندھ لائی ہے تُو/کس طرح زِندگی کو بسر کرنا ہے/یہ بتایا مجھے/ضابطے اور قانون اخلاق و برتاؤ کے/سب سِکھائے مجھے/خانہء دِل بھی کافی تھا/لیکن کہا/اپنے رَب کی عبادات کے واسطے گھر بنا/مَیں نے تعمیل کی/گھر کی بنیاد رکھی/ہر اِک اینٹ کے درمیاں میں تری یاد رکھی/مگر اے کہانی!/مرا ذکر ہی/داستانِ محبت میں معدوم ہونے لگا ہے/یہ معلوم ہونے لگا ہے/خود اپنے ہی گھر میں ٹھہرنے کی صورت نہیں اَب/تجھے کیا ہماری ضرورت نہیں اَب!؟''

تجھے کیا ہماری ضرورت نہیں۔خاور اعجاز

جدید نظم لکھنے والوں میں افتخار عارف، خالد اقبال یاسر، ثمینہ راجہ، غلام حسین ساجد، شہزاد نیر، سید ماجد شاہ، حفیظ طاہر، ثروت زہرا، عامر عبداللہ، عطاالرحمٰن قاضی، مسعود منور

(ناروے)،اشفاق حسین (کینیڈا)،شہاب مصطفیٰ (برطانیہ)، شاہین (کینیڈا) ،افضل عباس (ناروے) ،نصر ملک (ڈنمارک)،ڈاکٹر عبداللہ (امریکہ) اور متعدد دیگر شعرائے کرام نے اپنی اپنی ترجیحات کے مطابق عمدہ نظمیں کہی ہیں۔ یہاں تاجدار عادل، احمد صغیر صدیقی اور علی محمد فرشی کی تین نظمیں پیش کر رہا ہوں۔ یہ ان تینوں نظم نگاروں کے عمومی انداز کی ترجمانی بھی کر رہی ہیں اور جدید نظم کے عمومی انداز کا بھی ان سے بڑی حد تک اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

☆''تم اپنے خواب نہ توڑو نہ میں شکستہ کروں/کہ تم نہ چاہو مجھے، میں بھی ترکِ غم نہ کروں/کہ خواب جیسے بھی سہی/خواب تو ہمارے ہیں/کہ یہ متاع کسی کی بھی ہو عزیز تو ہے/کہ درد یہ ہو کسی کا لہو رلاتا ہے/پھر اس کے ساتھ ہی یہ ایک بات اور بھی ہے/کہ تجربہ ہے جراحت کا کچھ تمہیں نہ مجھے/ملے گا زخم تو کیسے اُسے سنبھالیں گے/کسی نے حال جو پوچھا تو کیا کہیں گے۔۔کہو'' **سوال۔تاجدار عادل**

☆''اُدھر/سوچ میں ایک پیمان اس کا/دلِ نارسیدہ میں ارمان اس کا/دیے سے جلاتا/بدن جگمگاتا/نفس در نفس لالہ و گل کھلاتا/اِدھر/تاک میں/اک اُدھڑتی ہوئی رُت کا طوفان کوئی/بکھرنے کا، مٹنے کا اِمکان کوئی/نشانے لگاتا/اُمیدیں اُڑاتا/گزرتا ہوا وقت چہرے پہ گہری لکیریں بناتا!'' **سمتیں۔احمد صغیر صدیقی**

☆''کھیل کی اک عمر ہوتی ہے/جہاں سارے کھلونے ٹوٹ جاتے ہیں/چھنک سے ایک دن۔۔۔/سانس روکے، سنسناتی، خالی رہ جاتی ہیں/گلیاں وقت کی/سُونی کلائیوں کی طرح/جن پر کبھی شیشے کی رنگیں چوڑیاں اٹکھیلیاں/کھیلی نہ ہوں/لاڈلے کنچوں سی عمریں/تالیوں کی پھول جھڑیوں میں بکھر کر ٹوٹتی ہیں/اور اس کے آسمانی منظروں کی اک دلھن/دیکھتے ہی دیکھتے چرخا سجا کر بیٹھ جاتی ہے/دکھوں کی برف جیسی روئی کا/آؤ اپنے خواب سے باہر/چرخ نیلی فام کے ٹکڑے چنیں!'' **نظم۔علی محمد فرشی**

جدید نظم کے اس انداز کے دوش بدوش نسبتاً نئے لکھنے والوں کی نظموں میں کچھ قدرے مختلف بھی سامنے آ رہا ہے۔عمومی نظم کے سامنے جو کچھ قدرے مختلف سامنے آ رہا ہے، اس کی ایک جھلک ان چند نسبتاً نئے نظم نگاروں کے ہاں دیکھا جا سکتا ہے۔

☆''ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا/مرے اجداد نے ورثے میں مجھ کو ڈر دیا ہے/گزرتے پل کو ڈر اور آنے والے کل کا ڈر/خدا کا ڈر ....خدا کے ضابطوں کے چھوٹنے اور ..رابطوں کے ٹوٹنے کا ڈر/تواتر نے مری پشتوں کی پشتوں سے اُبلتے دودھ میں یہ ڈر ملایا ہے/(یہ ڈر اب کس طرح جائے... یہ ڈر اب جا نہیں سکتا)/مرے بیٹے نے کل مجھ کو جگا کر جب کہا بّپا!/تم آنکھیں کھول کر سونا، مجھے ڈر لگ رہا ہے/تو میں اُس وقت بیٹے سے زیادہ ڈر گیا تھا'' **ڈر۔جان عالم**

☆''جیسے کوزے پہ/جھک کر/کبھی روشنی کی مرصع صراحی نے/دو گھونٹ امرت انڈیلا نہیں/جیسے کوزہ نہیں جانتا/اک جھری/نوکِ سوزن سی پتلی لکیر/اُس کے پیندے پہ ہے/کیسے محفوظ رکھے گا پانی/جو اندھے کنویں سے/ہَوا کھانستی ٹوٹیوں/بے نمو گھاٹیوں سے/چٹانوں کی باریک درزوں/تڑختی زمیں کی دراڑوں سے/قطرہ بہ قطرہ/اکٹھا ہوا/جیسے کوزہ نہیں جانتا/آبِ زر/منبعِ نور سے/اک تسلسل کے عالم میں/بوندوں کی صورت ٹپکتا ہے/تر کرتا رہتا ہے/پیاسوں کے لب/پَر بجھاتا نہیں ایک دم تشنگی/ایک میقات ہوتی ہے/کوزے کی/بھرنے کے، رسنے کے مابین/اک رات ہوتی ہے!'' **جیسے کوزہ نہیں جانتا۔رفیق سندیلوی**

☆''مجھے اب یقیں ہو چلا ہے/میں خلقت سے پیچھے کہیں رہ گیا ہوں/اور اب مَیں/زمانے کے قدموں سے/اپنے قدم کو ملانے کی کوشش میں تھک بھی چکا ہوں/جہاں بھیڑ میں/لوگ بہتے چلے جا رہے ہیں/وہاں پر/سڑک کے اُس اگلے کنارے پہ رُک کر/فلک پر رواں/بادلوں سے الجھتی/کئی خواب بُنتی نظر/کے تماشے میں مشغول ہوں مَیں/گزرتے ہوئے وقت کی دھول ہوں مَیں۔''

وقت کی دھول ہوں۔فیصل ہاشمی (ناروے)

☆''دعا کو ہاتھ اٹھاؤں تو دل لرزتا ہے/رگوں میں دوڑتی وحشت بھی کانپ اٹھتی ہے/یہ مرحلہ جو محبت میں ہے مجھے درپیش/اک ابتلا ہے اور اِس کا بیان سہل نہیں/بس اک خدا ہی مرا چارہ ساز ہے لیکن/خدا سے کیسے کہوں بات ہی کچھ ایسی ہے/وُہ حسن جس کے تقدس سے شرمسار تھا عشق/اب اُس کی آنچ مرے دل کو گُدگُداتی ہے/بدن سے آتی ہے بوئے گناہِ ناکردہ/اک آگ سی مرے سینے میں لہلہاتی ہے/مجھے خود اپنے خیالوں سے خوف آتا ہے/خود اپنے ڈر سے مری

سانس پھول جاتی ہے/بس ایک بار دھڑکتا ہے بے طرح مرا دل/اور اس کے بعد مری نبض ڈوب جاتی ہے/گناہ کر نہیں سکتا، گناہ سوچتا ہُوں/میں کیا کروں مری اوقات ہی کچھ ایسی ہے/دعا کو ہاتھ اٹھاؤں تو دل لرزتا ہے/خدا سے کیسے کہوں، بات ہی کچھ ایسی ہے'' **Guilty Love۔احمد حسین مجاہد**

بعض نظم نگاروں نے ''نظم'' کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے اور اپنے اپنے انداز سے اسے دیکھنے اور دکھانے کی کاوش کی ہے۔ یہاں ایسی دو نظمیں پیش کر رہا ہوں۔ عامر سہیل کی نظم سے ترقی پسند زاویے سے نظم کا انقلابی تعارف ہوتا ہے تو انور زاہدی کی نظم سے داخلی کیفیات کی پھوار میں جھلمل کرتی نظم سامنے آتی ہیں۔ دونوں نظمیں اپنی اپنی جگہ ایک خوبصورت تعارفیہ بن گئی ہیں۔

☆''کلیشے توڑتی ہے/نظم شیشے توڑتی ہے/پتھروں میں ہست کی پیوندکاری/حاسدوں کی آنکھ سے گہری کٹاری/کانچ کے بے داغ فرشوں پر/جواہر پھوڑتی ہے/نیلگوں غصہ ہے جاری/یہ بدیسی عورتوں کے جسم سے بڑھ کر کنواری/اک گلابی اور آبی بے حجابی/ہفت خوابی انگلیوں سے/بُن رہی ہے دل کی لابی/جس میں بھوری کہکشائیں/وہ پری خانہ جہاں پوشاک سے عاری ادائیں/بد لحاظی کی حکایت چھانتی ہے/جو جہاں پر جس طرح کے خواب دیکھے/نظم خوابوں کی زبانیں جانتی ہے/ٹوٹے پھوٹے عہد کی گستاخ بے ترتیب سطریں/خوش دلی سے جوڑتی ہے/ملک میں جعلی معزز اس کی باگیں موڑنے کا/قصد کرتے ہیں تو زینہ چھوڑتی ہے/بادشاہوں کو جھڑک دیتی ہے عامر/خلق کو جھنجوڑتی ہے/نظم شیشہ توڑتی ہے۔''**نظم۔عامر سہیل۔**

☆''اسے تحریک کہتے ہیں/جو مل جائے/تو اک لمحہ/نہ ہاتھ آئے تو/کتنے ہی زمانے بیت جاتے ہیں/کبھی بارش کا موسم/اور کبھی ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا/کبھی جب شام ڈھلنے پر/ستارہ آسماں کے نیلگوں آنچل پہ جل اُٹھے/کبھی آنکھوں میں پانی/بن کے آنسو جھلملا جائے/کسی کی یاد کا ٹکڑا/خیالوں میں چمک جائے/تو پھر جو لفظ کاغذ پر اتر آئیں/اُسی کو نظم کہتے ہیں۔''

ایک دوست کے نام نظم۔انور زاہدی

آزاد نظم کی آمد اپنی جگہ ایک بغاوت تھی۔ اس بغاوت میں اس وقت جلتی پر تیل کا کام ہوا جب فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید نے اپنی نظموں میں عورت کے حق کی جنگ شروع کر دی۔ اس

جنگ میں جو اسلحہ استعمال کیا گیا اس کی خطرناک شدت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جب پروین شاکر سامنے آئیں تو خود خواتین کے کیمپ میں ہی کھلبلی مچ گئی۔ پروین شاکر نے خیال کی بے باکی کو یکسر ترک نہیں کیا لیکن اسے ایک لفظی تہذیب سے ضرور آراستہ کر دیا۔ پھر پروین شاکر کے جذبے کی نزاکت اور اظہار کی نفاست نے مل کر انہیں اپنی دونوں پیش رو شاعرات پر سبقت عطا کر دی۔ پروین شاکر نے ''حوّا'' کو ''ہوّا'' نہیں رہنے دیا، پھر سے ''حوّا'' بنا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعد میں آنے والی بیشتر شاعرات نے فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید کی بجائے پروین شاکر سے انسپائریشن حاصل کی۔ خواتین کی شاعری کے اس مروج و مقبول انداز کے ساتھ ساتھ ادا جعفری کی نظمیں بھی نہ صرف ادب میں اپنی جگہ بنا رہی تھیں بلکہ ان کے انداز کو کسی نہ کسی رنگ میں قبول بھی کیا جا رہا تھا۔ ادا جعفری کے انداز کی نشان دہی کے طور پر یہاں ان کی ایک خوبصورت نظم پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

☆''مرے بچے/مجھے جب دیکھنا چاہو/تو بس اپنی طرف دیکھو/تمہارے لب پہ جو حرفِ صداقت ہے/یہی میں ہوں/تمہارے دل میں جو نازِ جسارت ہے/یہی میں ہوں/نگاہوں میں جو اک طرزِ عبادت ہے/یہی میں ہوں/محبت کی طرح میں بھی ہوں بے پایاں/کبھی ظاہر کبھی پنہاں/جہاں تم ہو وہاں تک میری خوشبو ہے/وہاں میں ہوں۔'' **مرے بچے۔ادا جعفری**

بچے اور ماں کے مقدس رشتے کو ادا جعفری نے جس عمدگی سے پیش کیا ہے، اس روایت کو بعد کی شاعرات نے آگے بڑھایا ہے۔ ادا جعفری اپنے بچے سے مخاطب ہیں تو فرحت نواز اور فاطمہ حسن اپنی نظموں میں بچوں کی طرح اپنی ماؤں کا ذکر کر رہی ہیں۔ دونوں نظم نگار اپنے ذاتی تجربوں اور قلبی کیفیات کو یوں بیان کرتی ہیں۔

☆''ماں کے دودھ کو پینے والے/چھوٹے بچوں کے چہروں سے/کتنی معصومی اور کتنا نور چھلکتا رہتا ہے/ایسے نور کی مجھ میں کوئی لہر نہیں ہے/ماں کے دودھ کا ذائقہ تک میں بھول گئی ہوں/سوہنے ربا!/میری ماں کو اتنا عرصہ زندہ رکھنا/میں اس کو بے حد خوش کر دوں/اتنا۔۔۔/جس سے میرا/جنت میں جانا بھی/غیر یقینی نہ رہ جائے/مجھے یقیں ہے/جنت کی نہروں میں ہر دَم بہنے والا

دودھ/یقیناً ماں کے دودھ ایسا ہی ہوگا!'' **دعا۔فرحت نواز**

☆''پہلی بار میں کب تکیے پر سر رکھ کر سوئی تھی/اُن کے بدن کو ڈھونڈا تھا/اور روئی تھی/دو ہاتھوں نے بھینچ لیا تھا/گرم آغوش کی راحت میں/کیسی گہری نیند مجھے تب آئی تھی/کب دور ہوئی تھی پہلی بار/اپنے پیروں پر چل کر/بستر سے الگ، پھر گھر سے الگ/اک لمبے سفر پر نکلی تھی/اپنی انگلی کو تھامے/دھیرے دھیرے دور ہوئی کب/نرم بدن کی گرمی سے/اس میٹھی نیند کی راحت سے/اب سوچتی ہوں/اور روتی ہوں'' **ایک نظم ماں کے لیے۔فاطمہ حسن**

جب ترقی پسند شعراء آزاد نظم کی طرف مائل ہوئے تو ترقی پسند افکار بھی جدید نظم میں آتے چلے گئے۔جمشید مسرور اور خرم خرام صدیقی کی دو نظمیں ایک انداز سے ترقی پسند نظموں ہی کی توسیع ہیں۔بلکہ دیکھا جائے تو دونوں کی پیش کردہ نظموں پر فیض کی شاعری کا اثر صاف دکھائی دیتا ہے۔تراکیب واستعارات سے لے کر نظموں کی مجموعی فضا تک فیض صاحب کا فیض دکھائی دے رہا ہے۔

☆''عکسِ محبوب مہکتا ہی چلا جاتا ہے/شمع رُخسار لئے وعدۂ دلدار لئے/جنتِ چشم ولبِ یار سے خورشید بکف/جاں کی تنہائی میں قندیلِ صبا اترے گی/نور سے دکھ کے سیہ راستے دُھل جائیں گے/ریگزاروں کی جبینوں سے گھٹا اترے گی/ذہن سے رُوح کی ویران گزرگاہوں تک/نکہت و رنگ کے گلبار دریچے آخر/شوق کی دستکِ بے تاب سے کھل جائیں گے/اسی امید میں شاید کوئی جھونکا آئے/اور چپکے سے کوئی درز، کوئی چاک کھلے/چاندنی دل کے کواڑوں سے لگی بیٹھی ہے''۔

منتظر۔جمشید مسرور (ناروے)

☆''سحر کے انتظار میں تمام خواب سو گئے/چراغ بجھ گئے طویل رات کے حصار میں/کہیں پہ ٹمٹمائی گر کسی نظر کی روشنی/مہیب آندھیوں نے اک غبار میں بدل دیا/کہیں پہ جھلملائی یاد کی کوئی کرن اگر/تو خامشی کے اژدہوں نے اس کو بھی نگل لیا/سحر کے انتظار میں مگر یہ دل تھا پُر یقیں/کہ آئے گا نظر ابھی ترے جمال کا قمر/نثار ہوگا دل ترے رخِ حسیں کی تاب پر/فگار ہوں گی انگلیاں بس اک نگہ کی آب پر/چمک اٹھے گی تیرے لب کی احمریں شگفتگی/جلے گی دل کی انجمن میں پھر سے شمعِ

وصال/سحر تو آ گئی یقیں کی روشنی چلی گئی/بہم تو ہم ہوئے مگر وہ دلکشی چلی گئی''۔

سحر کے انتظار میں۔۔۔خرم خرام صدیقی

بعض نظم نگاروں کی ترقی پسند مزاج سے ملتی جلتی نظمیں سچ اور جھوٹ کو الگ الگ کرتے دکھائی دیتی ہیں۔کاوش عباسی، واحد سراج اور شاہین مفتی نے اپنی نظموں میں ترقی پسند روایت سے تعلق کے باوجود اپنے داخلی تجربات کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔

☆''وہ بھی جھوٹ تھا/تو پھر اس کو چھوڑو/دوسرے جھوٹ سے ہاتھ ملاؤ/جو پہلے جھوٹ سے کچھ تو زیادہ مہذب/کچھ تو زیادہ انسانی ہے/اپنے کتنے ٹکڑے کرواؤ گے/خود کو کتنا کھبواؤ گے/زہر تو زہر ہے/تمہارا وجودی مادہ اس میں ضم نہیں ہوگا/اپنے مہر کو/اپنے سبھاؤ کو/اپنے وجود کو کتنا گھٹاؤ گے/کتنا نظر انداز کرو گے، کتنا نظر انداز کراؤ گے/دُوسرے جھوٹ سے ہاتھ ملاؤ/لیکن یاد رکھو/اس میں بھی کھب نہیں جانا/اُس کو خود میں کھبو نہیں لینا/پہلے جھوٹ کو چھوڑو/دوسرے جھوٹ کو گلے لگاؤ/اُس سے کھیلو/لیکن جھوٹ کو جھوٹ ہی سمجھو/اُس کو اپنا سچ نہ بتاؤ''۔

وہ بھی جھوٹ تھا۔کاوش عباسی (سعودی عرب)

☆''تمام الفاظ سر بریدہ/تمام جذبے بدن دریدہ/جو سچ تھا وہ سامنے نہیں تھا/جو سامنے تھا، وہ سچ نہیں تھا/سراب نیرنگ وا ہے تھے/عجب روایت تھی اُس نگر کی/جو سچ تھا وہ بولتے نہیں تھے/جو بولتے تھے وہ سچ نہیں تھا/اور ایک ہم تھے/کہ صبحِ کاذب کے ملگجے کو/سحر سمجھ کر دیے بجھانے نکل پڑے تھے/بجھے دیے نے جو غم کی کالک سے/جھوٹ کی داستان لکھی/کسے سنائیں؟/ہم ایک ہونی سے ڈر رہے تھے/وہ رُوبہ خورشید ریت تھی/جس کو زر سمجھ کر/ہم اپنے دامن میں بھر رہے تھے/جو اپنی کم مائیگی پہ نادم تھے/اپنی بے مائیگی پہ نادم تھے/اپنی بے مائیگی کا قصہ/کسے سنائیں/کسے سنائیں؟'' **کسے سنائیں۔واحد سراج** (ایبٹ آباد)

☆''جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے ہیں/پھر بھی ہم ڈھونڈتے پھرتے ہیں اسے/کیا خبر کون سے رستے پہ کہاں/وہ سمندر کے کنارے پہ ملے/سُرخ بتی کے اشارے پہ ملے/یا کسی اور ستارے پہ ملے/بند کمرے میں چھپا بیٹھا ہو/سبز وعدوں کی کماندار پناہوں میں کہیں/سلسلہ وار سوالوں کی

نگاہوں میں کہیں/ یہ بھی ممکن ہے کہ زینے کے تلے/ملگجی شام کو پہلو میں لیے/ بند ہوتے ہوئے کھلتے ہوئے دروازے میں/ہم سے ٹکرا کے گزر جائے کہیں/اس ملاقات کی صورت کیا ہو/اس ستم گر کی شباہت کیا ہو/اس کی پوشاک کی رنگت کیا ہو/اُس پہ پھر رنگِ طبیعت کیا ہو/اس مدارا کی قیمت کیا ہو/جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے ہیں'' **جھوٹ کے پاؤں۔شاہین مفتی**

یہاں یہ نشان دہی کرنا ضروری ہے کہ جدید عہد کی تمام حیرت انگیز ایجادات سے ہم سب مستفیض ہو رہے ہیں۔خصوصاً گلوبل ولیج کی جو صورت سامنے آئی ہے اس کی برق رفتاری سے لطف اندوز تو ہو رہے ہیں لیکن ان کے پس پشت جو اسرار ہیں، ہم انہیں دیکھنے کی طرف مائل نہیں ہو سکے۔ ہمارے نظم نگار سامنے کی حیرتوں کو بھی نظموں میں کسی روپ میں نہیں لا سکے۔البتہ وسیع تر کائنات کے اسرار و رموز پر اپنے اپنے انداز میں غور و فکر کا سلسلہ کسی نہ کسی طور جاری ہے۔مختلف نظم نگار اپنے اپنے فکری ظرف کے مطابق ان پر خامہ فرسائی کر رہے ہیں۔

نصیر احمد ناصر جدید نظم کے ایک اہم شاعر ہیں، انہوں نے اپنی نظم میں کائناتی وسعتوں سے ہوتے ہوئے آج کے ایسے کرداروں کی نشان دہی کی ہے جو کسی بلیک ہول کی طرح اپنی ہی انا/خود پرستی کی کشش میں بند پڑے رہتے ہیں۔

☆''مجھے تم دور لگتے ہو/افق کی آخری قوسوں کے بیچوں بیچ/اک موہوم سے فلکی جسیمے کی طرح/خاموش اور تاریک/اپنی ہی کشش کے دائمی قیدی/کسی بھی دوسرے ذی روح کے احساس سے عاری/بہت بھاری!'' **سنو، بلیک ہول آدمی!۔نصیر احمد ناصر**

اختر رضا سلیمی نے مہاتما بدھ ہونے کا دعویٰ کیے بغیر گوتم بدھ کے ایک بھکشو کے ذریعے کائنات کو پانچویں بُعد سے دیکھنے کی بات کی ہے۔جستجو اور انکشاف کے کسی درمیانی پڑاؤ میں لکھی گئی نظم ملاحظہ کریں۔

☆''ہم اب تک اسے چار ابعاد سے دیکھتے اور پرکھتے رہے/مگر ایک بھکشو نے کل رات مژدہ سُنایا/کہ یہ کائنات طویل و عریض و عمیق و قدیم/پانچویں بُعد سے دیکھے جانے کی حق دار ہے/اور وہ پانچواں بُعد دُکھ ہے/محبت کا دُکھ/ازل سے جسے بُعد ہی راس ہے/اسی بُعد نے قُربتوں کو مٹا کے

ہمارے لیے حُسن کی/دل کشی کو بڑھایا/یہ ہر آن بڑھتی ہوئی حسن کی دل کشی، زندگی کی/علامت ہے/یہ ہجر سب کی بقا کی ضمانت ہے/وصل اک قیامت ہے/سو قبل اس کے کہ پھر وصل آغاز ہو/ہم اسے پانچویں بُعد کی معرفت سے/سمجھنے کی کوشش کریں/عین ممکن ہے الجھی ہوئی ڈوریاں خود سلجھنے لگیں'' **پانچواں بُعد۔اختر رضا سلیمی**

ابرار احمد کی نظم معرفتِ ذات کو ایک المیہ کی صورت میں بیان کر رہی ہے۔

☆''جو سر میں بھر گئے ہیں/انگلیوں میں سرسراتے/آنکھ میں کانٹے اُگاتے ہیں/انہی لفظوں سے لکھ دیکھو/بیاں ممکن نہیں ہے/اس کا جو تم جھیلتے ہو/کہ پہلی آنکھ کھل جانے سے/لمبی تان کر سونے کا عرصہ بوجھ ہوتا ہے/سو کندھے ٹوٹتے، ٹخنے تڑختے ہیں/دُکھن ہوتی ہے/بوجھل پن میں/گدلی گونج چکراتی ہے/برتن ٹوٹتے، بجتے ہیں/بجتے، ٹوٹتے رہے ہیں/آنگن میں، رسوئی میں/کوئی صورت بدلتی دھندسی ہے/گھاس کے تختوں پہ/کیچڑ سے بھری راہوں میں/چکنے فرش پر/دن کی سفیدی میں/سنہری خواب کے لہراتے اندر میں/تمہاری ہی طرح کے لوگ/بالوں سے پکڑ کر کھینچتے ہیں/راستوں پر/بے حیائی سے/بہت تذلیل کرتے ہیں/کوئی ملبوس ہو/کوئی قرینہ ہو/اُدھڑ جاتا ہے آخر کو/کناروں پر ہے خاموشی/چھدی تاریکیاں ہیں/کیا کرن کوئی تمہاری ہے؟/کوئی آنسو، کوئی تارہ/تمہیں رستہ دکھائے گا؟/کوئی سورج تمہارے نام سے چمکے گا آخر کو؟/حقیقت تھی سوالِ اوّلیں اور بس/اور کے بعد یہ کیا ہے؟/فقط خفت ہے/ننگی بے حیائی ہے، ڈھٹائی ہے/جئے جاؤ ندامت میں/مگر لکھتے رہو/دیوار سے سر مار کر/کہ عظمت خبط ہے/اک واہمہ ہے/یہ لہو کی رقص کرتی گنگناہٹ بھی/کہ دانائی بھی اک بکواس ہے/آواز بھی، چُپ بھی/یہاں ہونا نہ ہونا بھی/وہی قصہ پرانا ہے/تو پھر لکھتے رہو بیکار میں/بے گار میں لکھتے رہو/کیا فرق پڑتا ہے!''

بیاں ممکن نہیں ہے۔ابرار احمد

جب زندگی بھر کا کیا کرایا بے معنی لگنے لگے، تو بے شک یہ معرفت اور گیان کی ایک صورت ہے لیکن یہ ایک مہا المیہ بھی ہے۔اگر بے معنویت کا احساس قلب و نظر میں عرفان میں

ڈوبی ہوئی مسکراہٹ پیدا کر دے تو تمام تر بے معنویت کے باوجود زندگی کا سفر کامیاب رہتا ہے۔لیکن جب گیان کی حیرت آمیز مسکراہٹ کی بجائے نام آوری کے شوق کے نتیجہ میں تذلیل، آنسو اور ندامت مقدر بنیں تو دراصل یہ زندگی کی دوڑ میں اپنی شکست کو تسلیم کرنے کا اعلان بن جاتا ہے۔کیفیات کا مفہوم کوئی بھی رہا ہو،اس میں شک نہیں کہ ابرار احمد نے ایسے مضمون کو باندھتے وقت بھی ایک خوبصورت نظم تخلیق کر دی ہے۔ہاں یہاں مجھے نظم کے اختتام تک آتے آتے ''وہی قصہ پرانا ہے'' کی لائن پڑھتے ہی فلم ''تیسری قسم'' میں مکیش کا گایا ہوا ایک پرانا گانا یاد آ گیا۔''سجن رے جھوٹ مت بولو، خدا کے پاس جانا ہے۔''اس گیت کا ایک بند یوں ہے۔

''لڑکپن کھیل میں کھویا/جوانی نیند بھر سویا/بڑھاپا دیکھ کر رویا/وہی قصہ پرانا ہے''۔

اب ابرار احمد اپنے بڑھاپے میں وہی پرانا قصہ یاد کر رہے ہیں/دہرا رہے ہیں تو اچھی بات ہے۔

جدید نظم کے اکیسویں صدی کے ایک اہم رجحان پر بات کرنے سے پہلے نظم کی دنیا کے ایک منفی طرزِ عمل کی نشان دہی کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ستیہ پال آنند جدید اردو نظم کے ایک اہم شاعر بنتے بنتے رہ گئے ہیں۔امریکہ اور کینیڈا میں طویل عرصہ سے مقیم ہونے کے باعث انہیں اب مغربی دنیا میں اردو کا اہم رائٹر شمار کیا جاتا ہے۔نظم کا شاعر ہونے کے باوجود انہوں نے اپنی نظم پر پوری توجہ مرکوز کرنے کی بجائے اپنی توانائی کا بڑا حصہ اردو غزل کے خلاف لکھنے اور بولنے میں ضائع کر دیا ہے۔مزید ستم یہ ہوا ہے کہ ان کی اپنی نظمیں اردو غزل کے مضامین سے استفادہ کرتے ہوئے تشکیل پاتی ہیں۔عام طور پر ایسی کسی قباحت کے سامنے آنے پر اسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے لیکن ایسا ایک دو بار ہی کیا جانا چاہیے۔اگر غزل کے مضامین سے کثرت سے استفادہ بھی کیا جا رہا ہو اور غزل کو اردو بدر کرنے پر زور بھی دیا جا رہا ہو تو بات کچھ اچھی نہیں لگتی۔یہاں ستیہ پال آنند کی نظموں میں غزل کے مضامین سے استفادہ کی چند مثالیں پیش کر کے اس بات کو ختم کرتا ہوں۔

☆''نہیں، نہیں مجھے جانا نہیں ابھی، اے مرگ/ابھی سراپا عمل ہوں، مجھے ہیں کام بہت/ابھی تو میری رگوں میں ہے تیز گام لہو/ابھی تو معرکہ آرا ہوں، برسرِ پیکار/یہ ذوق و شوق، یہ تاب و تواں، یہ بے چینی/ابھی تو میرے تمتع پہ منحصر ہے یہ جنگ/نہیں، نہیں مجھے جانا نہیں ابھی، اے

مرگ/یہ رزمیہ جو مری زیست کا مقدر ہے/یہ حرف حرف تحارب، یہ لفظ لفظ جہاد/مرا یہ نعرۂ تکبیر، صف شکن ''رَن بیر''/اسے تو ظلم و تشدد کی جڑ کو کاٹنا ہے/اسے تو زشت خو دشمن سے جنگ جیتنی ہے/نہیں، نہیں مجھے جانا نہیں ابھی، اے مرگ/کہ اب یہ لفظ مرے گل نہیں ہیں، کانٹے ہیں/مجھے پرونا نہیں کتخداؤں کے سہرے/مجھے سجانا نہیں باکرہ بتولوں کو مجھے تو تیغ زن غازی کی طرح لڑنا ہے/مری قضا، مجھے کچھ وقت دے کہ مجھ کو ابھی/رجہاں کے فرضِ کفایہ کو پورا کرنا ہے''

(ستیہ پال آنند کی نظم ''نہیں، نہیں مجھے جانا نہیں ابھی'' مطبوعہ ماہنامہ شاعر بمبئی شمارہ اپریل ۲۰۱۲ء)

اس نظم کی پہلی تین لائنوں کو غور سے پڑھ لیں اور پھر مرزا اسداللہ خاں غالب کا یہ شعر ملاحظہ کریں۔اور نظم میں غزل کے شعر سے استفادہ کا کمال دیکھ لیں۔

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں، اے مرگ!
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

نظم کا مجموعی خیال یہ ہے کہ نظم نگار موت سے کچھ عرصہ کے لیے زندگی کی مہلت مانگ رہا ہے۔یہ مضمون اردو غزل میں سو رنگ سے باندھا جا چکا ہے۔چند مثالیں پیش کر رہا ہوں۔

اے اجل ذرا ٹھہر جا، میں کچھ اور دیر جی لوں
ابھی تلخیاں ہیں باقی، انہیں کر تو لوں گوارا

(دانش پیرزادہ)

اے اجل بہرِ خدا اور ٹھہر جا دَم بھر
ہچکیاں آئی ہیں، شاید میں اُسے یاد آیا

(میر مونس)

اجل ٹھہر کہ ابھی تیرے ساتھ چلتا ہوں
مگر یہ دیکھ ابھی میرے روبرو ہیں حضور

(بیکل اتساہی)

یہ ایک نظم میں غزل کے دو دو مضامین سے استفادہ کر کے انہیں ملا کر نظم گھڑنے

کا فارمولہ ہے جسے ستیہ پال آنند کامیابی سے استعمال کر رہے ہیں۔ایک اور نظم میں یہی طریق کار دیکھنے کے لیے پہلے ان کی ایک اور نظم ملاحظہ کریں۔

☆''**اپنی زنجیر کی لمبائی تک:** کچھ برس پہلے تک (پوری طرح یاد نہیں) / میں بھی آزاد تھا، خود اپنا خدا تھا مجھ میں / قوت کار بھی تھی، جراتِ اظہار بھی تھی / گرمیٔ فعل و عمل، طاقتِ گفتار بھی تھی / میں کہ خود اپنا مسیحا تھا، خود اپنا مالک، کچھ برس پہلے تک (پوری طرح یاد نہیں) / اب مجھے حکم عدولی کا کوئی شوق نہیں / بے زباں طاقتِ گویائی سے محروم ہے اب، ماسوا اس کے کہ شکراً کہے خاموش رہے / اب مجھے گالیاں سننا بھی گوارا ہے کہ میں حرفِ دشنام ہو یا حرفِ پذیرائی ہو / فرق لہجے کا، سمجھ سکتا ہوں الفاظ سبھی سرزنش کے ہوں یا تعریف کے۔ مالک کی زباں / جو بھی ارشاد کرے میرے لیے واجب ہے / ہاں مجھے دیکھنے چپ رہنے کی آزادی ہے / اور میں گھوم کر کچھ دور تک چل سکتا ہوں / اپنی زنجیر کی لمبائی تک آزاد ہوں میں!'' **(نظم مطبوعہ ماہنامہ پرواز لندن۔جنوری ۲۰۰۶ء)**

جبر و اختیار کا مسئلہ اردو غزل کا مرغوب مضمون ہے جو فارسی غزل کی روایت سے چلا آتا ہے۔یگانہ چنگیزی نے اس مضمون کو اپنی ایک رباعی میں یوں باندھا ہے۔

ہوں صید کبھی، اور کبھی صیاد ہوں میں　　کچھ بھی نہیں بازیچۂ اضداد ہوں میں
مختار۔۔۔مگر اپنی حدوں میں محدود　　ہاں وسعتِ زنجیر تک آزاد ہوں میں

جبر و اختیار کے قدیم موضوع کو یگانہ نے ''وسعتِ زنجیر تک آزادی'' سے تعبیر کیا تو ستیہ پال آنند نے اسی ترکیب کو ''وسعتِ زنجیر کی لمبائی تک'' کر لیا۔باقی نظم کے آغاز میں جو اپنا خدا آپ ہونے کا بول بولنے کی کوشش کی ہے، یہ بھی یگانہ چنگیزی سے ہی مستعار لیا ہوا خیال ہے۔یگانہ کا بہت ہی مشہور شعر ہے۔

خودی کا نشہ چڑھا، آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہؔ مگر بنا نہ گیا

غزل کو برا بھلا کہتے ہوئے اور غزل کی مذمت کرتے ہوئے غزل ہی کے مضامین سے چپکے چپکے استفادہ کرنے کی عادت نے ستیہ پال آنند کو ایک اچھا نظم نگار بننے سے

محروم کر دیا۔یہ اردو نظم کی دنیا کا ایک المیہ ہے۔

اور اب اکیسویں صدی میں جدید اردو نظم کے ایک اہم رجحان کی بات۔۔۔امریکہ میں نائن الیون کے سانحہ کے بعد جو کچھ ہوا اور ابھی تک جو کچھ ہوتا چلا جا رہا ہے، وہ ہم سب کے سامنے ہے۔اس حوالے سے اردو نظم میں کافی کچھ لکھا گیا ہے۔اس المیہ اور کرب کو نظم نگاروں نے اپنے اپنے انداز سے دیکھا، سوچا اور لکھا ہے۔تاہم اکیسویں صدی کی نظموں کے ذکر سے پہلے میں وزیر آغا کی مشہور طویل نظم ''اک کتھا انوکھی'' کا ذکر کرنا چاہوں گا۔۱۹۹۰ء میں کتابی صورت میں شائع ہونے والی اس نظم میں ڈاکٹر وزیر آغا نے بڑے واضح سیاسی و سماجی اشارے دیئے ہیں۔تیل کی دولت سے مالا مال عرب ملکوں کی صورتِ حال، آئرن ایج، کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے ذریعے اعداد کی الفاظ پر بالا دستی، آندھی کی طرح چھا جانے والی کمپیوٹر کی دنیا اور اس میں الجھ کر رہ جانے والوں کی بے آرامی، تیز رفتار کا اندھی رفتار میں بدل جانا، انسانی احتجاج کی ہیبت نا کی اور بے معنویت ایک ساتھ،۔۔۔اس نظم کے تین مختلف لیکن متعلقہ اقتباس یہاں پیش کر رہا ہوں۔

☆''آنکھیں کھول کے باہر آ / اور دیکھ کہ گلیاں سب / اُجڑی ہیں / گلشن بے آباد ہیں سارے / ریت کے دھارے! / ریت کے دھارے، تیل کے دھارے بن کر / اُبل پڑے ہیں / لوہا جیسے جاگ اُٹھا ہے / چہک رہا ہے / چاروں جانب کُوک رہا ہے / تتلی، بھونرا، کوئل، چڑیا / سب لوہا ہے / لوہے کے پَر اُگ آئے ہیں!۔۔۔۔/ دھرتی جننا بھول گئی تھی / لوہا، سر پر اک فولادی تاج رکھے / اس دھرتی کا سرتاج ہوا تھا / وہ دن اور پھر آج کا دن / اس دھرتی پر نہ رات آئی / نہ دن نکلا / نہ شام ہوئی ہے / ایک مسلسل آندھی / بے آرام ہوئی ہے / وقت نے اُٹھ کر / اک اندھی رفتار سے خود کو / لیس کیا ہے / بجلی کی سیڑھی پر پہلا قدم رکھا ہے!۔۔۔۔سونے والے! / جب دھرتی پر آوازوں کا شور اُٹھا تھا / اور فولاد کا راج ہوا تھا / انساں سارے / لوہے کے روبوٹ بنے تھے / بے چہرہ بے نام ہوئے تھے / کالے، پیلے ہندسے بن کر / لفظوں کے انکھووں پر جیسے ٹوٹ پڑے تھے / اک اک ''لفظ'' پہ ثبت ہوئے تھے / اور اب / ہندسے ہی ہندسے ہیں / جمع کرو۔۔تو دُگنے تگنے ہو جاتے ہیں / لاکھوں کا اک لشکر بن کر / آگ اور خون کے کھیل کا منظر / دکھلاتے ہیں / ضرب لگے تو بھنور سا

بن کر تیز ہوا کا، ر پاگل بھوتوں کے روحشی گرداب کی صورت رایک ہی پل میں ردھرتی اور آکاش سے اونچے اُٹھ جاتے ہیں رکرواگر تفریق صفر ہو جاتے ہیں!''۔۔

اقتباس از طویل نظم: **اک کتھا انوکھی۔ وزیر آغا**

بیسویں صدی کی آخری دہائی میں وزیر آغا کی اس نظم میں جن خدشات کا اظہار کیا گیا تھا نائن الیون کے سانحہ کے بعد وہ کھل کر سامنے آ چکے ہیں اور اب ہمارے دوسرے لکھنے والوں کی طرح نظم نگار بھی اپنے اپنے انداز سے اس صورتِ حال پر اپنے جذبات کا اظہار کر رہے ہیں۔ چونکہ یہ سانحہ امریکہ میں رونما ہوا تھا، اس لیے امریکہ کے اردو نظم نگار فیصل عظیم کے ہاں اس کے اثرات سب سے پہلے دیکھتے ہیں۔

☆''عمارت کیا گری! رمحسوس ہوتا ہے، رکہ اپنے گھر کے بھی دیوار و در ٹوٹے رہمارے سر پہ گویا چھت نہیں باقی رکھڑے ہیں بے سروسامان، بے سایہ ر''کسی'' کا سانحہ ر''ہم'' کو بلا کی دھوپ میں لایا رکبھی تو پاؤں جلتے تھے رمگر اب سر بھی زد پر ہیں ر یہ سمجھیں جیسے اب ہم سب فنا ہونے کی حد پر ہیں رعمارت کیا گری! رہم لوگ میلوں دور بھی پتھرا گئے جیسے رہم اس کے ٹوٹتے ملبے کے نیچے آ گئے جیسے روہ پتھر، اینٹ اور گارا تو آخر ہٹ ہی جائے گا رمگر ہم پر گرا جو، کون ''وہ'' ملبہ ہٹائے گا؟ رہمارے ساتھ ہے تہذیب اور تاریخ بھی شاید! رسنائی دی ہے ہم کو دین ِ حق کی چیخ بھی شاید! رصدا زخمی سہی لیکن غنیمت ہے، صدا تو ہے! رہمیں خود احتسابی کا کوئی موقع ملا تو ہے!''

ورلڈ ٹریڈ سینٹر کا ملبہ۔ فیصل عظیم (امریکہ)

امریکہ کے ردِعمل نے افغانستان اور عراق سے ہوتے ہوئے تقریباً ساری مسلم ورلڈ کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہے۔ جب چاہتا ہے کسی بھی ملک کا نام لے کر، کوئی الزام دیتا ہے اور پھر اس پر چڑھ دوڑتا ہے۔ فیصل عظیم کے دکھ کو پاکستان میں بیٹھے عامر سہیل نے اپنے دکھ کی صورت میں کچھ یوں دیکھا۔

☆''رات کے سرخ کاسے میں خرطوم ہے رآنسوؤں کے دلاسے میں خرطوم ہے رمعجزہ ہے حلب تیری رفتار میں رکوئی چنتا ہے ہونٹوں کی دیوار میں رزرد پانی کا پنجہ ہے تشہیر میں رآگ کو روتے دیکھا

ہے کشمیر میں رمیں نے تہران سے پوچھنا ہے میاں رگردنوں سے سنہری تری سردیاں ردشت اور شہرِ بابل کے رقعے پڑھو آ ؤ اور چرتے کابل کے کُرتے پڑھو رمیں نے سینوں پہ کاڑھے ہیں مندر ترے رہندوے مجھ کو کاندھے سمندر ترے رپنجگور اور ہنزہ ندی پھیر دے ر پاک لاشوں سے تھی جو صدی پھیر دے رجو کراچی کی گلیوں میں چلتا نہیں راس کی ایڑی سے چشمہ ابلتا نہیں رشہ سوار آلِ ہاشم ترا خون ہیں رشام میں میرے ابدال مدفون ہیں رجب فلک بوس مینار تک ڈھے گئے رمجھ سے بصرہ نے پوچھا کہاں رہ گئے رولر بانیل کی بے کسی چوم لوں رتیری دوشیزہ رُت میں ذرا گھوم لوں رائے فلسطیں تجھے معبدوں کی اماں رمیں اندھیرے میں سنتا ہوں تیری اذاں رویویاں، دیوتا اپنی تسکین کور چور نظروں سے دیکھیں ابا سین کور عشق حسان کا، درد بولان کا رپشت پر قہقہہ سرخ طوفان کا رجو بھی عشاق زادہ ہے اس دور کا رتذکروں میں لکھے حسن لاہور کا رگوئٹے! کوئٹے کی پلک سرمگیں رتیرے بچوں، دریچوں، لبوں سے حسیں رموت کا کانچ درّوں سے میں چن سکوں رزندگی کی ہنسی دور سے سن سکوں'' **عہد آشوب۔ عامر سہیل**

عالمی سطح پر اس المیہ کے دردناک اثرات ابھی تک رونما ہو رہے ہیں۔ پاکستان کے اندر خودکش دھماکوں کی بلا آ چکی ہے۔ فرقہ پرست اور دہشت گرد تنظیموں کی ملی بھگت سے پورا ملک لہولہان ہو رہا ہے۔ ایوب خاور ایک افغان بچے کے جذبات کو ایک سوالیہ نظم کی صورت بیان کرتے ہیں۔ تو اقبال نوید اس ساری صورت حال پر اپنی بے بسی کا نوحہ لکھتے ہیں۔ جنت کی بشارت کو اپنے آنکھوں میں سجائے ہوئے خودکش حملہ آوروں نے دہشت گردی کی انتہا کر دی تو اختر رضا سلیمی کی معجزے کی امید دم توڑ گئی۔ ارشد خالد دہشت گردوں کے جنت گھروں کی حقیقت کو بچپن کے ایک کھیل سے تشبیہ دیتے ہیں۔ یہ سب ان کی ذیل کی نظموں میں دیکھئے۔

☆''اے امریکا! رمرے حصّے کے بسکٹ بم دھماکوں کی وجہ سے رریزہ ریزہ ہو گئے ہیں رجھوک، آتش گیر مادے کی طرح رسینے سے معدے تک بھڑکتی پھر رہی ہے رحلق میں گریہ کی ڈلیاں ہیں رجو نگلی جا رہی ہیں اور نہ اُگلی جا رہی ہیں رِاس طرف دیکھو..... اِدھر.....رمیرے اُدھڑتے پیروں کے تلوؤں سے رے آب و گیہ دھرتی پہ برسوں سے برسنے والی ر بارودی تھکن لپٹی ہوئی

ہے/اور سر پر لوہے کی چیلیں مسلسل اُڑ رہی ہیں/ پیٹ خالی ہے/اے امریکا! /مرے دامن میں میری بانجھ دھرتی کی یہ مٹی/اور ہاتھوں میں یہ میزائل کے ٹکڑے ہیں/تُم اس مٹی اور اِن ٹکڑوں کے بدلے میں/مجھے کھانے کو کیا دو گے؟'' **ایک افغان بچّے کا سوال۔ایوب خاور**

☆''ہم نے دل سے محبت کو رخصت کیا/اور بارود کی دھڑکنوں کے سہارے جیۓ/خود کو نفرت کے چشموں سے سیراب کرتے رہے/ایک شعلہ بنے/تا کہ آرامگاہوں میں پلتے ہوئے/بے حسوں کی حفاظت رہے/خواب گاہوں میں پردے لٹکتے رہیں/رقص جاری رہے/تا کہ محلوں کے آقا کے دربار میں/ایک تالی سے سب کچھ بدلتا رہے/جتنے ایوان ہیں/دوسروں کے اشاروں کی تعظیم میں/سر ہلاتے رہیں/ہم نے دل سے محبت کو رخصت کیا/ایک شعلہ بنے/تا کہ بیٹوں کے لاشے تڑپتے رہیں/بین کرتی ہوئی بیٹیوں سے پرے/اپنے کشکول ہاتھوں سے لکھے ہوئے/عہد ناموں کی تحریر پڑھتے رہیں/ہم سے بہتر تھے وہ/جن کے ٹکڑے ہوئے/جو جنازوں کی صورت اٹھائے گئے/ایک بیکار آنسو کی صورت گرے/ہم وہ تلوار تھے/جو عجائب گھروں کے لئے رہ گئی/ایسی بندوق تھے/جس کو مفلوج ہاتھوں میں سونپا گیا''

ایک بے کار آنسو کی صورت گرے۔اقبال نوید (برطانیہ)

☆''مرا موسیٰ کہیں پیغمبری لینے گیا تھا/آگ لے کر آ گیا ہے/ادھر آبادی پر پیغمبری وقت آ پڑا ہے/مری بستی کے سارے آدمی/جادوگروں کے سحر میں ہیں/انہیں اب رسیاں بھی سانپ دکھتی ہیں/چنانچہ سر بہ سجدہ ہیں/مرا ہارون کوہ خامشی پر چلہ کش ہے/اور اس پر مصلحت کی وحی نازل ہو رہی ہے/بس اک لاٹھی مرا واحد سہارا تھی/مگر وہ بھی بجائے اژدھا بننے کے/ان شعلوں کا ایندھن بن گئی ہے/جو موسیٰ ساتھ لایا ہے/تری لاٹھی/وہ بے آواز لاٹھی اب کہاں ہے/کیا بشارت کے زمانے جا چکے ہیں؟'' **کیا بشارت کے زمانے جا چکے ہیں۔اختر رضا سلیمی**

☆''ہم اپنے بچپنے میں ساحل دریا پہ جا کے/پیروں کو بھر کے/ریت کے کچھ خوشنما سے گھر بناتے تھے/پھر اپنے پھول ہاتھوں سے/انہیں مسمار کرتے تھے/یہ لگتا ہے بڑے ہو کر بھی ہم اب تک۔۔۔/ابھی تک بچپنے میں ہیں/کہ اپنی خواہشوں کی جنتیں پانے کی خاطر/نیکیوں کے نام پر/

جنت کے گھر تعمیر کرتے ہیں/پھر ان جنت گھروں کو خود جہنم زار کرتے ہیں/ہر اپنی خوشنما تعمیر اپنے ہاتھ سے مسمار کرتے ہیں/فقط نادانیوں سے پیار کرتے ہیں''۔ **جنّت کے گھر۔ارشد خالد**

نائن الیون کے سانحہ کے بعد جو ردِعمل مختلف اطراف سے سامنے آ رہا ہے،اس میں دہشت گردوں کی طرف سے پولیو کے حفاظتی ٹیکے لگانے والوں کے خلاف دہشت گرد کاروائیاں بھی شامل ہیں۔ پاکستان میں ان مذہبی انتہا پسندوں نے پولیو کے ٹیکے لگانا حرام قرار دے رکھا ہے۔اس کے نتیجہ میں متعدد پولیو ہیلتھ ورکرز کو ہلاک کیا جا چکا ہے۔اس وحشیانہ طرزِعمل کے خلاف محمود احمد قاضی اور احفاظ الرحمٰن کی دو نظمیں ان کی طرف سے جوابی مزاحمت کہی جانی چاہیے۔

☆''یہ مملکتِ خداداد ہے/الحمدللہ/کہ ہم اس کے باسی ہیں/صد شکر کہ یہاں مرنے کے لیے/پولیو ہیلتھ ورکر ہونا ہی کافی ہے'' **سہولت۔محمود احمد قاضی**

☆''محبت کی ہتھیلی رنگ سے خالی نہ ہونے دو/محبت کم نہ ہونے دو، زمیں کو سانس لینے دو/زمیں پر جینے والوں کو مہکتے خواب لکھنے دو/مہکتے خواب کی تعبیر کا عنوان لکھنے دو/محبت کم نہ ہونے دو/محبت تتلیوں کی گفتگو میں رقص کرتی ہے/پرندوں کے حسیں نغموں کی دُھن میں رقص کرتی ہے/ہوا کے ساتھ لہراتی ہوئی پرواز کرتی ہے/فضا میں میٹھی خوشبو کی مہک کو کم نہ ہونے دو/محبت کم نہ ہونے دو/۔۔۔محبت کم نہ ہونے دو/جو نفرت بیچتے ہیں/خون کا بیوپار کرتے ہیں/خوشی کی کوکھ پر خنجر سے کیسے وار کرتے ہیں/لرزتی آرزوؤں کو ڈرا کر شاد ہوتے ہیں/وہ نازک تتلیوں کے خواب سے/زیر وزبر ہوں گے/پرندوں کی حسیں چہکار سے/زیر وزبر ہوں گے/پرندوں کے حسیں نغموں پہ/نازک تتلیوں کو رقص کرنے دو/محبت کم نہ ہونے دو/محبت کم نہ ہونے دو''

محبت کم نہ ہونے دو۔احفاظ الرحمٰن (پولیو کے قطرے پلانے والی لڑکیوں کے نام)

پاکستان میں دہشت گردوں کی کاروائیاں حد سے بڑھ گئیں تو فاطمہ حسن اور فرحت نواز نے ماؤں کی حیثیت سے اپنے کرب اور احتجاج کو یوں درج کرایا۔

☆''ہم نہیں جنم دیں گے وہ بچے/جنگ کا ایندھن جو بنتے ہیں/اور ساری عمر رُلاتے ہیں/ہم ماؤں

کو/ہم جنم نہیں دیں گے وہ لڑکے/ایسے بہادر/ایسے مرنے مارنے والے/جن کی قوت دنیا کی تسخیر کرے/اور نرم دلوں کو دہلا دے/ہم خود کو بنجر کر لیں گے/اس دھرتی کے بنجر ہونے سے پہلے''

انکار۔فاطمہ حسن

☆''مرے شہروں میں اب بارود کی بو ہے/یہ بستی سرکٹے شعلوں میں گھرتی جا رہی ہے/گھروں پر جانے والے راستوں پر/خون کی ہولی رچی ہے/جواں بیٹوں کی لاشوں سے لپٹ کر/روتی مائیں کون دیکھے/کہ بینائی بھی آنسو بن کے جیسے بہہ گئی ہے/زمیں سے آسماں تک بین کرتا سوگ برپا ہے/اگر تم آئے دن کی یہ قیامت روکنے پر بھی نہیں قادر/تو پھر مت اور بہلاؤ/کسی اِن کیمرہ اجلاس میں اعلان فرما دو/نیا قانون نافذ ہو گیا ہے/یہاں کی سب رُتوں کو بانجھ کر دو/ہوا پھولوں سے ہم بستر نہ ہو اب/کوئی خوشبو کہیں آنکھیں نہ کھولے/کسی آنگن میں اب بچپن نہ کھیلے/جوانی سے کہو/ہر بات پر ہنسنے کی عادت بھول جائے/یہاں اب رونقیں خودکش دھماکہ ہیں/مری گلیوں میں اب بارود کی بو ہے!''۔**خودکش دھماکے۔فرحت نواز**

دنیا ابھی تک غیر یقینی کی حالت میں ہے۔آج کے انسان کا ایک قدم خلا کی سمتوں کی طرف اُٹھ رہا ہے تو ایک قدم جیسے اپنے ابتدائی دور کی طرف جا رہا ہے۔جنگل کے دور کی جانب سے ہوتا ہوا پتھر کے دور کی طرف۔ایک طرف روشنی کی رفتار سے سفر کے امکانات سامنے آنے لگے ہیں تو دوسری طرف کسی اچانک ایٹمی جنگ کے نتیجہ میں پیدل چلنے کے زمانے کی چاپ سنائی دے رہی ہے۔بلکہ پیدل چلنے کی کیوں؟ بقول میرا جی''گھسٹتے ہوئے ،رینگتے رینگتے'' چلنے کی حالت کا خطرہ بڑھ رہا ہے۔انسان اپنی عظیم تر ترقی کے دور میں داخل ہوتا چلا جاتا ہے یا ایک حد کے بعد اپنے ہی ہاتھوں اپنی عظیم تر شکست سے دوچار ہونے والا ہے۔اردو کے جدید نظم نگاروں سمیت تمام اہم تخلیق کار اس سارے منظر نامہ کو دلچسپی اور اضطراب کے ساتھ دیکھ رہے ہیں۔یہ دلچسپی اور اضطراب ان کی نظموں سے بھی ظاہر ہو رہا ہے۔تاہم اس کے باوجود معمول کی زندگی بھی اپنی ساری خوبصورتیوں اور بدصورتیوں سمیت رواں دواں ہے۔اور جدید اردو نظم نگار بھی ان ساری کیفیات سے گزرتا ہوا،اپنی کیفیات کو بُنتا ہوا،تخلیق کے عمل سے گزر رہا ہے۔زندگی جیسے

اچھے برے امکانات کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے ویسے ہی ہمارے جدید نظم نگار بھی اپنے اچھے برے امکانات سمیت آگے کا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔سو یہ سفر جاری رہنا چاہیے۔

مجھے 16 مئی کی شام کو ڈاکٹر شہناز نبی نے اس موضوع پر کچھ لکھنے کی تاکید کی تھی۔انتہائی مختصر وقت میں جو کچھ میرے پاس موجود تھا،اسی کو جمع کر کے ،اسی میں سے ایک انتخاب کیا اور جیسے تیسے اس مضمون کو آج 18 مئی کی شام کو مکمل کر لیا ہے۔وقت کی گنجائش ہوتی تو زیادہ ہوم ورک کر پاتا اور مضمون میں مزید کئی قابلِ ذکر شعراء کی نظموں پر بھی گفتگو کر سکتا۔لیکن وقت اور نظموں کی عدم دستیابی کی مجبوری کے باعث جو کچھ لکھنا ممکن تھا،پیش کر رہا ہوں!

شعبہ اردو کلکتہ یونیورسٹی کے رسالہ

دستاویز کا **جدید نظم نمبر سال** ۲۰۱۴ء۔شمارہ نمبر:۹

فیمینزم۔تاریخ وتنقید

''تانیثی تنقید'' کے بعد ڈاکٹر شہناز نبی کی اسی موضوع سے متعلق نئی کتاب ''فیمینزم۔تاریخ و تنقید'' بھی منظرِ عام پر آ گئی ہے، پہلی کتاب مضامین کا مجموعہ تھی تو ۴۳۲ صفحات پر مشتمل یہ ضخیم کتاب یک موضوعی ہے۔اس میں اس موضوع سے متعلق بیشتر مباحث کو نہ صرف سمیٹ لیا گیا ہے، بلکہ اس کی ایک تاریخ بھی مرتب کر دی گئی ہے۔اس کے مطالعہ سے مجھے اس تحریک اور تنقیدی رویے کو مزید سمجھنے کا موقعہ ملا ہے۔

پیش لفظ کے بعد یہ کتاب پانچ ابواب میں تقسیم کی گئی ہے۔پہلے باب میں ''تانیثیت کی تعریف'' کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ ''فیمینسٹ کسے کہتے ہیں؟''۔دوسرے باب میں ''تانیثیت کی ابتدا وارتقا'' کے بیان کے ساتھ ''تانیثیت۔بحیثیت تحریک'' جائزہ لیا گیا ہے۔تیسرے باب میں ''مختلف ممالک اور تانیثی تنقید'' کے حوالے سے مغربی، مشرقی، جنوب مشرقی ایشیا، شرق اوسط اور شرق بعید کے ممالک تک احاطہ کیا گیا ہے اور وہاں تانیثی تحریک کی صورتِ حال کا جائزہ لینے کی کاوش کی گئی ہے۔یہ باب باقی تمام ابواب سے زیادہ تفصیلی ہے۔چوتھے باب میں ''تانیثیت کی تھیوریوں'' کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ان میں ''حریت پسند، مارکسی، انتہا پسند، تحلیل نفسی، سماجی، وجودی، مابعد جدید تانیثیت'' سب پر بات کی گئی ہے۔پانچویں باب میں ''تانیثی نظریات'' کے باہمی ''اختلاف، اتفاق اور اثرات'' کو بیان کیا گیا ہے۔آخر میں جملہ حوالہ جات درج کیے گئے ہیں۔

پیش لفظ میں شہناز نبی نے چند بنیادی سوال اُٹھائے ہیں ان پر مجھے بھی غور کرنے کا موقعہ

ملا ہے۔

''کیا عورتوں کا لکھا ہوا ادب ہی تانیثی کہلائے گا یا پھر عورتوں کے زاویۂ نگاہ سے لکھا گیا ادب، چاہے مَردوں نے ہی کیوں نہ لکھا ہو نسائی یا تانیثی کہلائے گا'' (**پیش لفظ۔ص۔۷**)

اسی طرح شہناز نبی بتاتی ہیں کہ:

''اکثر محققین کا یہ ماننا ہے کہ تانیثیت یا فیمینزم ایک ایسی اصطلاح ہے جو اپنے اندر بے پناہ گنجائشیں رکھتی ہے اور جس کی کوئی ایک تعریف ممکن نہیں ہے'' (**پیش لفظ۔ص۔۱۱**)

''فیمینزم تحریکات کے مجموعے کا نام ہے جس کا مقصد عورتوں کو مردوں کے برابر سیاسی، سماجی اور معاشی حقوق دینا ہے'' (**پہلا باب: تانیثیت کی تعریف۔ص۱۷**)

اپنے اندر بے پناہ گنجائشیں رکھنے کی وجہ سے ''تانیثی ادب'' کی کوئی ایک تعریف معین نہیں کی جا سکی۔اس میں کوئی حرج نہیں۔لیکن یہ مسئلہ بہر حال اپنی جگہ ابھر کر سامنے آتا ہے کہ خواتین کے حقوق کے حصول کی جنگ میں یہ تحریک عورت اور مرد کے یکساں انسانی حقوق کی منزل سر کرنا چاہتی ہے یا اس سے آگے جا کر مردوں پر عورت کی بالادستی قائم کرنا چاہتی ہے؟ یہ الجھن مجھے ''تانیثی تنقید'' کے مطالعہ کے بعد بھی درپیش ہوئی تھی اور اب بھی اس سوال کا کوئی واضح جواب نہیں مل پایا۔اسی طرح جو خواتین مرد ادیبوں کی طرف سے عورتوں کے زاویۂ نگاہ سے لکھے گئے ادب کو بھی تانیثی ادب میں شمار کرنا چاہتی ہیں۔،ان کے لیے میری طرف سے سوال ہے کہ اگر مرد ادیبوں نے اس حوالے سے خواتین قلم کاروں سے زیادہ دلچسپی لے کر لکھنا شروع کر دیا تو کہیں پھر مردوں پر یہ الزام تو نہ لگ جائے گا کہ مرد ادیبوں نے چالاکی سے اس میدان میں بھی اپنی اجارہ داری بنالی ہے۔؟

یہاں یہ تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ اردو شاعری میں ''ریختی'' کی شعری صنف میں مردوں نے عورت کی زبان میں عورت کے جذبات کا بے محابا اظہار کر رکھا ہے۔عورتوں کے زاویۂ نگاہ سے پھر ریختی کے سارے قدیم دیوان ''تانیثی ادب'' میں شمار کیے جانے چاہئیں۔کتاب کے ص۔۳۸۳ پر اس کا ہلکا سا ذکر کیا گیا ہے۔تاہم اس پر مزید غور کی ضرورت ہے۔لگ بھگ سو سال پہلے کی معاشرت

میں عورتوں کا ایک زاویۂ نگاہ محسن خانپوری کے دیوانِ ریختی کے اس ایک شعر میں دیکھا جا سکتا ہے۔

دن کو ٹرایا مُوا، پر مجھ سے ہارارات کو
ڈھونڈتا پھرتا تھا تنکے کا سہارارات کو

تانیثیت کی ابتدا کے بارے میں ڈاکٹر شہناز نبی لکھتی ہیں:

''عورتوں پر ظلم وستم اور جبر واستبداد کی روایت بہت پرانی ہے''۔(**دوسرا باب۔تانیثیت: آغاز و ارتقا۔ص ۳۱**)

''عورت نے پہلی بار بغاوت کب کی۔اس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ کہا نہیں جا سکتا۔تاہم Ellen Key کہتی ہے کہ نسائی تحریک کی شروعات وہاں سے ہوئی جب پہلے پہل حوّا نے شجرِ ممنوعہ کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔۔۔غرض عورت کا اپنے مجوزہ حدود سے تجاوز کرنا ہی نسائی تحریک کی ابتدا تھی''(**دوسرا باب۔تانیثیت: آغاز وارتقا۔ص ۳۲**)

ظلم وستم کی روایت تو بلاشبہ بہت پرانی ہے،اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کی ابتدا کا سرا شجرِ ممنوعہ کی طرف ہاتھ بڑھانے سے جوڑنا شاید مناسب نہیں۔**ایلن کی** یہاں چوک گئی ہیں۔جبر واستبداد کے خلاف بغاوت ہوتی تو سرآنکھوں پر۔لیکن شجرِ ممنوعہ والی بغاوت سے پہلے تو کسی ظلم وستم کے شواہد نہیں ملتے۔نہ کسی مذہبی روایت میں نہ کسی غیر مذہبی روایت میں۔اس لیے اگر یہ بغاوت تھی تو کسی ظلم وستم کے بغیر ہی برپا کر دی گئی تھی۔وگرنہ یہ کوئی بغاوت نہیں تھی بلکہ آدم و حوا کا مشترکہ طور پر شعور وآگہی کا پھل چکھنے کا عمل تھا۔نسلِ انسانی کے پھلنے پھولنے کی راہ نکالنے کی طرف دونوں کا مشترکہ پہلا قدم تھا۔

تیسرا باب ''مختلف ممالک اور تانیثی تحریک'' کے عنوان سے ہے، یہ باب باقی تمام ابواب سے زیادہ تفصیلی ہے۔بلکہ باقی چار ابواب کی مجموعی ضخامت سے بھی زیادہ ہے۔اس میں برطانیہ،امریکہ،جرمنی،فرانس،چین، جاپان،اٹلی، ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش،عرب دنیا کے ممالک،ایران اور جنوب مشرقی ایشیا کے انڈونیشیا، ملائیشیا، ماریشس،اور فلپائن میں اس تحریک

کے اثرات کو دیکھا گیا ہے۔عمومی طور پر ہر ملک کے سیاسی وسماجی پس منظر سے شہناز نبی نے وہاں اس تحریک کی ابتدا سے لے کر اب تک کی صورتِ حال کو اپنا موضوع بنایا ہے۔یوں ان سارے خطّوں کی سیاسی وسماجی ہی نہیں فکری ومذہبی روایات کا ایک تاثر بھی سامنے آتا ہے۔بدھ معاشرت ہو یا ہندو، مسلم معاشرت ہو یا مسیحی۔۔۔ان پر بات کرتے ہوئے شہناز نبی نے عورت کے حوالے سے مختلف مذہبی احکامات کے مثبت پہلوؤں کو عمدگی سے اجاگر کیا ہے۔احکامات سے انحراف کرتے ہوئے سماجی سطح پر خرابیاں کہاں پیدا ہوئیں، پھر اس پر بھی بات کی ہے۔بہر حال یہ وسیع مضمون ہے جسے شہناز نبی نے بڑی حد تک وسعتِ قلبی کے ساتھ پیش کیا ہے اور اس سلسلہ میں مزید مکالمہ کی راہ کھول دی ہے۔

چوتھے باب میں ''تانیثیت کی تھیوریاں'' کے زیرِ عنوان سات تھیوریز کا تعارف کراتے ہوئے بحث کی گئی ہے۔ان سات تھیوریز کے نام یہ ہیں۔حریت پسند تانیثیت (Liberal Feminism)،مارکسی تانیثیت (Marxist Feminism)،انتہا پسند تانیثیت (Redical Feminism)،تحلیل نفسی تانیثیت (psycho-analytic Feminism)،سماجی تانیثیت (Social Feminism)،وجودی تانیثیت (Existentialist Feminism)،مابعد جدید تانیثیت (Post Modern Feminism)۔

ان ساتوں تھیوریوں کو بیان کرنے سے پہلے شہناز نبی نے برملا طور پر اقرار کیا ہے کہ:

''مختلف عہد میں تانیثیت سے متعلق مختلف تھیوریاں وضع کی گئی ہیں۔چند لوگ اس بات پہ متفق ہیں کہ تانیثیت کی کوئی ایک تھیوری نہیں ہو سکتی۔پدری سماج میں عورتوں پر جبر واستبداد کی مختلف وجہیں تھیں۔تمام حالات و واقعات کے پیشِ نظر تانیثیت کو اپنے اپنے طور پر سمجھنے کی کوششیں ہوئیں''(**چوتھا باب: تانیثیت کی تھیوریاں۔ص ۳۰۹**)

حریت پسند تانیثیت والے عورت کے حقوق مرد کے مساوی کرنے کے لیے کوشاں رہے۔**مارکسی تانیثیت** نے سماجی ناہمواری کے تناظر میں اشرافیہ کی عورتوں کے مسائل کے مقابلہ میں عام خواتین کے مسائل کو مختلف قرار دیا اور انہیں کے حق میں آواز بلند کی۔**انتہا پسند تانیثیت** والے اپنے نام کی

مناسبت سے یہ سمجھتے ہیں کہ ''عورتوں پر ظلم وستم کی روایت اتنی پرانی ہے کہ اسے سماج سے طبقاتی فرق مٹا کر بھی ختم نہیں کیا جا سکتا'' (**ص ۳۳۸**)۔ یہ سارے حقوق مل جانے کے بعد بھی **ھل من مزید** کا نعرہ ہے۔ گویا ایک استحصالی طبقے کے خاتمہ کے بعد دوسرے استحصالی طبقے کو جنم دینا مقصود ہے۔ **تحلیل نفسی تانیثیت** میں نام کے عین مطابق فرائڈ کے جنسی اور نفسیاتی حوالوں کو بنیاد بنایا گیا۔ **سماجی تانیثیت** نے پہلی چاروں تھیوریز پر غور وفکر کرتے ہوئے ان کی بعض باتوں سے اختلاف اور بعض سے اتفاق کرتے ہوئے کسی حد تک امتزاجی رویے کو اہمیت دی۔ **وجودی تانیثیت** میں وجودی فلسفے کی بنیاد پر عورت کی شخصی آزادی کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا۔ وجودی تانیثیت کی تھیوری سیمون دی بوار (Simon de Beauvoir) کی عطا سمجھی جاتی ہے۔ انہوں نے ژاں پال سارتر کے ساتھ دوست بن کر ساری زندگی گزاری تھی۔ **مابعد جدید تانیثیت** والے اتنے ہی الجھے ہوئے ہیں جتنا مابعد جدیدیت کا تصور الجھا ہوا ہے۔ ان کے ہاں تانیثیت کی کوئی بنیادی بات کرنے کی بجائے اپنی مخصوص لسانی فلسفے کی اصطلاحوں کے ساتھ اسے جوڑنے کی کاوش دکھائی دیتی ہے۔

تانیثیت کی ان سات تھیوریز کا تعارف کرانے کے بعد ڈاکٹر شہناز نبی اس رائے کا اظہار کرتی ہیں:

''غرض تھیوری کی ضرورت اور اہمیت پر مختلف رائیں پیش ہوئی ہیں۔ کسی کے لیے یہ اہم ہے تو کسی کے لئے غیر اہم۔ اس بات پر اتفاق ہونا ہی چاہئے کہ کسی تحریک کی تاریخ لکھنے کے دوران ان تھیوریوں کا مطالعہ ناگزیر ہو جاتا ہے، جنہوں نے تحریک کو تقویت عطا کرنے میں نمایاں رول ادا کیا ہے'' (**چوتھا باب: تانیثیت کی تھیوریاں۔ص ۳۷۸**)

پانچویں باب ''تانیثی نظریات: اختلاف۔ اتفاق۔ اثرات'' میں شہناز نبی نے ایک طرح سے اپنے پورے مقالہ کا محاکمہ پیش کیا ہے۔ تانیثیت کی بحث میں کہاں کہاں کیا اختلاف ابھرے، کہاں ایک مجموعی نوعیت کی ہم آہنگی سامنے آئی اور دنیا بھر میں ہونے والی عملی جدوجہد کے کیا اثرات ظاہر ہوئے۔ کتنی کامیابیاں ملیں۔ ان ساری باتوں کو خلاصہ کے رنگ میں پیش کر دیا

گیا ہے۔ جہاں تک عورتوں کے مساوی حقوق کی بات ہے، بے شمار اہلِ دانش نہ صرف اس کی حمایت کرتے ہیں بلکہ اس کے لیے جدوجہد کا حصہ بھی بنے ہیں۔ تمام شعبہ ہائے حیات میں مردوں اور عورتوں کے مساوی حقوق کی بات اب عملی زندگی میں تدریجاً بہتر ہوتی جا رہی ہے۔ اسے مزید بہتر کیے جانے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس سے آگے کیا ہونا چاہئے؟

شہناز نبی نے Stephen Heath کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

''مرد چاہے کتنی ایمانداری سے اس تحریک میں شامل ہوں، ان کی نیت پر شبہ برقرار رہے گا۔'' (**ص۔۳۸۰**)

ایک طرف تو یہ کہا گیا کہ تانیثیت کے حوالے سے کام کرنے والے مرد بھی تانیثی تحریک کا حصہ ہیں۔ اور دوسری طرف ان کے حوالے سے شک کی اتنی بڑی دیوار کھڑی کر دی گئی۔

ادب کے معاملہ میں بھی ایسا ہی کنفیوژن سامنے آتا ہے۔ ایک طرف کہا جاتا ہے کہ خواتین کے ادب کے بارے میں، خواتین سے متعلق معاملات پر لکھنے والے ادیب بھی تانیثی ادب کا حصہ ہیں۔ دوسری طرف شہناز نبی خواتین کے لیے الگ ڈبے کا مطالبہ کرتے ہوئے اپنے جائزہ میں لکھتی ہیں:

''ادب میں خواتین کے ادب کی علاحدہ شناخت کا مطلب تھا ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف کرنا۔ تانیثیت کے مخالفین کا کہنا تھا کہ ادب کو آخر مرد اور عورت کے خانے میں کیوں بانٹا جائے۔ لیکن عورتوں کی ایک بڑی تعداد علاحدہ شناخت کے حق میں تھی اور ہے'' (**ص۔۳۸۳**)

چونکہ معاملہ فیمینزم کا ہے، اس لیے میں اس میں دخل اندازی نہیں کروں گا۔ تاہم اگر خواتین لکھاری اپنے لیے الگ خانہ بنا کر آگے چلنا چاہتی ہیں تو بسم اللہ۔ چشمِ ما روشن، دلِ ما شاد! تاہم کم از کم ادبی حوالے سے میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ایک زمانہ گزرنے کے بعد خواتین رائیٹرز کو خود احساس ہوگا کہ اپنے لیے الگ شناخت پر اصرار کر کے انہوں نے خود ہی اپنے آپ کو ادب کے مرکزی دھارے سے الگ کر لیا ہے۔ پردے کا خاتمہ کرنے کے باوجود خود ہی ٹرین جیسے زنانہ ڈبے میں الگ ہو کر بیٹھ گئی ہیں۔ لیکن چونکہ فیمینسٹ خواتین کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ جو چاہے

مطالبہ کریں، وہ سب ان کا حق ہے، اس لیے میں بھی ان کے اس مطالبہ کی مخالفت نہیں کروں گا۔ خود ہی بھگتیں گی!

مرد اور عورت اپنی جسمانی ساخت کے اعتبار سے جو امتیازی اوصاف رکھتے ہیں وہ دونوں کی اپنی اپنی شناخت ہیں، دونوں کا امتیازی وصف ہیں۔ ان میں سے کسی کے وصف کو نہ تو کمتر سمجھا جانا چاہئے اور نہ اس کی وجہ سے کسی کو احساسِ کمتری میں مبتلا رہنا چاہئے۔ بلکہ تخلیق آدم کے بعد حوا کی تخلیق کی روایت کو سامنے رکھا جائے تو مرد اور عورت دونوں ایک دوسرے کا گم شدہ حصہ ہیں۔ ان گم شدہ حصوں کا باہم ہونا باعثِ خیر ہے، اور نسلِ انسانی کے پھلتے پھولتے رہنے کی ضمانت۔ انسانی زندگی کا تسلسل درحقیقت مذہبی زبان والی ابدی زندگی ہی ہے۔ سماجی سطح پر مرد اور عورت کا رشتہ قائم رہنا ہی معاشرے کی بھلائی کا موجب ہے۔ باقی دوسری جنسی بے راہروی کی تحریکیں اپنی تمام تر کشش کے باوجود مرد اور عورت کے فطری رشتے کے سامنے ہیچ ہیں، لغو اور بے معنی ہیں۔

اس لیے عورتوں کے تمام بنیادی انسانی حقوق کے حصول کی جدوجہد سر آنکھوں پر لیکن اس سے آگے جا کر بچے کی پیدائش سے انکار کرنا، سماجی بندھنوں کو رد کرنا اور یکسر آزاد زندگی پر اصرار کرنا کوئی صحت مند رویہ نہیں ہے۔ انسانی تہذیبیں دریاؤں کے کناروں پر آباد ہو کر پھلی پھولی ہیں اور یہ ساری تہذیبیں ہمیں دریا کے پانی کا اپنے کناروں کے اندر رہنے کا سلیقہ سکھاتی ہیں۔ دریا کبھی کبھار اپنے کناروں سے چھلک جاتے ہیں تو خانہ خرابیاں اور بربادیاں لاتے ہیں۔ سو انسانی سوسائٹی سے ناانصافی کا خاتمہ ہونا چاہئے۔ اس کے لیے مسلسل جدوجہد جاری رہنی چاہئے۔ لیکن اس سب کے ساتھ مرد اور عورت کا فطری رشتہ سماجی ضوابط کے ساتھ قائم رہنا چاہئے۔ یہ بات تانیثیت کے حق میں جائے یا نہ جائے، لیکن یہ انسانیت اور انسانی سوسائٹی کے حق میں ضرور جاتی ہے۔ اور ہاں انسانی سوسائٹی میں ایک طبقہ پیدائشی مخنثوں کا بھی ہے۔ یہ طبقہ مظلومیت میں عورت سے کہیں بڑھ کر مظلوم ہے۔ تانیثی تحریک کے سنجیدہ ترجمانوں کو اس مظلوم کے مساوی حقوق کی طرف بھی توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

فیمینزم کے موضوع پر اردو میں ایک عرصہ سے تھوڑا بہت لکھا جا رہا ہے تاہم مجھے لگتا ہے کہ ڈاکٹر شہناز نبی کی کتاب ''فیمینزم۔ تاریخ و تنقید'' اس موضوع پر پہلی بھرپور کتاب ہے۔ شہناز نبی نے اپنے جائزہ میں ایک عمدہ نتیجہ نکالا ہے، اسی پر اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

''فیمینزم کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بات بھی محسوس کی گئی کہ نہ تمام عورتیں مجبور و محکوم ہیں، نہ تمام مرد ظالم و جابر ہیں۔'' **(ص۔۳۹۸)**

مطبوعہ **''اردو ہم عصر''**۔ ڈنمارک۔ ۱۲ جولائی ۲۰۱۴ء

http://www.urduhamasr.dk/dannews/index.php?mod=article&cat=Literature&article=1336

روزنامہ **پیغام** دہلی۔ ۱۵ جولائی ۲۰۱۴ء

حیدرقریشی۔۔شخص وعکس

مرتّب: ارشدخالد

مدیرعکاس انٹرنیشنل (اسلام آباد)

نام: قریشی غلام حیدرارشد

قلمی نام: حیدرقریشی

ولدیت: قریشی غلام سرور

پیدائش: سرکاری کاغذات میں یکم ستمبر۱۹۵۳ء ؛

درست خاندانی روایت:۱۳؍جنوری۱۹۵۲ء

مقامِ پیدائش: چناب نگر (سابق ربوہ)

آبائی علاقہ: رحیم یارخاں، خان پور (سابق ریاست بھاولپور)

تعلیم: ایم اے (اردو)

ادبی سفر کا آغاز:۱۹۷۱ء

اصنافِ ادب: شاعری میں: غزل، نظم، ماہیا

نثر میں: افسانہ، خاکہ، انشائیہ، سفرنامہ، یادنگاری، تحقیق وتنقید، حالاتِ حاضرہ

.....

کتب کی تفصیل:

شاعری

سلگتے خواب (غزلیں)، ناشر: تجدید اشاعت گھر۔لاہور، اسلام آباد۔مطبوعہ۱۹۹۱ء

عمرِ گریزاں (غزلیں، نظمیں اور ماہیے)، ناشر: تجدید اشاعت گھر لاہور، اسلام آباد۔مطبوعہ۱۹۹۶ء۔

محبت کے پھول (ماہیے)، ناشر: نایاب پبلی کیشنز۔خانپور۔مطبوعہ۱۹۹۶ء۔

دعائے دل (غزلیں، نظمیں) ناشر: نصرت پبلشرز لاہور۔مطبوعہ۱۹۹۷ء۔

چاروں مجموعوں کا مجموعہ **غزلیں، نظمیں، ماہیے** ناشر: سرورادبی اکادمی۔جرمنی۔مطبوعہ۱۹۹۸ء۔

درد سمندر (غزلیں، نظمیں اور ماہیے) یہ مجموعہ کلیات 'عمرلاحاصل کا حاصل' میں شامل کیا گیا ہے۔

تخلیقی نثر

روشنی کی بشارت (افسانے) ناشر: تجدید اشاعت گھر، اسلام آباد، لاہور۔ مطبوعہ۱۹۹۲ء۔

قصے کہانیاں (افسانے) یہ مجموعہ الگ سے نہیں چھپا۔**افسانے** میں شامل ہے۔

افسانے (روشنی کی بشارت اور قصے کہانیاں ایک جلد میں)، ناشر: معیار پبلی کیشنز، دہلی۔ مطبوعہ۱۹۹۹ء۔

ایٹمی جنگ (تین افسانے اردو اور ہندی میں) ناشر: معیار پبلی کیشنز، دہلی۔مطبوعہ۱۹۹۹ء۔

میں انتظار کرتا ہوں (افسانوں کا ہندی ترجمہ) ناشر: ساہتیہ بھارتی، دہلی۔ مطبوعہ ۱۹۹۶ء۔

AND I WAIT (اب تک کے سارے افسانوں کا انگریزی ترجمہ)

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔مطبوعہ۲۰۰۸ء

میری محبتیں (خاکے)، ناشر: نایاب پبلی کیشنز۔خانپور۔مطبوعہ۱۹۹۶ء۔

میری محبتیں (خاکے)، ناشر: معیار پبلی کیشنز، دہلی۔مطبوعہ ۱۹۹۸ء۔

کھٹی میٹھی یادیں (یادنگاری) پہلے یہ الگ سے شائع نہیں کی، عمرِ لاحاصل کا حاصل میں شامل ہے۔

اب سال۲۰۱۳ء میں تین ابواب کے اضافوں کے ساتھ پاکستان سے الگ کتابی صورت میں شائع کی گئی ہے۔

ناشر: عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد بہ اشتراک نایاب پبلی کیشنز، خانپور۔مطبوعہ۲۰۱۳ء

سُوئے حجاز (سفرنامہ۔عمرہ کا احوال)، ناشر: معیار پبلی کیشنز، دہلی۔مطبوعہ ۲۰۰۰ء۔

سُوئے حجاز (سفرنامہ، سفرِ حج کے اضافہ کے ساتھ)، ناشر: سرورادبی اکادمی جرمنی۔مطبوعہ۲۰۰۴ء۔

فاصلے، قربتیں (انشائیے) یہ کتاب ابھی الگ سے شائع نہیں کی، 'عمرِ لاحاصل کا حاصل' میں شامل ہے۔

.....

عمرِ لاحاصل کا حاصل

مذکورہ بالا پانچ شعری مجموعوں اور چھ نثری مجموعوں کی عوامی کلیات۔میگزین سائز۲۸۴صفحات

ناشر: معیار پبلی کیشنز۔دہلی۔مطبوعہ۲۰۰۵ء

.....

عمرِ لاحاصل کا حاصل

مذکورہ بالا پانچ شعری مجموعوں اور چھ نثری مجموعوں کی کلیات، لائبریری ایڈیشن۔

میگزین سائز۶۱۶صفحات (بعد کی تخلیقات کے اضافوں کے ساتھ)

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔دہلی۔مطبوعہ۲۰۰۹ء

.....

عمرِ لاحاصل کا حاصل (انٹرنیٹ ایڈیشن)

مذکورہ بالا پانچ شعری مجموعوں اور چھ نثری مجموعوں کی کلیات، لائبریری ایڈیشن۔
میگزین سائز ۶۸۰ صفحات (بعد کی تخلیقات کے اضافوں کے ساتھ)
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی۔ مطبوعہ ۲۰۰۹ء
کے بعد ۲۰۱۲ء تک کی تخلیقات کے اضافوں کے ساتھ انٹرنیٹ ایڈیشن

.....

قفس کے اندر

چھ شعری مجموعے ایک ساتھ۔ عوامی اور اکانومی ایڈیشن ایک ہزار سے زائد صفحات کا میٹر صرف ۱۵۲ صفحات میں

سلگتے خواب **عمرِ گریزاں** **محبت کے پھول**

دعائے دل **دردِ سمندر** **زندگی**

ناشر: عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد بہ اشتراک نایاب پبلی کیشنز خانپور۔ مطبوعہ ۲۰۱۳ء

.....

تحقیق و تنقید

ڈاکٹر وزیر آغا عہد ساز شخصیت (مضامین) ناشر: نایاب پبلی کیشنز۔ خانپور مطبوعہ ۱۹۹۵
حاصلِ مطالعہ (تنقیدی مضامین) ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی مطبوعہ ۲۰۰۸ء
ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور مابعد جدیدیت ناشر: سرور ادبی اکادمی جرمنی۔ مطبوعہ ۲۰۰۹ء
تاثرات (تنقیدی مضامین اور تبصرے)۔ ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ مطبوعہ ۲۰۱۲ء
ستیہ پال آنند کی ''۔۔بُودنی نابُودنی'' (مضامین)۔ ناشر: عکاس انٹرنیشنل، اسلام آباد۔ ۲۰۱۳ء
مضامین اور تبصرے (نئے مضامین کا مجموعہ) زیرِ اشاعت۔ ناشر: عکاس انٹرنیشنل، اسلام آباد۔ ۲۰۱۴ء
ہمارا ادبی منظر نامہ (تنقید کے چھ مجموعے ایک جلد میں) ناشر: عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد۔ ۲۰۱۴ء
اردو میں ماہیا نگاری (تحقیق و تنقید) ناشر: فرہاد پبلی کیشنز۔ اسلام آباد۔ مطبوعہ ۱۹۹۷ء
اردو ماہیے کی تحریک (مضامین) ناشر: فرہاد پبلی کیشنز۔ راولپنڈی۔ مطبوعہ ۱۹۹۹ء
اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما (مضامین) ناشر: معیار پبلیکیشنز دہلی۔ ۱۹۹۹ء
اردو ماہیا (ماہیے کے مجموعوں کے پیش لفظ۔ یہ کتاب ''اردو ماہیا تحقیق و تنقید'' میں شامل ہے)
ماہیے کے مباحث (مضامین۔ یہ کتاب ''اردو ماہیا تحقیق و تنقید'' میں شامل ہے)
اردو ماہیا تحقیق و تنقید (ماہیے کی تحقیق و تنقید کی پانچ کتابیں ایک جلد میں)
ناشر: الوقار پبلی کیشنز۔ لاہور۔ مطبوعہ ۲۰۱۰ء

.....

حالاتِ حاضرہ

منظر اور پس منظر (9/11 کے بعد حالاتِ حاضرہ پر لکھے گئے فکر انگیز کالموں کا مجموعہ)
ناشر: سرور ادبی اکادمی جرمنی اور www.urdustan.com مطبوعہ ۲۰۰۴ء
خبر نامہ (خبروں پر تبصروں کا سلسلہ)۔ ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی۔ مطبوعہ ۲۰۰۶ء۔
اِدھر اُدھر سے (خبروں پر تبصروں اور تجزیوں کا سلسلہ) ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ مطبوعہ ۲۰۰۸ء
چھوٹی سی دنیا (مشرق و مغرب کے پس منظر میں لکھے گئے کالموں کا مجموعہ)
۲۰۱۲ء میں اس مختصر کتاب کا انٹرنیٹ ایڈیشن شائع کیا گیا
حالاتِ حاضرہ (مذکورہ چاروں کتابوں کو ایک جلد میں یکجا کر کے ای بک آن لائن کر دی گئی ہے۔ ۲۰۱۳ء)

.....

بطور مرتب

شفق رنگ: (ضلع رحیم یار خان کے شعراء) ناشر: جدید ادب پبلی کیشنز، خانپور، مطبوعہ اپریل ۱۹۷۹ء
کرنیں: (بھاولپور ڈویژن کے شعراء) ناشر: جدید ادب پبلی کیشنز، خانپور۔ مطبوعہ اپریل ۱۹۸۰ء
سرائیکی غزل: (سرائیکی میں ایک بحث کے ساتھ غزلوں کا انتخاب)
ناشر: جدید ادب پبلی کیشنز، خانپور مطبوعہ ستمبر ۱۹۸۰ء
پھلا ورق: (اوراق کے اداریے) ناشر: مکتبہ ہم زبان کراچی۔ مطبوعہ ۱۹۹۰ء

.....

ادارت

ادبی رسالہ ''**جدید ادب**'' خانپور کی ادارت نو سال تک کی۔ ۱۷ شمارے شائع کیے۔ ان میں ۸۰ صفحات سے لے کر ۵۰۰ صفحات تک کے شمارے شامل ہیں۔
جرمنی سے **جدید ادب** ۱۹۹۹ء میں دوبارہ شروع کیا گیا لیکن دو شماروں کے بعد اسے بند کر دیا گیا۔ چند برسوں کی بندش کے بعد جولائی ۲۰۰۳ء سے یہی جریدہ اب جرمنی سے جاری کیا گیا ہے۔ یہ رسالہ کتابی صورت کے ساتھ انٹرنیٹ پر اس سائٹ پر موجود ہوتا ہے۔ www.jadeedadab.com
اب اس لنک سے بھی جدید ادب کو حاصل کیا جا سکتا ہے: http://jadeedadab.blogspot.de/
ان کوائف کی ترتیب تک اس کے ۱۹ شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ اس ششماہی رسالہ کے سجاد ظہیر نمبر اور میرا جی نمبر شائع ہو چکے ہیں۔ **حیدر قریشی کی سب سے پہلی ویب سائٹ:** www.haiderqureshi.com

.....

ایم ای لائبریریز: ان بلاگس میں حیدر قریشی کی تمام کتابیں پی ڈی ایف فائل میں موجود ہیں

http://haiderqureshi-library.blogspot.de/

http://haider-qureshi.blogspot.de/

.....

اس لنک پر حیدر قریشی پر لکھی گئی، مرتب کی گئی کتب ورسائل کی پی ڈی ایف فائلز موجود ہیں

http://work-on-haiderqureshi.blogspot.de/

.....

حیدر قریشی کی تمام کتابیں اس لائبریری میں بھی موجود ہیں

http://issuu.com/haiderqureshi

.....

حیدر قریشی کی کتابوں تک رسائی مزید آسان، ایک اور لائبریری اور دو نئے مربوط بلاگس

https://archive.org/search.php?query=uploader%3A%22

haider_qureshi2000%40yahoo.com%22&sort=-publicdate

حیدر قریشی کی تمام کتابیں الگ الگ صورت میں: **http://my27books.blogspot.de/**

حیدر قریشی کی تمام ۲۷ کتابیں پانچ کلیات کی صورت میں: **http://kuliat-library.blogspot.de/**

.....

ادبی بلاگس ان بلاگس پر حیدر قریشی کی کتب یونی کوڈ میں دستیاب ہیں۔

سوئے حجاز: **http://soo-e-hijaz.blogspot.de/**

.....

''روشنی کی بشارت''، ''قصے کہانیاں'' اور بعد کے سارے افسانے

http://hq-kayafsanay.blogspot.de/

.....

خاکوں کا مجموعہ ''میری محبتیں'': **http://meri-mohabbaten.blogspot.de/**

.....

یادوں کا مجموعہ **''کھٹی میٹھی یادیں'':** **http://khatti-mithi-yaden.blogspot.de/**

.....

انشائیوں کا مجموعہ **''فاصلے، قربتیں'':** **http://inshaiya.blogspot.de/**

.....

دو خاص بلاگس **کلکتہ اور دھلی کا سفر، با تصویر**

http://haiderqureshi-in-kolkata-delhi.blogspot.de/

.....

حیدر قریشی کی البم: زندگی تصویروں کے آئینے میں

http://haiderqureshi-album.blogspot.de/

.....

وکی پیڈیا کے صفحات

حیدر قریشی : **http://en.wikipedia.org/wiki/Haider_Qureshi**

جدید ادب : **http://en.wikipedia.org/wiki/Jadeed_Adab**

عمرِ لاحاصل کا حاصل

http://en.wikipedia.org/wiki/Umr-e-Lahaasil_Ka_Haasil

.....

ادبی اعتراف

حیدر قریشی کے بارے میں لکھی گئی اور مرتب کی گئی کتابیں

۱۔ **حیدر قریشی فکر و فن مصنف: محمد وسیم انجم**

(مطبوعہ ۱۹۹۹ء) **ناشر**: انجم پبلشرز، کمال آباد نمبر۳، راولپنڈی۔ پاکستان

۲۔ **حیدر قریشی فن اور شخصیت**

مرتبین: **نذیر فتح پوری اور سنجئے گوڑ بولے** (مطبوعہ ۲۰۰۲ء)

ناشر: اسباق پبلی کیشنز۔ پُونہ، انڈیا

۳۔ **حیدر قریشی کی ادبی خدمات**

مرتب: ڈاکٹر نذر خلیق (مطبوعہ ۲۰۰۳ء) ناشر: میاں محمد بخش پبلشرز، خانپور، پاکستان

۴۔ **حیدر قریشی شخصیت اور فن منزہ یاسمین** کا تحقیقی مقالہ کتابی صورت میں۔

اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور سے ایم اے اردو کا تحقیقی مقالہ۔ سال ۲۰۰۲۔۲۰۰۰ء

ناشر: میاں محمد بخش پبلشرز۔ خانپور۔ پاکستان

۵۔ **حیدر قریشی سے لیے گئے انٹرویوز**

مرتب: سعید شباب (مطبوعہ ۲۰۰۴ء) **ناشر:** نظامیہ آرٹ اکیڈمی۔ ایمسٹرڈیم۔ ہالینڈ

۶۔ ادبی کتابی سلسلہ **عکاس** حیدر قریشی نمبر۔۔۔ **مدیر و مرتب: ارشد خالد**

ناشر: عکاس پبلی کیشنز، اسلام آباد (کتاب نمبر۴۔ مطبوعہ اکتوبر ۲۰۰۵)

۷۔ **حیدر قریشی کی شاعری مرتب: ہرمے بھانو پرتاپ**

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی۔ (مطبوعہ ۲۰۱۳ء)

۸۔ **حیدر قریشی شخص و عکس مدیر و مرتب: ارشد خالد**

ناشر: عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد (۲۰۱۴)

.....

حیدر قریشی پر ترتیب دئیے گئے گوشے اور مطالعۂ خصوصی

۱۔گوشۂ حیدر قریشی مطبوعہ ماہنامہ ''**اسباق**'' پونہ شمارہ: فروری تا اپریل ۱۹۹۳ء۔ایڈیٹر: نذیر فتح پوری

۲۔**حیدر قریشی** (بطور افسانہ نگار) مطبوعہ ماہنامہ ''**شاعر**'' بمبئی۔
شمارہ مئی تا دسمبر ۱۹۹۷ء۔**ھم عصر اردو ادب نمبر**... ایڈیٹر : افتخار امام صدیقی

۳۔اشاعتِ خصوصی ''دنیائے ادب کا درخشاں ستارہ/حیدر قریشی''ہفت روزہ **ھوٹل ٹائمز** اسلام آباد ۲۲ مئی تا ۲۸ مئی ۱۹۹۸۔ مرتبین: اختر رضا کیکوٹی و محمد وسیم انجم

۴۔گوشۂ حیدر قریشی مطبوعہ سہ ماہی ''**ادبِ عالیہ**'' وہاڑی۔شمارہ مارچ ۲۰۰۲ء۔ایڈیٹرز: ریاض ہانس

۵۔خصوصی مطالعہ ''**مھرامروز**''مطبوعہ ماہنامہ **کائنات** شمارہ مئی ۲۰۰۴ء
(اردو دوست ڈاٹ کام) ایڈیٹر: خورشید اقبال

۶۔گوشۂ حیدر قریشی مطبوعہ ماہنامہ **شاعر** بمبئی شمارہ نومبر ۲۰۰۴ء ۔ایڈیٹر: افتخار امام صدیقی

۷۔خصوصی مطالعہ سہ ماہی **ادب ساز** دہلی (تقریباً ۵۰ صفحات میگزین سائز پر مشتمل)
شمارہ: ۶، ۷، جنوری تا جون ۲۰۰۸ء ایڈیٹر: نصرت ظہیر

۸۔خصوصی مطالعہ ''**عمرِ لاحاصل کا حاصل**''
مطبوعہ ادبی کتابی سلسلہ **عکاس انٹرنیشنل** اسلام آباد (کتاب نمبر ۱۰) مدیر: ارشد خالد

۹۔گوشہ بحیثیت محقق و نقاد مطبوعہ ادبی کتابی سلسلہ **عکاس انٹرنیشنل** اسلام آباد
(کتاب نمبر ۱۱، مئی ۲۰۱۰ء) مدیر: ارشد خالد

۱۰۔مطالعۂ خاص۔**ایک کتاب: ''عمرِ لاحاصل کا حاصل''**۔مطبوعہ ادبی کتابی سلسلہ **عکاس انٹرنیشنل**
اسلام آباد۔کتاب نمبر ۱۳۔مارچ ۲۰۱۱ء۔ مدیر و مرتب: ارشد خالد

۱۱۔**ایک گوشہ حیدر قریشی کے لیے**۔دو صفحات پر مشتمل۔ روزنامہ **پیغام** دہلی
شمارہ: ۱۰ مئی ۲۰۱۴ء ایڈیٹر: مطیع الرحمٰن عزیز

.....

پاکستان اور جرمنی سے باہر کے اسفار

ہندوستان۔سعودی عرب۔انگلینڈ۔ہالینڈ۔فرانس۔ماریشس۔آسٹریا۔بلجیم۔

حیدر قریشی کا ڈاک کا پتہ: Haider Qureshi
Rossertstr.6, Okriftel,
65795 Hattersheim, Germany.
ٹیلی فون نمبر: 0049-6190-930078 **ای میل:** haider_qureshi2000@yahoo.com

.....

بحوالہ **عکاس** اسلام آباد شمارہ اکتوبر ۲۰۰۵ء **حیدر قریشی نمبر** مدیر **ارشد خالد**
اگست ۲۰۱۴ء تک تازہ ترین اضافوں کے ساتھ

خصوصی نوٹ

حیدر قریشی کے اوریجنل ورک کے حوالے سے اب تک ستائیس کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔
شاعری: چھ مجموعے۔۔۔۔افسانے: دو مجموعے۔۔۔۔خاکے: ایک مجموعہ
یادنگاری: ایک مجموعہ۔۔۔انشائیہ نگاری: ایک مجموعہ۔۔۔سفرنامہ: ایک مجموعہ
ماہیا کی تحقیق وتنقید: پانچ کتابیں۔۔۔۔۔متفرق تنقیدی مضامین: چھ کتابیں
حالاتِ حاضرہ: کالموں کے چار مجموعے
یہی ۲۷ کتابیں متفرق اور مختلف ایڈیشنز کی صورت میں پینتیس کی تعداد میں چھپ چکی ہیں۔یہ صرف اوریجنل ورک کے ذیل میں آنے والی کتابیں ہیں۔مرتب کردہ کتب اور ادبی رسائل کی ایڈیٹنگ کو ان میں شمار نہیں کیا گیا۔

.....

یونیورسٹی سطح کا کام

براہِ راست

۱۔**حیدر قریشی شخصیت اور فن....منزہ یاسمین** کا
اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور، پاکستان سے **ایم اے اردو کا تحقیقی مقالہ** سال ۲۰۰۲۔۔۲۰۰۰ء

۲۔**حیدر قریشی شخصیت اور ادبی جہتیں ڈاکٹر عبدالرب استاد** کا
پی ایچ ڈی کا مقالہ۔سال ۲۰۱۳ء۔گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ، کرناٹک، انڈیا

۳۔**حیدر قریشی۔حیات وخدمات انجم آراء** کا
ایم فل کا مقالہ سال ۲۰۱۳ء۔کلکتہ یونیورسٹی، کولکاتا، انڈیا۔

۴۔**حیدر قریشی کی ادبی خدمات ....عامر سہیل** کا
ایم فل کا مقالہ سال ۲۰۱۴ء۔ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ، (ایبٹ آباد)، پاکستان

۵۔**حیدر قریشی کی شاعری کا مطالعہ ھرمے بھانوپرتاپ** کا
ایم فل کا مقالہ، سال ۲۰۱۴ء۔جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی۔انڈیا

۶۔**حیدر قریشی کی افسانہ نگاری کا مطالعہ رضینہ خان** کا
ایم فل کا مقالہ سال ۲۰۱۴ء۔جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی۔انڈیا

بالواسطہ

۱۔**جدید ادب میں شائع ہونے والے مباحث....شازیہ حمیرہ**
سال ۲۰۰۹۔۔۔۲۰۰۷ء۔اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور، پاکستان سے **ایم اے اردو کا تحقیقی مقالہ**

۲۔**اردو میں ماھیا نگاری ڈاکٹر صبیحہ خورشید**
سال ۲۰۰۹ء۔ناگپور یونیورسٹی، ناگپور، انڈیا سے **پی ایچ ڈی کا مقالہ**